بین الاقوامی تعلقات

ڈاکٹر عبدالقیوم
یم۔اے، یم۔فل، پی ایچ۔ڈی (عثمانیہ)
ریڈر وصدر شعبہ پولٹیکل سائنس
اُردو آرٹس ایوننگ کالج، حیدرآباد - 29

نام کتاب : بین الاقوامی تعلقات

نام مصنف وناشر : ڈاکٹر عبدالقیوم

طبع اول : جنوری 2002ء

تعداد اشاعت : ایک ہزار

کمپیوٹر کمپوزنگ : 1.حافظ محمد وجیہ اللہ سبحانی

مکان نمبر: 16-9-748-/12/A، ریاض الحسنات،

قدیم ملک پیٹ حیدرآباد۔36،فون نمبر:4554148

2. محمد وحید الدین

فون نمبر 4460185

پرنٹر : ''پرنٹک'' 16-6-113 عثمان پورہ چادر گھاٹ حیدرآباد

فون نمبر 6592703

قیمت : -/125 روپے

لائبریری کے لئے : -/150 روپے

ملنے کے پتے : 1.ڈاکٹر عبدالقیوم

17-1-391/2k/61/1 خواجہ باغ' سعید آباد حیدرآباد۔59

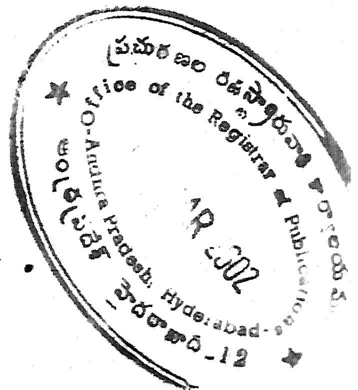
فون:4071215

2.ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس روبروایک خانہ مسجد' پرانی حویلی حیدرآباد۔

فون 4411637

3.دارالکتاب میور کشال کامپلکس عابڈز حیدرآباد

فون 3211993



پیش لفظ

اگرچہ بین الاقوامی سیاست کے واقعات انسانی وجود کی تمام سطحوں پر سرایت کرتے ہیں، لیکن بین الاقوامی تعلقات کو بحیثیت ایک علم (Discipline) جامعاتی نظام کی تدریس و تحقیق میں وہ مقام نہیں مل سکا جسکا یہ متقاضی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسے عالمی تاریخ کی ایک شاخ سمجھا گیا اور یہ اساتذہ و طلبہ کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد، خصوصاً گذشتہ دو دہوں کے دوران یہ علم نہ صرف طلبہ و محققین کے لیے پسندیدہ بنا بلکہ یہ ایک ایسا اہم مطالعہ بن گیا ہے جو قوموں کے درمیان تعلقات کو متعین کرنے والے بنیادی مسائل اور مملکت کے شہریوں کی زندگی کو سمجھنے کے لیے ادراک کی فراہمی کا ضامن بھی ہے۔ گذشتہ تیس چالیس برسوں کے دوران بین الاقوامی تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ کام کیا گیا، تاہم ان میں زیادہ تر کام انگریزی میں ہے۔ اس سے سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کو اردو زبان میں پڑھنے والے طلبہ کی ضروریات کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ان دنوں اگرچیکہ اردو اخبارات بین الاقوامی امور کا وسیع احاطہ کر رہے ہیں، لیکن اخبارات ایک اچھی نصابی کتاب کا معیاری متبادل نہیں۔ اس لیے اردو زبان میں بین الاقوامی تعلقات پر ایک سنجیدہ اور علمی کتاب کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا۔

اُردو ذریعہ تعلیم میں سیاسیات کے طلبہ و اساتذہ کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ڈاکٹر عبدالقیوم کی زیرِ نظر کوشش اس ضرورت کی تکمیل کی سمت میں پہلا بڑا اقدم ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کیونکہ یہ بین الاقوامی تعلقات کی ابتداء اور ارتقاء و نمو سے لے کر مضمون کی حالیہ تبدیلیوں کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے مضمون کے معیار اور وسعت سے کوئی سمجھوتہ کیے بغیر، کتاب کی تیاری میں طلبہ برادری کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ آسان زبان میں یہ کتاب بنیادی حقائق، تجزیے اور ان تمام اہم نظریات کو پیش کرتی ہے جس کو سمجھنا ایک انڈر گریجویٹ طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ اگرچیکہ مختلف سطحوں پر مختلف مضامین میں اردو کتابوں کی تیاری کے پروگرام جاری ہیں، لیکن بین الاقوامی تعلقات کے مضمون کو ان پروگراموں میں کوئی جگہ نہیں مل سکی۔ ایسے میں ڈاکٹر عبدالقیوم کا یہ کام دوسرے مضامین میں کام کرنے والوں کے لیے ایک تحریک و مثال ثابت ہوگا۔ میں خصوصاً اس بات سے خوش ہوں کہ ڈاکٹر عبدالقیوم کی یہ کتاب نہ صرف آنے والے برسوں میں طلبہ کے امتحانی مظاہرہ

(Performance) میں بڑا فرق پیدا کرے گی بلکہ انہیں مسابقتی امتحانات کا سامنا کرنے کا اہل بھی بنائے گی۔

مصنف اور پبلیشر طلبہ کی اس دیرینہ ضرورت کی تکمیل کے لیے اور دوسروں میں اس طرح کے کام کی تحریک پیدا کرنے کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کوثر جے۔ اعظم
پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس
عثمانیہ یونیورسٹی۔ و۔
اعزازی ڈائرکٹر آئی۔سی۔ایس۔ایس۔آر
(ساوتھ ریجن) حیدرآباد۔

اپنی بات

عالمیانہ (گلوبلائیزیشن) کے عمل اور انفارمیشن ٹکنالوجی نے دنیا کو سمیٹ کر حقیقی معنوں میں عالمی دیہات میں تبدیل کردیا ہے۔ دوسری طرف گذشتہ صدی کے آخری دہے سے قوموں کے درمیان سیاسی ، سماجی ، معاشی وفوجی آویزش میں پہلے کے مقابلے میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ بیسویں صدی انقلابات اور جمہوریت کی صدی تھی ، نظریاتی آویزش اور فکری وعلمی مباحث کی صدی تھی۔ جب کہ اکیسویں صدی اپنے تناظر کی وجہ سے قوموں کی بقاء اور سعی پیہم کی صدی ثابت ہوگی۔ نئی صدی کی پہلی اور "نئی جنگ" نے انسانیت کے سامنے نئے چیلنج اور نئے نشانے (Targets) پیش کیے ہیں۔ روز افزوں عالمی تبدیلیوں کے اس عمل سے کوئی شخص بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے کرہ ارض کے فطری توازن میں جو بگاڑ پیدا ہوا ہے اس کے نتیجہ میں انسانی وجود ہی کو خطرات لاحق ہوگئے ہیں۔ ایسے میں بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ اور جانکاری کی ضرورت و افادیت میں پیہم اضافہ ہوا ہے۔ آج سے تقریباً دو دہے قبل ہندوستانی جامعات میں گریجویشن کی سطح پر اس مضمون کو متعارف کرایا گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس موضوع پر انگریزی و دیگر ہندوستانی زبانوں میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اس دوران مضمون کی افادیت اور موضوع کے مطالعہ میں کئی گنا اضافہ بھی ہوا لیکن اُردو زبان میں ابھی تک کسی معیاری علمی کتاب کی عدم موجودگی کی وجہ سے اُردو داں طبقہ اس مضمون کی نوعیت اہمیت اور علمیت سے کماحقہ واقف نہ ہوسکا۔ خصوصاً سیاسیات کے طلبہ کو مسلسل پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ میں گذشتہ پندرہ برسوں سے اس مضمون کے امتحانی بیاضات کی جانچ کا کام کرتا رہا ہوں اس دوران طلبہ کو مطالعہ کے لیے مکمل ومستند مواد کی کمی کو شدت سے محسوس کیا ہوں۔ مطالعہ کے مواد کی کمی کے سبب طلبہ امتحانی سوالات کو صحیح تناظر میں سمجھ کر جوابات نہیں دے پا رہے تھے جس کا اثر نتائج پر پڑ رہا تھا۔

اُردو ذریعہ تعلیم کے طالب علم کی حیثیت سے یہ میری دیرینہ دلی آرزو تھی کہ میں اُردو داں طلبہ کے لیے سیاسیات خصوصاً بین الاقوامی تعلقات میں معیاری تعلیمی وعلمی مواد پیش کرسکوں۔ خدائے تعالیٰ کا میں شکرگذار ہوں کہ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ اُردو دنیا کی ایک

دیرینہ ضرورت کی تکمیل کرسکوں۔ یہ کتاب آندھراپردیش میں عثمانیہ یونیورسٹی، کاکتیہ یونیورسٹی، سری کرشنا دیورائے یونیورسٹی اور ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی میں زیر تعلیم اُردو میڈیم طلبہ کی اس مضمون کی نصابی ضرورت کی بڑی حد تک تکمیل کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی (مانو) اور دیگر ہندوستانی جامعات کے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے نصاب کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ جدید عالمی تاریخ کے طلبہ کے لیے بھی یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔ اس کے بعض اسباق انٹرمیڈیٹ کے دونوں سال کے طلبہ کی ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ اساتذہ کے لیے یہ کتاب زائد مطالعہ‘ مواد اور حوالہ **(Reference book)** کی ضرورتوں کو پورا کرے گی۔ مسابقتی امتحان کی تیاری کے طلبہ کی ضرورتوں کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ آسان زبان میں مکمل مواد کے ساتھ تشریحی انداز میں نفسِ مضمون کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سہولت اور بہتر طور پر مضمون کو سمجھنے کے لیے اسباق کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس سے بتدریج مضمون کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

ہر حصہ ایک خاص تصور اور تسلسل کو پیش کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے حصہ میں بین الاقوامی تعلقات کے عمومی تصورات کو پیش کیا گیا ہے جب کہ دوسرا حصہ بین الاقوامی تعلقات کی جدید تاریخ اور تیسرا حصہ بین الاقوامی اداروں کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ حصہ چہارم عصری دنیا کے مسائل کا مطالعہ ہے۔ اس طرح طالب علم جیسے جیسے ایک کے بعد ایک حصہ کی طرف آگے بڑھتا جائے گا ویسے ویسے مضمون کو سمجھنے اور ذہن نشیں کرنے میں مدد ملے گی۔ آخری حصہ بین الاقوامی امن کے مسائل، ترک اسلحہ، غیر جانبدار تحریک، خارجہ پالیسی اور خصوصاً ہندوستان کی خارجہ پالیسی پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ **1991**ء کی خلیجی جنگ‘ نیا عالمی نظام‘ عالمی دہشت گردی جیسے عصری موضوعات کے لیے ایک باب وقف کیا گیا ہے۔ جہاں ضروری سمجھا گیا وہاں انگریزی اصطلاحوں کو استعمال کیا گیا ہے اور دی گئی معلومات کی اہمیت کے مدنظر مستند حوالہ جات بھی دیئے گئے ہیں روزنامہ سیاست حیدرآباد میں گذشتہ ایک دہے کے دوران اہم بین الاقوامی موضوعات پر چھپی میری بعض تحریروں کو بھی ضروری اضافے **(Update)** کے ساتھ شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ آخر میں کتابیات **(Bibliography)** کو شامل کیا گیا ہے تاکہ طلبہ اس موضوع کی اہم کتابوں کو جان سکیں اور انہیں پڑھیں۔

اُردو زبان میں کسی نصابی کتاب کے لکھنے کا تصور عموماً ایک خام خیال ہوتا ہے جس کو عملی

شکل دینا گویا جوئے شیر لانے کے برابر ہے ۔ میں نے اپنی تمام تر کم مائیگی اور وسائل کی قلت کے باوجود اس کتاب کو لکھنے کا عزم کیا اور مسلسل چھ ماہ کی سعی و جدوجہد کے بعد یہ اب آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔ اس دوران میں ذہنی طور پر کئی نشیب و فراز سے گزرا ہوں ، بہت سوں نے میری ہمت شکنی کی اور بہت کم نے میری ہمت افزائی کی ۔ بہر کیف میں ان تمام احباب کا مشکور ہوں جنہوں نے میری ہمت افزائی کی اور ضروری مشورے دیئے ۔ خصوصاً کوثر ۔ جے ۔ اعظم کا مشکور ہوں جن کی شاگردی میں مجھے سیکھنے کا موقع ملا اور جنہوں نے اس کتاب کے مسودہ کو دیکھا اور پیش لفظ تحریر کیا ۔ میرے دوست ڈاکٹر چینا بسویا اسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ سیاسیات عثمانیہ یونیورسٹی کا مشکور ہوں جنہوں نے میری ہمت افزائی کی اور ضروری مواد سے میری رہنمائی و مدد کی ۔ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ اور میرے ساتھی ڈاکٹر سلمان عابد کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے عملی تجربے سے میری رہنمائی کی اور مفید مشورے دیئے ۔ ناسپاس گذاری ہوگی اگر میں محترم منیر الدین مجاہد صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے پرنٹنگ کی تمام صعوبتوں سے مجھے بچایا اور بحسن وخوبی اس کی طباعت کا اہتمام کیا ۔ میرے عزیز شاگردین حافظ محمد وجیہ اللہ سبحانی کامل الفقہ جامعہ نظامیہ و ایم ۔ اے عثمانیہ' محمد وحید الدین بی ۔ اے ۔ نے کمپیوٹر کمپوزنگ کی ذمہ داری بڑی خوبی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھائی اور میرے لیے ابتدائی اور اہم مراحل کو آسان کیا' محترمہ سیدہ گوہر لکچرر سیوکس پرنس درشہوار جونیر کالج حیدرآباد اور سمیرا نازنین لکچرر سیوکس گرلز جونیر کالج نلگنڈہ نے پروف ریڈنگ کے لیے اپنا وقت نکال کر ایک دقت طلب کام میں میری مدد فرمائی ۔ اپنی نیک خواہشات کے ساتھ ان تمام کے لیے دعا گو ہوں ۔ امید ہے کہ طلبہ و اساتذہ اپنے ردعمل سے مجھے واقف کروائیں گے تاکہ اسے مزید بہتر بنایا جاسکے ۔

ڈاکٹر عبدالقیوم

ریڈر سیاسیات

اُردو آرٹس ایوننگ کالج ، حیدرآباد

26 جنوری 2002ء

فہرست

حصہ اول: بین الاقوامی تعلقات کے تصورات

حصہ دوم : بین الاقوامی تاریخ

حصہ پنجم: عالمی امن کے مسائل اور خارجہ پالیسی

حصہ اول

بین الاقوامی تعلقات کے تصورات

Concepts of International Relations

باب 1

بین الاقوامی تعلقات - تعریف' نوعیت' وسعت اور اہمیت

International Relations-Definition, Nature, Scope and Importance

ارسطو کا یہ کہنا کہ "انسان ایک سماجی حیوان ہے" آج بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا کہ خود اس کے دور میں تھا۔ ارسطو نے تو یہاں تک کہا تھا کہ جو سماج کے بغیر رہ سکتا ہے وہ یا تو خدا ہو سکتا ہے یا پھر جانور۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی بھی انسانی گروہ عالمی انسانی سماج سے یکسر علاحدہ یا دور نہیں رہ سکتا۔ ہر قوم آزاد اور مقتدر ہونے کے باوجود کئی معنوں میں یہ دوسری اقوام یا ممالک کے ساتھ ربط و ضبط میں رہتی ہے۔ اس طرح بین الاقوامی تعلقات عصری دور کی ایک اہم ضرورت و حقیقت ہے۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق انگریزی لفظ **International** کا استعمال **1780**ء میں سب سے پہلے برطانوی مفکر جریمی بینتھم **(Jeremy Bentham)** نے کیا تھا۔ اگرچہ بین الاقوامی تعلقات کا موضوع بحیثیت ایک "علم" **(Discipline)** نیا ہے، لیکن قوموں کے درمیان تعلقات اتنے ہی قدیم ہیں جتنی کہ خود تاریخ۔ مختلف قبائیل، شہریوں، سلطنتوں، حکومتوں اور مملکتوں کے درمیان جنگ و امن کے تعلقات کی تفصیل تاریخی کتب سے معلوم ہوتی ہے۔ قدیم تہذیبوں کے درمیان تجارتی و لین دین کے تعلقات کے تاریخی شواہد بھی ملتے ہیں۔ لیکن قدیم دور میں بین الاقوامی تعلقات حقیقی معنوں میں بین الاقوامی نہیں تھے بلکہ ان کی نوعیت محدود اور علاقائی تھی۔ اور یہ تعلقات قومی جذبے سے یکسر خالی تھے۔ نشاۃ ثانیہ اور خصوصاً یورپ میں **1648**ء کے معاہدہ ویسٹ فیلیا **(Treaty of Westphalia)** کے بعد سے "قوم" کا جدید تصور فروغ پانے لگا اور مملکت انسانی تنظیم کی ایک واضح شکل اختیار کرلی۔ صنعتی انقلاب نے ممالک کی ضرورتوں میں اضافہ کردیا۔ ذرائع حمل ونقل کی تیز رفتار ترقی نے فاصلوں کو سمیٹ کر محدود کردیا۔ سائنسی و صنعتی ایجادات کا اثر حربی آلات واسلحہ پر بھی پڑا۔ گذشتہ صدی میں لڑی گئیں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں سے بین الاقوامی تعلقات اور قوموں کے درمیان بہتر سوجھ

بوجھ کی اہمیت اجاگر ہوئی۔

موجودہ دور میں سائنس اور ٹکنالوجی اور انٹرنیٹ و کمپیوٹر کی ترقی نے دنیا کے فاصلے ختم کردیئے ہیں۔ چنانچہ دنیا اب بہت بڑی ہونے کے باوجود بھی سکڑ کر رہ گئی ہے اور اب یہ حقیقی معنوں میں ایک ''عالمی دیہات'' (Global Village) کہلانے لگی ہے۔ جس کے نتیجے میں، دینا کے کسی ایک حصہ میں ہونے والے واقعات کا اثر فوری طور پر پوری دنیا پر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ آج کوئی بھی مملکت (State) اپنی ضروریات میں خود مکتفی نہیں ہوسکتی، بلکہ اسے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے دوسری مملکتوں اور قوموں سے تعلقات رکھنا پڑتا ہے۔ جس کے نتیجے میں قوموں کے درمیان مختلف نوعیت کے تعلقات پروان چڑھتے ہیں۔ اکثر قومیں دوسری قوموں کے ساتھ اپنے تعلقات کو محض اپنے مفادات کی اساس پر جوڑتی ہیں جس کی وجہ سے قوموں کے درمیان آپسی مثبت اور فائدہ مند تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف، قوموں کے درمیان کئی ایک میدانوں میں باہمی یکسانیت اور نظریاتی مطابقت و موافقت نہ ہونے کی وجہ سے منفی اور مخالفانہ تعلقات بھی پروان چڑھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بین الاقوامی سماج کا امن درہم برہم ہوجاتا ہے اور دنیا جنگ کے خطرات سے قریب ہوجاتی ہے۔

ویسے تو قدیم زمانے میں مختلف علاقوں اور مملکتوں کے درمیان کسی نہ کسی طرح کے تعلقات موجود تھے۔ مصر، یونان، ہندوستان اور چین جیسے قدیم ملکوں کے درمیان تجارتی و سفارتی تعلقات تھے اور ان تعلقات کے لیے کچھ اصول بھی وضع کیے گئے تھے۔ لیکن سترھویں صدی عیسوی سے مملکتوں کے درمیان وسیع بنیادوں پر تعلقات استوار ہونے لگے۔ لیکن ابتداء میں بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ صرف سفارتی تاریخ، فلسفہ اور بین الاقوامی قانون تک ہی محدود تھا اور مختلف اکائیوں کے درمیان حال اور مستقبل کے تعلقات کو سمجھنے کے لیے کوئی عالم گیر اصول وضع نہیں کیے گئے تھے۔ اس طرح بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ واقعاتی (Factual) تھا نظریاتی (Thoretical) نہیں۔ 18 ویں صدی میں جب سے کہ جریمی بینتھم نے قوموں کے قانون کے متعلق اس اصطلاح کا استعمال کیا ہے، تب سے بین الاقوامی تعلقات کی اصطلاح مقتدر اعلیٰ مملکتوں کے درمیان سرکاری تعلقات کے لیے استعمال کی جانے لگی ہے

تعریفات

بین الاقوامی تعلقات کی کوئی ایک تعریف کرنا مشکل ہے۔ چوں کہ بعض مرتبہ اس میں

قوموں کا داخلی مطالعہ بھی شامل ہوجاتا ہے۔ کسی ملک کے داخلی حالات اور داخلی پالیسیوں کا اثر بین الاقوامی سیاست اور حالات پر پڑتا ہے۔ کسی ملک میں حکومت کی تبدیلی اور اسکی پالیسیوں سے بین الاقوامی حالات متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر کوئینسی رائٹ (Quincy Wright) کے مطابق "بین الاقوامی تعلقات عالمی زندگی میں بڑے اور اہم گروہوں کے رویہ کا مطالعہ ہے"۔ لیکن پروفیسر ہینس ۔ جے مارگنتھو (Prof. Hans J.Morgenthau) نے موجودہ دور میں بین الاقوامی تعلقات کی حقیقت پسندانہ تعریف کی ہے۔ چنانچہ ان کے مطابق "بین الاقوامی تعلقات قوموں کے درمیان طاقت کی جدو جہد کا مطالعہ ہے" اسی طرح پروفیسر شلیچر (Prof. Schleicher) نے سادہ طور پر مملکتوں کے درمیان تعلقات کے مطالعہ کو بین الاقوامی تعلقات قرار دیا ہے۔ جب کہ پروفیسر ہاف مین (Prof. Hoffman) کے مطابق "بین الاقوامی سیاست ان عوامل اور سرگرمیوں سے متعلق ہے جو منقسم دنیا کی بنیادی اکائیوں کی بیرونی پالیسیوں اور طاقت پر اثر انداز ہوتی ہیں"۔ Donald J.Puchala نے بین الاقوامی سیاست کو "مملکتوں کے درمیان سیاسی بین العمل (Interaction) کا ایک طرز" قرار دیا ہے۔

دوسرے الفاظ میں بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ آزاد مملکتوں کے درمیان مختلف سرگرمیوں اور باہمی عمل ردعمل (Action Reaction) اور بین العمل (Interaction) کا مطالعہ ہے۔ جس کے ذریعہ مملکتیں ایک دوسرے کے ساتھ مختلف طریقوں اور مختلف سطحوں پر تعلقات کو رکھتے ہوئے اپنے مفادات کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات اپنی نوعیت میں ایک منفرد موضوع ہے، چوں کہ یہ ان اکائیوں اور اداکاروں (Actors) سے بحث کرتا ہے جن کے درمیان کوئی مرکزیت نہیں ہوتی۔ بین الاقوامی سطح پر کام کرنے والے اداکار آزاد اور مقتدر مملکتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے انہیں کسی بھی طرح سے کسی خاص اصول یا قانون پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ، بین الاقوامی تعلقات میں قوموں اور مملکتوں کے درمیان تعلقات متوازی اور مساوی قسم کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے بین الاقوامی تعلقات میں کوئی مرکزیت نہیں پائی جاتی۔ اس طرح بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ قوموں کے درمیان محض طاقت کے توازن اور قومی مفادات کے حصول کا مطالعہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ بین الاقوامی نظام میں طاقت (Power) کا عنصر ایک اہم عامل کے طور پر کام کرتا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات بحیثیت ایک مضمون قوموں کے درمیان تعلقات کی نوعیت اور

وسعت کا مطالعہ کرتا ہے ۔ قومیں اپنے مفاد کے حصول کے لیے خارجہ پالیسی بناتی ہیں اور ہر مملکت اپنی خارجہ پالیسی کے حدود میں اپنے مفادات کے تحفظ کی کوشش کرتی ہے ۔ بعض مرتبہ قومیں اپنے مفاد کے حصول کے لیے ضروری طاقت اور جبری قوت کا مظاہرہ بھی کرتی ہیں ۔ اس طرح قومیں ایک دوسرے کے خلاف حالت جنگ میں آجاتی ہیں ۔ اسی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ میں قوموں کے درمیان طاقت اور اس کے توازن کا مطالعہ بہت ہی اہمیت اختیار کرگیا ہے ۔

وسعت Scope

موجودہ دور میں بین الاقوامی تعلقات کی وسعت میں بہت اضافہ ہوا ہے ۔ بین الاقوامی تعلقات کی وسعت کے متعلق دو مکتب خیال پائے جاتے ہیں ۔ ایک وہ جو بین الاقوامی تعلقات میں صرف سرکاری سطح کے تعلقات کو ہی شامل کرنا چاہتا ہے ۔ جب کہ دوسرا مکتب فکر سرکاری ، غیرسرکاری اور نیم سرکاری تمام قسم کی سرگرمیوں اور تعلقات کو بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ میں شامل کرنا چاہتا ہے ۔ چانچہ ابتداء میں بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ صرف سفارتی تاریخ ، بین الاقوامی قانون اور فلسفہ تک ہی محدود تھا ۔ پہلا مکتب خیال صرف اسی وسعت کا حامی ہے اور اس کے مطابق قوموں اور حکومتوں کے درمیان سرکاری جنگ و امن کے تعلقات ہی اس موضوع کا اہم مرکز ہیں ۔ لیکن چوں کہ اب بین الاقوامی تعلقات کا موضوع وسیع ترین موضوعات ، حتی کہ ماحولیاتی مسائل آلودگی ، انسانی حقوق وغیرہ کا احاطہ کرتا ہے ، اس لیے دوسرے مکتب خیال کے مطابق قوموں کے درمیان سماجی ، معاشی تعلیمی تہذیبی اور فنی تعلقات بھی بین الاقوامی تعلقات کا موضوع مطالعہ ہے ۔ اس طرح یہ مکتب خیال وسیع النظر خیالات کی ترجمانی کرتا ہے ۔ چنانچہ Quincy Wright کے الفاظ میں یہ صرف قومیں ہی نہیں جو بین الاقوامی تعلقات کو بناتے ہیں بلکہ مختلف گروہ جیسے قومیں ، مملکتیں ، حکومتیں ، عوام ، علاقائی اتحادات ، کانفیڈریشن وغیرہ بھی بین الاقوامی تعلقات کو بناتے ہیں ۔ اس کے علاوہ اس نے بین الاقوامی سیاست' بین الاقوامی قانون' بین الاقوامی تنظیم' بین الاقوامی معاشیات' بین الاقوامی اخلاق' نفسیات' بین الاقوامی تعلقات کی سماجیات' عالمی تاریخ' سیاسی جغرافیہ' آبادی کا سیاسی مطالعہ اور ٹکنالوجی کے مطالعہ کو بھی بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ میں شامل کرنے پر زور دیا ہے ۔

بین الاقوامی تنظیموں ، صنعتی ، تہذیبی اور مذہبی تنظیموں کو بھی بین الاقوامی تعلقات کے

مطالعہ میں شامل کیا جانا چاہیے تا کہ یہ مطالعہ زیادہ حقیقت پسندانہ ہو سکے ۔ چنانچہ James Roseneau کا کہنا ہے کہ عالمی سیاست میں داخلی واقعات کو بین الاقوامی واقعات سے جوڑ دیا جاتا ہے ۔ اور ان تعلقات کے درمیان خط تمیزی کا کھینچنا مشکل ہے ۔ مثلاً کسی ملک میں وقوع پذیر ہونے والے دہشت گردی کے واقعات اگر چیکہ کسی قوم کا داخلی معاملہ ہوتا ہے لیکن اس کے بین الاقوامی عناصر سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ اس طرح کسی ملک کا اپنی کرنسی کی قدر کو گھٹا دینے کا فیصلہ خالصتاً ایک قومی اقدام ہوتا ہے، لیکن اس کے دور رس بین الاقوامی اثرات بھی ہوتے ہیں ۔ اس لیے Trygave Matheisen کہتا ہے کہ مملکت کے داخلی امور سبھی بین الاقوامی دائرہ عمل میں آتے ہیں ۔

گذشتہ صدی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد مجلس اقوام کے قیام سے بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کی وسعت میں مزید اضافہ ہوا ۔ چنانچہ اب اس کے مطالعہ میں بین الاقوامی اداروں جیسے مجلس اقوام (Leage of Nations) ، اقوام متحدہ (U.N.O) ، عالمی بینک ، W.T.O وغیرہ کا مطالعہ بھی شامل ہوگیا ہے ۔ ان اداروں کی کارکردگی ، عالمی امن پر اس کے اثرات اور ان اداروں کے پیچھے کارفرما طاقتوں وعوامل کا مطالعہ خصوصی توجہ اور دلچسپی کا حامل ہے ۔ دوسری طرف پہلی جنگ عظیم کے بعد سے بین الاقوامی سطح پر نئی تبدیلیاں وقوع پذیر ہونے لگیں تو اس کے مطالعہ میں طاقت (Power) کے عنصر کو ایک اہم مقام ملا ۔ اس طرح ممالک کی فوجی و دفاعی ، خارجی پالیسی اور سیاسی قائدین کے رویے اور اس کے نفسیاتی پہلوؤں کو بھی بین الاقوامی تعلقات کے موضوع میں شامل کیا گیا۔ عالمی امن اور انسانیت کو لاحق دوسرے خطرات جیسے آلودگی ، دہشت گردی ، عالمی مالیاتی بحران ، انسانی حقوق کا مطالعہ اب بین الاقوامی تعلقات کے نئے ابھرتے شعبے ہیں ۔ بین الاقوامی معاہدات جیسے CENTO‘SEATO ‘NATO‘ Warsaw‘ANZUS اور بین الاقوامی تعاون EU‘OAS‘ SAAR‘ECO وغیرہ اس کے مطالعہ کے لازمی اجزاء ہیں۔

مختصر یہ کہ آج بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ میں سفارت کاری (Diplomacy) بین الاقوامی قانون ، سیاسی تاریخ ، بین الاقوامی سیاست ، بین الاقوامی تنظیم ،نظم ونسق ، بین الاقوامی ادارہ ، جنگ وامن ، دفاعی وخارجی امور کے ساتھ ساتھ قوموں کا نفسیاتی مطالعہ بھی شامل ہے ۔ آج ماہرین مملکتوں کے اقدامات اور حرکات کے پیچھے کارفرما عوامل اور نفسیاتی پہلوؤں کے

مطالعہ میں مصروف ہیں تاکہ بین الاقوامی تعلقات میں نظریات کی وضاحت کی جاسکے۔ اس لیے اب بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ میں سماجی علوم کی تکنیکوں کو بھی استعمال کیا جانے لگا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض ماہرین کی نظر میں بین الاقوامی تعلقات کا مضمون ابھی بھی ایک علاحدہ علم یا Discipline نہیں ہے۔ بلکہ یہ علم سیاسیات اور تاریخ کا ہی ایک جز ہے۔ موجودہ بین الاقوامی تعلقات بدلتی ہوئی دنیا کا مطالعہ ہے، چونکہ یہ خود ایک منظّم علم نہیں ہے اس لیے اس کے مختلف طریقے ہیں اور اکثر وبیشتر اسکا انحصار اس موضوع پر لکھنے والوں کے مفادات اور تصورات پر منحصر ہے۔ چوں کہ یہ علم تاریخ اور سیاسیات سے نکلا ہے اس لیے اس کے مطالعہ کے طریقے بھی وہی ہیں جو ان دو موضوعات کے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کے اصول اور ابتدائی عوامل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، جب کے بین الاقوامی ماحول میں تبدیلی آئی ہے اور یہ مستقلاً بدل رہا ہے۔ یہ تبدیلی مملکتی نظام میں تبدیلی کا نتیجہ ہے اس لیے آج بھی بین الاقوامی تعلقات کا اہم موضوع قومی مملکتی نظام اور بین مملکتی تعلقات ہیں۔

1947ء میں امریکی کونسل آف فارن ریلیشنس کی رپورٹ میں بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کے پانچ اہم اجزاء بتلائے گئے ہیں۔ 1. مملکتی نظام کی ہیت اور ان کے کام کرنے کے طریقے، 2. مملکت کی طاقت پر اثر انداز ہونے والے عوامل، 3. بین الاقوامی صورت حال اور بڑی طاقتوں کی خارجہ پالیسیاں، 4. جدید بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ، 5. زیادہ مستحکم و پائدار عالمی تنظیم کا قیام۔

اس کے سات سال بعد Winsont Baker نے اپنے ایک سروے میں دوسرے اہم اجزاء کی طرف نشاندہی کی ہے۔ 1. بین الاقوامی سیاست کی ہیت اور اہم طاقتیں 2، بین الاقوامی زندگی کی سیاسی اور معاشی تنظیمیں 3. قومی طاقت کے اجزاء 4. قومی مفاد کے فروغ کے لیے دستیاب ذرائع، 5. قومی طاقت پر کنٹرول اور تحدیدات، 6. بڑی طاقتوں کی خارجہ پالیسیاں، 7. جدید معاشی تاریخ۔

بین الاقوامی تعلقات بہ حیثیت ایک علم

بین الاقوامی تعلقات کا آغاز علم سیاسیات اور تاریخ سے اس کے کمزور رشتہ کے ساتھ شروع ہوا تھا اور آج بھی اسے ایک منظّم علم کا مقام حاصل نہیں ہے۔ اس میں واضح نظریاتی ڈھانچے اور قابل عمل سائنٹفک نظریات کا فقدان ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کا دوسرے منظّم علوم

پر انحصار زیادہ ہے۔اس کے باوجود دوسرے علوم سے ہٹ کر اس کی اپنی چند خصوصیات ہیں اور مسائل سے نمٹنے کا اسکا ایک مخصوص طریقہ ہے۔اسی لیے Stanley Hoffman کے مطابق بین الاقوامی تعلقات تجرباتی مقاصد کے لیے علاحدہ میدان رکھتا ہے اور اسی لیے اسے ایک آزاد اور خودمختار علم سمجھا جاسکتا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کو مطالعہ اور تحقیق کے میدانوں میں ایک مکمل علم یا ڈسپلن سمجھا جاتا ہے۔اس کا ایک امتیازی طریقہ ہے، اس کے نظریات امتیازی ہیں اور اس کا موضوع بھی امتیازی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات پر بین الاقوامی ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے ۔ یہ انتہائی موضوعاتی (Subjective) خصوصیات کا حامل ہے۔اس لیے E.H. Carr نے اسے تصوراتی یا خیالی قرار دیا ہے۔اس کا مطالعہ جذباتی طور پر جنگ کو روکنے کی خواہش پر ہوتا ہے۔ لیکن مجلس اقوام اور دیگر اداروں واجتماعی نظام کی ناکامیوں سے بین الاقوامی تعلقات کی کمزوری اور غیر کارکردگی کا علم ہوتا ہے۔گذشتہ صدی کی غیر یقینی کیفیت حملوں اور جنگوں کی وجہ سے ایک معقولیت پسند مکتب (Rationalist School) پیدا ہوا جو بین الاقوامی تعلقات کو مشاہدہ کی بنیاد پر سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

بین الاقوامی سیاست یا بین الاقوامی تعلقات

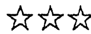
عموماً ان دونوں اصطلاحوں کو ایک دوسرے کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں اصطلاحیں ایک دوسرے سے خلط ملط ہوگئی ہیں۔لیکن سیاسی رویے کا مطالعہ رکھنے والے ماہرین ان دو اصطلاحوں میں فرق کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مطابق بین الاقوامی سیاست کا موضوع بہت ہی محدود ہے اس میں صرف ڈپلومیسی اور مملکتوں و دیگر سیاسی اکائیوں کے تعلقات ہی شامل ہیں۔یعنی بین الاقوامی سیاست میں صرف سرکاری تعلقات ہی شامل ہوتے ہیں۔ جب کہ بین الاقوامی تعلقات کی اصطلاح ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں تمام قسم کے تعلقات عوام اور گروہوں کے درمیان تعلقات پر بحث کی جاتی ہے۔ غیر حکومتی تنظیمیں آج ایک اہم رول ادا کررہی ہیں۔ Hoffman کے مطابق ''بین الاقوامی تعلقات ان عوامل اور سرگرمیوں سے متعلق ہے جو منقسم دنیا کی بنیادی اکائیوں کی بیرونی پالیسیوں پر اثرانداز ہوتے ہیں''۔ Adi H.Doctor نے ان دونوں کے درمیان فرق کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ جو اپنے مطالعہ میں مخالفانہ تعلقات میں دلچسپی رکھتے ہیں اسے ''بین الاقوامی سیاست'' اور جو اپنے مطالعہ میں تعاون کے تعلقات کو شامل کرتے ہیں اسے ''بین الاقوامی تعلقات'' کا نام دیتے ہیں۔بہر

کیف بین الاقوامی سیاست اور تعلقات کے درمیان فرق عملی نہیں بلکہ فکری ہے۔

مطالعہ کی اہمیت

آج انسان عالمی ماحول میں رہتا ہے۔ چنانچہ وہ صرف اپنے ملک کا ہی نہیں بلکہ وسیع طور پر کرۂ ارض کی شہریت رکھتا ہے۔ عالم گیریت (Globalisation) کے اس دور میں دنیا سمٹ کر عملی طور پر ایک عالمی دیہات (Global Village) میں تبدیل ہوچکی ہے۔ چنانچہ بین الاقوامی سطح پر ہونے والے واقعات تبدیلیوں، رجحانات اور بین الاقوامی سیاست سے کوئی بھی شخص بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ آج انسانیت کو کئی سطحوں پر خطرات اور چیلنج درپیش ہیں، جنہیں حل کرنے کے لیے بین الاقوامی برادری کو متحدہ اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ سے ایک شہری ان تمام باتوں سے واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔ اور اس کی مدد سے بین الاقوامی ماحول کے قیام میں اپنا مثبت حصہ ادا کرسکتا ہے۔

سائنس وٹکنالوجی کی ترقی نے آج انسانیت کے لیے تباہی کے دروازے کھول دیئے ہیں چنانچہ سائنس کی ترقی نے جنگ کی نوعیت کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ جب مملکتیں اپنے تنگ نظر قوم پرستانہ نظریات کی بنیاد پر ایک دوسرے سے متصادم ہوجاتی ہیں تو اس سے انسانیت کا نقصان ہوگا۔ بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ انسان کو عالمی برادری کی لڑی میں پروتا ہے اور قومی مفادات کو عظیم تر انسانی مفادات کے تابع کرتے ہوئے عالمی ماحول کی برقراری پر توجہ دیتا ہے۔ جس سے دنیا میں امن قایم ہوسکتا ہے اور بہتر زندگی کے لیے ممالک ایک دوسرے کے وسائل سے استفادہ کرسکتے ہیں۔



باب 2

بین الاقوامی تعلقات کا ارتقاء اور قومی مملکتی نظام کی ابتداء

Evolution of International Relations and the birth of Nation State System

گذشتہ صدی میں اور خصوصاً دوسری جنگ عظیم سے قبل بین الاقوامی تعلقات کا دائرہ صرف برآعظم یوروپ تک ہی محدود تھا اور یوروپ کے ممالک عظیم تر صنعتی و معاشی ترقی کی وجہ سے ساری دنیا میں اپنا نو آبادیاتی غلبہ رکھتے تھے۔ چنانچہ بین الاقوامی تعلقات میں دوسرے علاقوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی ۔ لیکن گذشتہ صدی کے پچاس کے دہے میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمے سے آزاد قومی مملکتیں معرض وجود میں آ گئیں اور یہی قومی مملکتیں آج کے بین الاقوامی تعلقات میں غالب خصوصیات کی حامل ہیں اور بین الاقوامی سیاست میں اہم اداکار کا رول ادا کرتی ہیں ۔ چنانچہ آج دنیا کی آبادی مختلف گروہوں اور مقتدر قومی مملکتوں میں منظم ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر انسان آج قوموں کی شکل میں منظم نہ ہوا ہوتا اور اپنے مقتدر حکام کی اطاعت نہ کیا ہوتا تو پھر کسی بھی قسم کے تعلقات ان گروہوں اور قوموں کے درمیان ممکن نہ ہوتے ۔ اس لیے قومی مملکتی نظام کی تعریف پامیر اور پرکنس (Palmer &Perkins) نے اپنی کتاب ''بین الاقوامی تعلقات'' (International Relations) میں اس طرح کی ہے'' قومی مملکتی نظام ایک ایسا سیاسی طریقہ زندگی ہے جس میں عوام علیحدہ طور پر مقتدر مملکتوں میں منظم ہوتے ہیں اور جو ایک دوسرے سے مختلف سطحوں اور مختلف طریقوں سے باہمی تعلقات رکھتے ہیں''۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں تمام اقوام کے درمیان تعلقات ہمیشہ خوشگوار اور دوستانہ نہیں رہتے بلکہ ان کے درمیان تعلقات میں مسائل جھگڑے اور کشیدگیاں وغیرہ پیدا ہوتے ہیں ۔ جو دراصل قوموں کے مفادات کے ٹکراؤ یا قوموں کے انفرادی مفادات کی وجہ سے ہوتے ہیں ۔ چنانچہ قومی مملکتیں آپسی تعلقات میں مفادات کے تحفظ کے لیے قوت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتیں ، بلکہ ہر مملکت اپنی جغرافیائی سلامتی اور مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے تمام تر وسائل اور قوت کو مجتمع کرتے ہوئے قومی طاقت کی تعمیر کرتی ہے ۔ اس طرح ہر مملکت طاقت کے اعتبار سے اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز رکھنا

چاہتی ہے۔

بین الاقوامی تعلقات میں مملکتی نظام کی ابتداء 1648ء کے معاہدہ ویسٹ فیلیا (West Phalia) سے ہوئی۔ اگرچہ قدیم دور میں بھی ہندوستان، چین، مسوپٹومیا اور مصر وغیرہ کے درمیان تعلقات ہوا کرتے تھے لیکن ان کی عمومی نوعیت چند اصولوں پر مبنی تجارت کی تھی۔ بعد میں یوروپ میں ایک عظیم تر رومی سلطنت کے قیام نے یوروپ کو مجتمع کیا، اس کے باوجود دوسرے علاقوں سے یوروپ پھر بھی الگ تھلگ ہی رہا۔ رومی سلطنت کے زوال کے بعد کلیسا (Church) کو اہمیت حاصل ہوگئی اور کلیسا کی مقدس سلطنت پورے یوروپ پر قایم ہوگئی۔ اس میں یوروپ کی تمام سلطنتیں مقدس کلیسا کی سلطنت کے آگے باج گذار بن کر رہ گئیں۔ اس طرح پاپائے اعظم (Pope) کا اختیار یوروپ کی پوری عیسائی دنیا پر یکساں تھا۔ لیکن 1616ء سے 1648ء کے دوران یوروپ میں لڑی گئی تیس سالہ جنگ نے مقدس رومی سلطنت کی بنیادوں کو ہلاکر رکھ دیا۔ 1648ء کے معاہدہ ویسٹ فیلیا کے ذریعہ یوروپ کی سلطنتوں پر کلیسا کا برتر اقتدار ختم ہوکر صرف شہر ویٹیکن تک گھٹ کر رہ گیا۔ اس طرح معاہدہ ویسٹ فیلیا سے قومی مملکتوں کی ابتداء ہوئی۔ اسی دور میں میکیاویلی کے سیاسی فلسفہ نے تصور قوم اور قومی مملکت کی آبیاری بھی کی۔ پوپ کے اختیارات صرف مذہبی امور تک ہی محدود ہوگئے اور معاہدہ ویسٹ فیلیا کے ذریعہ مملکت کے برتر اختیار (Authority) کو تسلیم کیا گیا۔ جس کی رو سے ہر مملکت کو اپنے عوام کی طاقت اور وسائل کو اپنی مرضی کے مطابق داخلی یا خارجی اثرات و دباؤ یا تحدیدات کے بغیر آزادانہ استعمال کا حق حاصل ہوگیا۔

اگرچہ نظریاتی طور پر تمام مملکتوں کو مساوی حیثیت حاصل تھی لیکن ان کو حاصل حقیقی طاقت کے اعتبار سے یہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ رفتہ رفتہ نمائندہ حکومتوں کے عروج، صنعتی انقلاب، آبادیوں میں تبدیلی، بین الاقوامی قانون کے فروغ، سفارت کاری کے ارتقاء، معاشی امور میں مملکتوں کے ایک دوسرے پر انحصار اور تنازعات کے شریفانہ و پرامن حل کے طریقوں کی وجہ سے مملکتی نظام میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ خصوصاً یوروپ کے باہر نوآبادیات کے خاتمہ اور ایک نئی تیسری دنیا کے ابھرنے سے یوروپ کے مملکتی نظام کو وسعت حاصل ہوئی اور قدیم مملکتی نظام کی ہیئت ہی بدل گئی۔ بیسویں صدی میں قوم پرستی کے فروغ کی وجہ سے مملکتی نظام پر بہت بڑا اثر پڑا۔ پوری دنیا میں قوم کی بنیادوں پر سرحدات کا تعین ہوا۔ آبادیوں

کی تقسیم ہوئی اور ایک مملکت کے عوام دوسری مملکت کے عوام کو ایک علیحدہ اکائی سمجھنے لگے۔ جس کی وجہ سے ایک عام شہری بھی اپنے ملک کی سیاسی و عوامی زندگی میں گہرے طور پر ملوث ہوگیا اور عوام کے درمیان تعلقات میں تصور قوم کا عنصر داخل ہوگیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد قومی مملکتی نظام کو فروغ حاصل ہوا۔ کیوں کہ پہلی مرتبہ ایک غیر یوروپی طاقت، ریاست ہائے متحدہ امریکہ (United States of America) کو یوروپ کے معاملات میں مداخلت کا موقع مل گیا۔ اس طرح یوروپ کا قومی مملکتی نظام یوروپ کے حدود کے باہر تک پھیل گیا۔ خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ سے بین الاقوامی تعلقات میں نئی قومی مملکتوں کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہوا اور ان نوآزاد مملکتوں نے ایک غیر جانبدار بلاک کے ذریعہ ایک متحدہ حکمت عملی کو اپناتے ہوئے بین الاقوامی سیاسی اور عالمی امور میں اپنا ایک مقام حاصل کرلیا۔ اس کے علاوہ 19 ویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں جدید جنگی ٹکنالوجی کا بھی مملکتی نظام پر گہرا اثر پڑا کیوں کہ اس عرصہ میں مملکتیں اپنے حریف دشمن ملک کو نیست و نابود کرنے کے جذبہ کے تحت جنگیں لڑنے لگیں تاکہ اس طرح سے مفتوحہ قوم پر اپنے سیاسی، سماجی و تمدنی اداروں کو غالب کرسکے۔ اس کے علاوہ سیاسی نظریات اور تصورات نے بھی جدید مملکتی نظام کو تبدیل کیا ہے۔ ابتدائی دور میں، مملکتوں کے درمیان تنازعات کی نوعیت صرف علاقائی یا جغرافیائی ہوتی تھی۔ 19 ویں صدی میں مملکتوں کے درمیان نظریاتی بنیادوں پر اختلافات پیدا ہوگئے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں اکثر جنگیں شہنشاہیت کے خلاف لڑی گئیں اور ان جنگوں پر انقلاب فرانس کے اثرات حریت نمایاں تھے۔ گذشتہ صدی میں بھی اکثر جنگیں نظریات کی بنیادوں پر ہی لڑی گئیں۔ دوسری جنگ عظیم کو نازی بربریت اور فسطائیت کے خلاف جمہوریت کی لڑائی سمجھی گئی۔ اس کے علاوہ امریکہ اور سویت یونین کے درمیان جاری سرد جنگ سرمایہ داریت اور اشتراکیت (سوشلزم) کے درمیان اختلافات کا نتیجہ تھی۔

جدید مملکتی نظام Modern State System

جدید مملکتی نظام بنیادی طور پر انیسویں صدی کے مملکتی نظام سے مختلف نہیں ہے۔ چنانچہ Prof. P.Holsti کا کہنا ہے کہ تہذیبی اختلافات کے باوجود مملکتی نظام یوروپ کے سفارتی، معاشی، فوجی وراثت کی نمائندگی کرتا ہے اور جو چیز عصری بین الاقوامی نظام کو یوروپی نظام سے مختلف کرتی ہے وہ صرف یہ کہ آج غیر یوروپی مملکتوں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہوا

ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آج بھی جدید مملکتی نظام کی بنیادیں وہی ہیں جو ماضی میں تھیں۔ چنانچہ اقتدار اعلیٰ، علاقائی سالمیت و یکجہتی اور مملکتوں کے درمیان قانونی مساوات کو آج بھی قومی مملکتوں کی بنیادیں سمجھا جاتا ہے۔

اقتدار اعلیٰ Sovereignty

اقتدار اعلیٰ سے مراد یہ ہے کہ آج مملکتیں اور ان کی حکومتیں اپنے علاقائی حدود میں آزاد اور خود مختار ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی اتھاریٹی ہیں۔ یہ وہ اصول ہے جسے سب سے پہلے 1648ء کے معاہدہ ویسٹ فیلیا میں تسلیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے مطابق صرف مقتدر مملکتیں ہی ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ تعلقات میں داخل ہوسکتی تھیں۔ ایک ایسی اکائی جسے اقتدار اعلیٰ حاصل نہ ہو مملکتی نظام میں قانونی اکائی نہیں بن سکتی تھی اور نہ ایسی اکائی دوسری مملکتوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کرسکتی تھی اور نہ کسی بین الاقوامی تنظیم کی رکن بن سکتی تھی۔ اسی طرح اقتدار اعلیٰ نہ رکھنے والی کوئی بھی اکائی بین الاقوامی قانون کے تحت مملکتوں کو حاصل ہونے والے حقوق پر اپنا حق نہیں جتا سکتی تھی۔ آج بھی ایک ایسی سیاسی اکائی جو سیاسی اقتدار اعلیٰ کی حامل نہ ہو مقتدر قومی مملکتوں کے درمیان کوئی قانونی موقف نہیں رکھتی۔ ایک مقتدر مملکت کو اپنے علاقہ پر حکومت کرنے کا پورا حق ہوتا ہے اور کوئی بھی بیرونی اتھاریٹی اس کے اس حق کو محدود نہیں کرسکتی۔ مملکت کا اقتدار اعلیٰ اسکی سرزمین کے علاوہ اسکے فضائی و آبی حدود پر بھی یکساں طور پر ہوتا ہے۔

لیکن آج بین الاقوامی نظام میں چند ایک سیاسی اکائیاں ایسی موجود ہیں جو اقتدار اعلیٰ کی حامل نہ ہونے کے باوجود بھی قومی مملکتی نظام میں قانونی موقف کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر قوموں کے ساتھ نہ صرف تعلقات بلکہ عالمی سیاست میں ایک اہم ترین اکائی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تنظیم آزادی فلسطین (PLO)، نامیبیا میں آزادی سے قبل وہاں کی سیاسی جماعت SWAPO اور جنوبی آفریقہ کی نیلسن منڈیلا کی زیر قیادت آفریکن نیشنل کانگریس (ANC) وغیرہ کو بین الاقوامی برادری میں قبولیت اور گفتگو و بات چیت کے لیے ایک سیاسی اکائی کا رتبہ حاصل تھا۔ آج عالمی ادارہ تجارت ایک قومی سیاسی اکائی نہ ہونے کے باوجود عالمی تجارت کے شرائط کا تعین کرتے ہوئے قوموں کے ساتھ معاہدات کررہا ہے۔ اس کے علاوہ کسی وفاق کی اکائیاں بھی بین الاقوامی اداروں اور قوموں کے ساتھ معاہدات میں شامل ہورہی ہیں۔ معاشی انحصار اور غیر مملکتی تنظیموں (Non-State Organizations) کی کارکردگی نے قومی اقتدار اعلیٰ کے غیر

لچکدار تصور کو ہی چیلنج کیا ہے ۔ بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی غیر حکومتی تنظیمیں، جامعات، مالی ادارے وتہذیبی انجمنیں بین الاقوامی پردے پر سرگرم رول ادا کررہی ہیں۔

علاقائی یکجہتی Territorial Integrity

قومی مملکتی نظام کی دوسری اہم خصوصیت علاقائی سالمیت اور یکجہتی ہے ۔ مقتدر مملکت اپنے داخلی امور میں کسی بیرونی مداخلت کو پسند نہیں کرتی اور اس طرح دوسری مملکتوں کے اندرونی امور میں مداخلت سے بھی گریز کریگی ۔ بلکہ مملکتیں ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت کا احترام کریں گی ۔ ہر مملکت کا ایک متعینہ رقبہ ہوتا ہے اور اس پر اسکا اقتدار اعلیٰ کارفرما ہوتا ہے ۔ سترھویں صدی عیسوی سے مملکتیں ایک متعینہ حدود و رقبہ کی حامل بن گئی ہیں ۔ آج ہر مملکت اپنے حدود اور رقبے سے جانی جاتی ہے ۔ اقتدار اعلیٰ اور علاقائی خود مختاری کے بغیر کوئی مملکت باقی نہیں رہتی ۔ علاقائی وحدت اور اقتدار اعلیٰ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں ۔ مملکت کی علاقائی وحدت باقی نہ رہتی ہو تو اقتدار اعلیٰ بھی منقسم ہوجاتا ہے اور ایسی مملکتیں بین الاقوامی برادری میں متنازعہ اور بین الاقوامی برادری سے الگ تھلگ ہوکر رہ جاتی ہیں ۔

قانوناً ہر مملکت ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت کا احترام کرنے کے لیے پابند ہے، لیکن اس کے باوجود یہ اصول بین الاقوامی سیاست میں طاقت کے توازن اور قومی مفادات کے تابع ہے ۔ چنانچہ اکثر بڑی مملکتیں چھوٹی مملکتوں کو اپنی طاقت کا نشانہ بناتے ہوئے، علاقائی سالمیت کے بین الاقوامی اصول کی کھلی خلاف ورزی کرتی ہیں۔ ہمیشہ چھوٹی اکائیوں کو بڑی طاقتوں سے خطرہ لاحق رہتا ہے ۔ گذشتہ برسوں میں افغانستان میں سویت یونین کی مداخلت، پناما میں امریکہ کا فوجی اقدام، لیبیاء پر امریکہ کی فوج کشی، کویت پر عراق کی جارحیت، افغانستان پر امریکی فوج کشی وغیرہ اسکی واضح مثالیں ہیں ۔ اسی لیے علاقائی سالمیت کے لیے مملکتیں علاقائی اتحادات اور تعاون پر زور دے رہی ہیں ۔ جس کی وجہ سے دنیا بڑے بڑے اتحادی گروہوں یا اکائیوں میں منظم ہوکر ایک مبسوط اکائی بن رہی ہے ۔ یوروپین یونین (European Union)، آسیان (ASEAN) وغیرہ اس کی مثالیں ہیں ۔

قانونی مساوات Legal Equality

تمام قومی مملکتیں اپنے رقبہ آبادی، قومی طاقت اور معاشی وسائل میں مختلف ہونے کے باوجود بین الاقوامی سماج میں مساوی درجہ کی رکن سمجھی جاتی ہیں ۔ چنانچہ چھوٹی اور بڑی مملکتوں

کے درمیان مساوات کے حق کے اصول کو اقوام متحدہ کے منشور میں تسلیم کیا گیا ہے ۔ اس طرح بین الاقوامی قانون تمام مملکتوں کی قانونی مساوات کو تسلیم کرتا ہے ۔ اس وجہ سے بین الاقوامی تعلقات میں کام کرنے والی سیاسی اکائیاں مساوی حق کی حامل ہیں ۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تمام ممالک کو مساوی طور پر ایک ہی ووٹ کا حق حاصل ہے' اگرچیکہ ہر ملک جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ایک پانچ رکنی وفد کو روانہ کرتا ہے ۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام مملکتیں بین الاقوامی برادری میں مساوی حیثیت و رتبہ نہیں رکھتیں ۔ بلکہ ہر مملکت اپنی طاقت اور اپنے اثر میں دوسروں سے الگ ہوتی ہے ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ او سویت یونین عالمی سیاست میں عظیم طاقتیں (Super Powers) بن کر ابھرے ۔ دونوں عظیم طاقتوں نے دنیا کو دو مخالف کیمپوں میں تقسیم کردیا تھا جس کی وجہ سے دنیا میں طاقت کے دو مراکز کا دو قطبی نظام (Bi-Polarity System) وجود میں آیا ۔ اب سویت یونین کی عدم موجودگی سے امریکہ واحد برتر طاقت بن چکا ہے اور عالمی نظام میں اس کی مرضی کو بڑا دخل ہے ۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پانچ بڑی طاقتوں امریکہ ، روس ، برطانیہ ، فرانس اور چین کو حق تنسیخ (Veto) حاصل ہے جس سے بین الاقوامی نظام میں تمام مملکتوں کی قانونی مساوات کا اصول خود بہ خود ختم ہوجاتا ہے ۔

اسکے علاوہ جدید قومی مملکتی نظام میں اصولوں کی جگہ عملی طاقت کو حاصل ہے ۔ قوموں کے کام کرنے کا انحصار بین الاقوامی نظام میں ان کی پوزیشن' اثر انداز ہونے کی ان کی صلاحیت اور عالمی تناظر و ماحول پر ہے ۔ اس کے باوجود Palmer اور Perkins کے مطابق قومی مملکتی نظام آج بھی بین الاقوامی زندگی کا سیاسی چوکھٹا ہے ۔ اگرچیکہ قومی مملکتوں کی ہیئت میں نمایاں تبدیلی آئی ہے اس کے باوجود یہ آج بھی بین الاقوامی سیاست کے اہم اداکار ہیں جن کے درمیان عمل ردعمل اور بین العمل کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے ۔ گزشتہ صدی کے وسط سے ماہرین نے یہ کہنا شروع کیا تھا کہ مملکتی نظام اب ختم ہونے کو ہے ۔ چنانچہ قوموں کے درمیان معاشی رقابت ، نفسیاتی جنگ ، فضائی جنگ اور نیوکلیر اسلحہ کی وجہ سے صدیوں پرانے قومی ممکتی نظام کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے ۔ اب مملکتی سرحدات اور اقتدار اعلیٰ محفوظ نہیں رہے ۔ طویل فاصلے تک وار کرنے والے میزائیل کی وجہ سے دور دراز کے ممالک حتیٰ کہ سوپر پاورز کی سلامتی بھی خطرے میں پڑگئی ہے ۔ اس طرح تمام ممالک ایک دوسرے کے نشانہ اور زد پر ہیں ۔ دہشت گردی

سرحدی حدود کو پھلانگ کر تمام نظاموں اور انسانی وجود کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔قوموں کے درمیان علاقائی اتحادات آزادانہ تجارت نے ایک وسیع سیاسی جغرافیہ کو ایک ہی بڑی اکائی بنا دیا ہے۔یکم جنوری 2002ء سے یوروپین یونین کے 12 ممالک میں یورو کا نفاذ مملکت کے اقتدار اعلیٰ کو تہس نہس کردیا ہے جس سے قومی مملکتی نظام اور قوم بحیثیت اکائی عالمی سیاست میں غیر اہم ہوگئے ہیں۔اس کے علاوہ عالم گیریت (Globalisation) کے عمل نے دینا کو سکیڑ کر ایک عالمی دیہات (Globa Village) میں تبدیل کردیا ہے جس کی وجہ سے سرحد کی حد بندیاں ختم ہوگئی ہیں۔اسی طرح بین الاقوامی نظام میں کئی ایک غیر مملکتی اکائیوں خصوصاً NGO's کی وجہ سے مملکت کی طاقت کمزور ہوگئی اور بین الاقوامی فورموں اور پلیٹ فارم پر یہ ادارے انسانی فلاح و بہبود سے متعلق مسائل پر سرگرم رول ادا کررہے ہیں خصوصاً انسانی حقوق اور ماحولیات کے مسائل پر یہ ادارے اہم کردار ادا کررہے ہیں۔چنانچہ لرچ اور سعید (Lerche and Said) نے ان اداروں کو ہمہ فریقی اداکار (Multilater Actors) کا نام دیتے ہوئے ان کی اس طرح درجہ بندی کی ہے۔بلاک ایکٹرس جیسے (مغربی و مشرقی بلاک) عالم گیر ایکٹر جیسے (اقوام متحدہ اور اس کی ایجنسیاں)، محدود یا علاقائی ایکٹرس (دولت مشترکہ سارک، عرب لیگ وغیرہ)۔ اس کے علاوہ بعض ایسی شخصیتیں ہیں جو قومی حدود سے اوپر عالم گیر شخصیت کی حامل ہیں، جیسے مہاتما گاندھی، مارٹن لوتھر کنگ جونیر، مدر ٹریسا، عبدالستار ایدھی، یاسر عرفات، نیلسن منڈیلا وغیرہ۔



باب 3

بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے کے طریقے
Approaches to the study of International Relations

بین الاقوامی تعلقات علم سیاسیات کا وہ حصہ ہے جو ابھی ترقی پذیر ہے ۔ اس میں مطالعہ کے لیے ابھی نظریات وضع نہیں کیے گئے ہیں ۔ اگر چیکہ بین الاقوامی تعلقات کے متعلق مارکسی اسکالرس نے چند نظریات پیش کیے ہیں ۔ لیکن یہ بھی مکمل کوشش نہیں کہلائی جاسکتی ۔ چنانچہ اب تک بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کا زیادہ تر انحصار تاریخ پر ہی ہے ، چوں کہ تاریخ مطالعہ کے لیے خام مواد فراہم کرتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ بین الاقوامی تعلقات کے لیے کوئی معنی پیدا نہیں کرتی جب تک کہ اسے ایک خاص تناظر میں دیکھا نہیں جاتا ۔ ماء بعد دوسری جنگ عظیم کے ماحول میں بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ نظریاتی طور پر منقسمہ دنیا میں کیا جانے لگا تھا ۔ دنیا کو جنوبی ایشیاء ، جنوب مشرقی ایشیاء ، مشرقی یوروپ ، مغربی یوروپ ، لاطینی امریکہ ، مشرق وسطی ، وسطی ایشیاء وغیرہ کے تصوراتی منطقوں میں تقسیم کیا گیا اور یہ تقسیم سیاسی و حکمت عملی (Strategic) اصطلاحوں میں خارجہ پالیسی کی تشکیل میں بہت ہی اہم رول ادا کی ہے ۔ اب سویت یونین کے زوال کے بعد عالم گیریت (Globalisation) کے اس دور میں بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت اور ساخت ہی بدل گئی ہے ، چوں کہ گذشتہ نصف صدی کا عالمی توازن ہی بدل چکا ہے ۔ ہم ذیل میں بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کے مختلف طریقوں پر غور کریں گے

عینیتی طریقہ مطالعہ Idealist Approach

دو عالمی جنگوں کے درمیانی عہد میں ، بین الاقوامی تعلقات میں '' عینیتی مکتب فکر '' (Idealist School) کا آغاز ہوا ۔ ایسے کئی مفکرین و ماہرین ہیں جنہوں نے بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ میں عینیتی انداز فکر اپنایا تھا ۔ یہ مختلف آفاقی نظریات جیسے عالمی وفاق (World Federation) ، انسانیت (Humanism) قانونیت' اخلاقیات اور امن پسندی وغیرہ پر یقین رکھتے ہیں ۔ اس مکتب فکر کے حامیوں میں Henri-De-Saint-Simon ، مہاتما گاندھی

، برٹنڈرسل (Bertrand Russell) اور سابق امریکی صدر Wood Row Wilson وغیرہ ہیں ۔عینیتی مکتب کے حامی دراصل اصولوں و نظریات میں یقین رکھتے ہیں ۔ اس طرح یہ ''اصول پرست'' ہیں ۔ یہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ لوگوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے وہ لوگوں کے حقیقی رویے پر دھیان نہیں دیتے اور اسکا مطالعہ نہیں کرتے ۔ وہ بین الاقوامی معاملات میں طاقت کے استعمال ، توازن طاقت اور خفیہ معاہدات کے خلاف ہیں ۔ وہ بین الاقوامی قانونی حقوق اور ذمہ داریوں کی ضرورت و تکمیل پر زور دیتے ہیں ۔ وہ قوموں کے درمیان تعلقات کے تعین میں ''طاقت'' کے عنصر کو قبول نہیں کرتے ۔ ان کے نزدیک سیاست اچھی حکومت کا فن ہے نہ کہ ممکنات کا ۔ چنانچہ وہ بین الاقوامی تعلقات میں انصاف کے اصولوں ، بین الاقوامی قانون سے وفاداری کو رائج دیکھنا چاہتے ہیں ۔ لیکن اس مکتب فکر کے خیالات صرف ''خیالی'' ہیں ۔ بین الاقوامی سیاست کے عملی تقاضے ان تصورات اور اصولوں سے بہت دور ہیں ۔ اصول پرست عالمی حقیقتوں سے منہ موڑ کر تصوراتی اصولوں پر عالمی نظام کو قائم کرنا چاہتے ہیں ، جسے Realist نظریے کے حامی نہ صرف مسترد کرتے ہیں بلکہ اصول پرستی کو محض زبانی اصولوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں ۔

حقیقت پسند مکتب فکر Realist Approach

اس نظریہ کے حامی عینیتی نظریے کے سخت مخالف ہیں ۔ اس نظریے کے حامیوں میں E.H.Carr ، H.J.Morgenthau ، Arnold Wolfers ، George Kennan وغیرہ ہیں ۔ اس نظریے کے حامی سیاست کو طاقت (Power) کے لیے ایک جدوجہد قرار دیتے ہیں ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ طاقت کی کوئی متعینہ تعریف نہیں ہے ۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ طاقت ایک ایسا نفسیاتی رشتہ ہے جس میں ایک عامل دوسرے کے رویے کو کنٹرول کرنے کے قابل ہوتا ہے ۔ حقیقت پسند مکتب فکر کا دوسرا تصور ''مفاد'' (Interest) ہے ۔ بین الاقوامی تعلقات میں مفاد کو قومی مفاد کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے ۔ حقیقت پسند مکتب فکر کے حامیوں کا خیال ہے کہ ہر مملکت کی پالیسی کا مقصد اپنے فوجی مفادات وہ مقاصد کو حاصل کرنا ہی ہوتا ہے ۔ چنانچہ اپنے مفاد کے لیے کام کرنا لازماً ایک سیاسی عمل ہے ۔ اس کے علاوہ حقیقت پسندوں کے نزدیک اپنے مقصد کے حصول کے لیے طاقت یا قوت کا استعمال عین قانون فطرت کے مطابق ہے ، چوں کہ قوانین فطرت میں ہر کوئی اپنے تحفظ کے اقدامات کرتا ہے اور اس کے لیے اسے لازمی طور پر طاقت (Power) کو

رکھنا اور استعمال کرنا پڑتا ہے۔

پروفیسر ہینس ۔ جے ۔ مارگنتھو کا کہنا ہے کہ سیاسی تعلقات انسانی فطرت کے بنیادی اصولوں و مقاصد کے مطابق ہی متعین ہوتے ہیں ۔ یہ اصول خود سے خود تبدیل نہیں ہوتے ۔ سماج انہی اصولوں کے مطابق ترقی پاتا ہے جن کے مطابق عوامی پالیسی (Public Policy) بنائی جاتی ہے ۔ سیاست داں '' طاقت کے معنوں اور مفادات کی اصطلاحوں میں سوچتے اور عمل کرتے ہیں''۔ بین الاقوامی سیاست وہ عمل ہے جس میں قومی مفادات سے ہم آہنگی یا تعلق پیدا کیا جاتا ہے ۔ ایسی دنیا میں جہاں مقتدر قومی مملکتیں طاقت کی جدوجہد کرتی ہوں ، وہاں تمام قوموں کی خارجہ پالیسیوں کا مقصد اپنی بقاء اور ضروریات کی تکمیل ہوتا ہے اور تمام مملکتیں اپنی طبعی ، سیاسی اور تہذیبی شناخت کے تحفظ کے لیے مصروف ہوتی ہیں ۔ چنانچہ قومی بقاء ہی قومی مفاد ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول میں مملکتیں فرد کے برعکس دوسرے اخلاقی معیار کو اپناتی ہیں۔ سیاست دانوں کی پالیسیوں اور اقدامات کو سیاسی نتائج کی کسوٹی و معیار پر ہی پرکھا جاسکتا ہے۔ سیاسی اقدامات کو اخلاقی اصولوں سے مبرّا ہوکر سیاسی کسوٹی پر ہی جانچا و پرکھا جاسکتا ہے ۔ اس طرح بین الاقوامی سیاست مملکتوں کے درمیان طاقت کے حصول کی کوشش و جدوجہد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک سیاسی پالیسی کا مقصد یا تو طاقت کو اپنے قبضے میں رکھنا ، اپنی موجودہ طاقت میں اضافہ کرنا یا پھر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے ۔

بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ میں حقیقت پسندانہ نکتہ نظر (Realist Approach) کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ہوا ۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ''طاقت'' اور ''مفاد'' کو بین الاقوامی سیاست میں مرکزیت حاصل ہوئی تو اخلاق اور اصول پرستی سے بالاتر ہوکر مملکتوں کے اقدامات اور تعلقات کے عوامل میں طاقت اور مفاد کے عنصر کو پیش نظر رکھ کر نئے نظریات کو بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے میں شامل کیا جانے لگا۔ جس کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ عوامل اور وجوہات کا حقیقت پسندانہ مطالعہ بن گیا۔

نظامی نظریہ Systems Theory

نظریاتی اور عملی تجزیے کے لیے Systems ''نظام'' کے تصورات بہت اہم ہیں ۔ چنانچہ حال اور ماضی میں مملکتی نظام (State System) ذیلی نظام (Sub System) وغیرہ کے نظریات اس نظریہ میں شامل ہیں ۔ James Roseneau کے مطابق باضابطہ (Systematic)

تحقیق ہم نہ صرف مقامی، قومی اور بین الاقوامی نظاموں میں کر سکتے ہیں، بلکہ ہم علاقائی مسائل کو بھی اہمیت دے سکتے ہیں ۔ بین الاقوامی نظام کے عام تصورات، بین الاقوامی تعلقات پر لکھنے والوں کے مطالعہ کا اہم جز ہیں ۔ چنانچہ کارل ڈیوش (Karl Deutsch) کی تمام تصانیف System نظریہ اور System Analysis پر ہی ہیں۔ Stanley Hoffman کے مطابق بین الاقوامی نظام عالمی سیاست کی بنیادی اکائیوں کے درمیان تعلقات کا نام ہے۔ ایک نظام سے متعلق مختلف اکائیاں اور ان کا باہمی تعلق System کہلاتا ہے ۔ بین الاقوامی تعلقات مختلف طاقتوں کے درمیان عمل اور ردعمل ہے ۔ Mortan Kaplan نے اس کے کئی تغیرات (Variables) کی نشاندہی کی ہے جو اس طرح سے ہیں ۔

1. نظام کے لازمی اصول

اس سے حاکم اور محکوم کے درمیان سماجی و سیاسی رشتہ کا اظہار ہوتا ہے۔

2. تبدیلی کے اصول Transformation Rules

ماحول کے مطابق بدلتے رول سے ایک نظام ہم آہنگ ہوتا ہے ۔ جب کوئی نظام ان پر توجہ نہ دیتا ہو تو حالات خود بہ خود تبدیلی کے حالات پیدا کرتے ہیں ۔

3. Actor Classification Variables

بین الاقوامی اسٹیج پر مملکتیں اہم اداکار ہوتی ہیں ۔ ان کی قسموں کے لحاظ سے ان کی درجہ بندی کی جاتی ہے ۔ جیسے جمہوریت ، آمریت وغیرہ ۔ یہ طریقے حکومت کے بین الاقوامی رول پر اثرانداز ہوتے ہیں ۔

4. صلاحیت کے تغیرات Capability Variables

کسی مخصوص حالت میں کسی مملکت کا کیا ردعمل ہوتا ہے اس کا انحصار اسکی صلاحیت اور قابلیت پر ہوتا ہے ۔ علاقہ آبادی ، صنعتی ترقی وغیرہ کے عوامل کسی ملک کی صلاحیت پر اثرانداز ہونے والے عوامل ہیں ۔

5. اطلاعتی تغیرات Information Variables

ملکوں کی پالیسی سازی کا انحصار ان کو موصول ہونے والی اطلاعات پر ہوتا ہے ۔ اس سے مملکت کے حقیقی بیرونی موقف کا اظہار ہوتا ہے ۔

Kaplan نے چھ بین الاقوامی نظاموں میں تفریق کیا ہے ان کی صراحت و تفصیل اس طرح ہے ۔

1. توازن طاقت کا نظام Balance of Power System

یہ نظام اس وقت قایم ہوتا ہے جب کہ تمام آزاد مملکتیں مساوی طاقت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس میں سے ہر کوئی مختلف تکنیکوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنی طاقت میں اضافہ کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کوئی بھی دوسرے کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کو Oligo Polar Model (چند قطبی نمونہ) بھی کہتے ہیں۔

2. ڈھیلا دو قطبی نظام Loose Bi-Polar System

یہ اس صورت حال کو بتاتا ہے جہاں دو بڑی طاقتیں چھوٹی اور کمزور مملکتوں کے ایک گروپ کے ساتھ بین الاقوامی نظام میں کام کرتی ہیں۔

3. سخت دو قطبی نظام Tight Bi-Polar System

اس میں بھی دو بڑی طاقتیں ہوتی ہیں اور ان کے اطراف چھوٹے ممالک کا گروہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں دنیا کسی ایک گروہ میں تقسیم ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے اتحادات کی جو پالسی اپنائی تھی یہ اس کی ایک مثال ہے۔

4. عالم گیر بین الاقوامی نظام Universal International System

یہ وہ مرحلہ ہے جس میں بین الاقوامی کمیونٹی ایک ایسی یک جہتی کو حاصل کرلیتی ہے جس میں عدالتی معاشی سیاسی اور انتظامی فرائض کی انجام دہی کے لیے ایک عالمی مشنری ہوتی ہے۔ دوسرے معنوں میں یہ عالمی کانفیڈریشن کی نزدیکی صورت حال ہے۔

5. درجہ بند بین الاقوامی نظام Hierarchial International System

یہ قوموں کے درمیان اُس نزدیکی رشتہ و تعلق کی صورت حال ہے جس میں بین الاقوامیت ہی ختم ہوتی ہے۔ اس میں مملکتیں اپنے اقتدار اعلیٰ سے دست بردار ہوکر ایک بین الاقوامی کمیونٹی میں ضم ہوجاتی ہیں۔ یہ آزاد قومی مملکتیں نہیں رہتیں بلکہ ایک وسیع دنیا کی علاقائی اکائیوں کی صورت میں ہی باقی رہتی ہیں۔ مرکزی اتھاریٹی کا قانون غالب ہوتا ہے۔ دوسرے معنوں میں یہ ایک طرح سے عالمی وفاق کی صورت ہوتی ہے۔ یہ نظام مطلق العنان یا جمہوری بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اس میں مملکتوں کے درمیان تعلقات کو قایم رکھنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ یوروپین کمیونٹی اس کی مثال ہے۔

6. اکائی ویٹو نظام Unit Veto System

یہ نظام درجہ بند نظام کے برعکس ہوتا ہے۔ اس میں ہر مملکت ایک مقتدر مملکت ہوتی ہے اور مملکتیں اپنی سرگرمیوں کے لیے آزاد ہوتی ہیں۔ اس میں بین الاقوامی قانون کو کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور مملکتوں پر کوئی پابند طاقت کام نہیں کرتی۔ موجودہ مملکتی نظام اس کی نمائندگی کرتا ہے۔

نظریہ فیصلہ سازی Decision Making Approach

یہ طریقہ ایک طرح سے بین الاقوامی ادارہ جاتی پہلو پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ خصوصیت سے یہ امریکہ میں زیادہ مقبول و عام ہے۔ یہاں پر فیصلہ سازی کے حکومتی مراحل پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ یہ ایک کارآمد طریقہ ہے جس سے قومی مملکتوں یا بین الاقوامی سطح پر مملکتوں کی جانب سے اپنائی جانے والی پالیسیوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ فیصلے مختلف سطحوں پر مختلف بین الاقوامی نظاموں میں مختلف طرح سے لیے جاتے ہیں۔ قومی، بین الاقوامی یا تقابلی بنیادوں پر سیاسی عمل کے مطالعہ سے فیصلہ سازی اور پالیسی سازی کا تفصیلی تجزیہ کرسکتے ہیں۔

مارکسی نظریہ Marxian Theory

بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کا مارکسی نظریہ روایتی طور پر سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے عواقب و نتائج کی صورت میں دیکھتا ہے۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام کے لازمی نتیجے کے طور پر نوآبادیت کو فروغ حاصل ہوا۔ سرمایہ دار ممالک ایشیاء و آفریقہ کے غریب عوام و ممالک کو اپنا باجگذار بنائیں اور ان کا استحصال کیں۔ غریب پسماندہ ممالک جو تیسری دنیا کے نام سے جانے جاتے ہیں اپنی آزادی کے بعد بھی اپنے سابقہ نوآبادیاتی آقاؤں پر انحصار کرتے ہیں۔ نوآبادیت کی وجہ سے ممالک کے درمیان معاشی عدم مساوات پیدا ہوئی تھی جو نوآبادیت کے خاتمہ کے بعد بھی جاری رہی۔ طاقتور امیر ممالک کمزور ممالک کا سیاسی و معاشی استحصال کرتے ہوئے اپنی طاقت کو جاری رکھے ہیں۔ اس طرح Andre Gunder Frank اور Samir وغیرہ نے ایک نئے نظریے کو پیش کیا جسے Dependency Theory یا انحصاری نظریہ کہتے ہیں۔ یہ نظریہ ایشیاء، آفریقہ و لاطینی امریکی ممالک کی غربت اور عدم ترقی کی وجوہات کو پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے مطابق تیسری دنیا کی غربت کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممالک ترقی یافتہ ممالک کے لئے سستے داموں خام مال فراہم کرنے کے ذرائع ہیں۔ اس طرح امیر و غریب ممالک کے درمیان غیر مساوی رشتہ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کو مرکزی (Central) نوعیت حاصل ہے جب کہ

تیسری دنیا کی نوعیت حاشیائی (Periphery) ہے۔

بین الاقوامی تنظیموں کے ذریعہ مطالعہ کا طریقہ

بیسویں صدی کی ابتداء میں بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کا یہ نظریہ عام ہوا۔ مجلس اقوام کے قیام سے اس طریقے کا آغاز ہوا اور سیاستدان جنگ کو مہذب دنیا کے لئے ناپسند کرنے لگے۔ ان کے خیال میں بین الاقوامی تنازعات کو بین الاقوامی تنظیموں کی مدد سے حل کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح بین الاقوامی تنظیموں کے ذریعہ سے بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کا طریقہ عام ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تنظیم اقوام متحدہ (UNO) کے قیام نے بین الاقوامی برادری اور شہریت کا جذبہ پیدا کیا اور عالمی سیاست کی سرگرمیاں اقوام متحدہ کے ادارہ سے وابستہ ہوگئیں۔ جنگ و امن اور انسانی مسائل کے حل میں اس ادارہ کا رول بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ دیگر ذیلی تنظیمیں اور ادارے بھی قائم ہوگئے جو مشترکہ پلیٹ فارم یا فورم کے طور پر قوموں کے درمیان تعلقات میں ایک اہم عنصر کے طور پر کام کرنے لگے۔

نظریۂ کھیل Game Theory

بین الاقوامی تعلقات کو اکثر و بیشتر ایک دلچسپ کھیل سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں چند نامعلوم اصولوں پر عمل کیا جاتا ہے۔ جن میں اکثر تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اور بعض مرتبہ ان اصولوں کے کھلی خلاف ورزی بھی ہوسکتی ہے۔ نظریہ کھیل (Game Theory) عالمی سیاسی مطالعہ کے لیے نمونہ فراہم کرتا ہے۔ ایک تصور Zero-Sum-Game کا ہے، جس میں ایک کی شکست اور دوسرے کی جیت ہوتی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں موجودہ نمونہ Non-Zero-Sum کا ہے۔ اس نظریہ کو پہلے پہل Osker اور Numan و مارگنتھو (H.J.Morgenthau) نے پیش کیا تھا جسے بعد میں جزوی تبدیلیوں کے ساتھ کئی سماجی علوم پر اس کا اطلاق کیا گیا۔ اس نظریہ کو بین الاقوامی تعلقات میں نظریاتی اور اطلاقی تجزیے کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن Mortan Kaplan کے مطابق بین الاقوامی سیاست کے مسائل پر اس کا اطلاق محدود ہے۔ اس لیے Karl W.Deugit نے کہا ہے کہ Game Theory عموماً اس مفروضے پر قایم ہے کہ اکثر کھیل ختم ہوتے ہیں لیکن بین الاقوامی سیاست کا کھیل کبھی ختم ہونے والا نہیں جس میں کوئی طاقت اپنا پتھر اٹھا کر گھر نہیں جاتی۔

اطلاعاتی نظریہ Communication Theory

موجودہ دور میں مواصلاتی نظام میں انقلابی تبدیلی سے انسانی روابط اور سماجی تعلقات میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ آج مواصلاتی نظام سماجی تبدیلی کا ایک ذریعہ ہے اور دنیا کا ہر حصہ اس سے متاثر ہوا ہے۔ بیسویں صدی میں مواصلاتی تبدیلی سے انسان کی ترقی کی تاریخ بدل گئی ہے۔ موجودہ صدی چوں کہ انفارمیشن ٹکنالوجی کی صدی ہے اس لیے اس کا اثر انسانی اور عالمی امور پر بہت حد تک بڑھ گیا ہے۔ ایک محدود عرصے میں سماج اتنا بدل گیا ہے کہ صدیوں کے رسم و رواج ختم ہوگئے ہیں۔ لیکن ان دوررس تبدیلیوں کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم محض انفارمیشن ٹکنالوجی و کمپیوٹر کی تبدیل شدہ دہلیز پر کھڑے ہیں اور یہ دنیا جہاں ہماری ترقی کے مزید مواقع ہیں وہیں پر مسائل بھی بڑھادیے ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات میں، انسانی کاوشوں کے مختلف پہلوؤں پر مواصلات کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ چنانچہ لوگوں کے درمیان اس کی وجہہ سے ایک دوسرے کے نظریات اور تصورات کا ایک دوسرے پر اثر پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ قومیں بھی اس اثر کو قبول کرتی ہیں۔ مواصلات کی اہمیت واضح ہے۔ یہ تعلیم میں ترقی، قومی مقاصد اور بین الاقوامی تعاون، سماجی، معاشی اور سیاسی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہ سیاسی کنٹرول اور سیاسی مقاصد بنانے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ سیاسی بھرتی، تحریک اور تہذیبی ترقی کی مختلف ایجنسیوں جیسے سیاسی جماعتوں وغیرہ کا تجزیہ اس نظریہ کی اصطلاحوں میں کیا جاسکتا ہے۔ قوم کے اندر مواصلات کا بہاؤ قوم کے اندر اور قومی سرحدات سے باہر مواصلات کا بہاؤ داخلی حرکت اور بین الاقوامی تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔ بین تہذیبی تعلقات اور فیصلہ سازی کے مرحلے میں مواصلات اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس نظریہ کے حامی تنظیموں اور سیاست دانوں کے رویہ جاتی پہلو کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے بلکہ یہ علاقائی سرحدات کے پار اشیاء اشخاص اور پیغامات کے بہاؤ اور ترسیل کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ڈاک کے بہاؤ کے نقشوں کی ترتیب، فضائی ٹرافک، تجارت، سفارت کاروں کے درمیان تبادلے اور اس طرح سے بین الاقوامی تعلقات کی دوسری مثالوں سے قوموں کے درمیان تعلقات کے مواصلاتی نظاموں کا پتہ چلتا ہے۔ مواصلات کو نظری اور اطلاقی طور پر بھی دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

باب 4

تصور طاقت اور اس کے لازمی اجزاء
Concept of Power and its Components

جدید مملکتی نظام (Modern State System) میں ہر مملکت کو مساوی درجہ رتبہ اور حیثیت حاصل ہے ۔ ہر مملکت اقتدار اعلیٰ کی حامل اور خارجی اثرات سے آزاد ہوتی ہے ۔ بین الاقوامی قانون کے تحت تمام ممالک یکساں حیثیت فرائض وحقوق کے حامل ہوتے ہیں ۔ بین الاقوامی امور و کانفرنسوں میں انھیں یکساں نمائندگی اور ووٹ کا حق ہوتا ہے ۔لیکن مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ تمام ممالک عملی طور پر یکساں نہیں ہوتے ‘اگرچہ کہ تمام ممالک کو اپنے شہریوں پر اختیار ہوتا ہے ۔لیکن اپنے بیرونی اثر میں یہ مختلف ہوتے ہیں ۔بعض ممالک اپنے اثر و رسوخ میں دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں ۔ اسی لیے بین الاقوامی پلیٹ فارم پر امریکہ اور سری لنکا اپنی حیثیت واثرات میں یکساں نہیں ہو سکتے ۔ اس طرح چند ممالک کی سیاسی اور معاشی قوت دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے مفادات کا تحفظ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ زائد علاقوں یا زائد سمندری سہولتوں کو حاصل کرنے کی خواہش یا بیرونی خام مال کے حصول کی خواہش وہ مقاصد ہوتے ہیں جس کی وجہ سے طاقتور مملکتوں کو بین الاقوامی معاملات میں زیادہ اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے اور وہ قوت کی دھمکی کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ چنانچہ قوموں کو حاصل طاقت کا عنصر (Power Factor) بین الاقوامی معاملات وقوموں کے حرکات پر اثرانداز ہوتا ہے ۔

معنیٰ و تعریف

طاقت (Power) ، اثر (Influence) ، اختیار (Authority) ، اور صلاحیت (Capability) کی اصطلاحوں کو عموماً ایک دوسرے کے ہم معنیٰ سمجھا جاتا ہے جب کہ یہ اصطلاحات اور طاقت کی اصطلاح ایک سے زائد معنوں میں مستعمل ہیں ۔ بعض مرتبہ اسے اقتدار (Sovereignty) کے ہم معنیٰ بھی سمجھا جاتا ہے ۔ عام طور پر سیاسی طاقت سے مراد عوامی اختیار رکھنے والوں اور وسیع طور پر عوام کے درمیان کنٹرول کا باہمی رشتہ ہے ۔’’سیاسی طاقت اسے چلانے والوں اور تابع افراد جن پر کہ اس اختیار کو چلایا جاتا ہے کے درمیان کنٹرول کا باہمی رشتہ

ہے۔ اس سے پہلے کو دوسرے کے اقدامات پر کنٹرول حاصل ہوتا ہے اور یہ اثر ذہنوں پر ہوتا ہے''۔ بین الاقوامی سیاست کا اثر کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کا فوری مقصد طاقت ہی ہوتا ہے اور بین الاقوامی سیاست کے کردار (Actors) اپنے متعدد مقاصد کو طاقت کے ذریعہ ہی حاصل کرتے ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں بین الاقوامی تعلقات میں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع کی عدم موجودگی میں قومیں طاقت وقوت کا سہارا لیتی ہیں ۔ آسان الفاظ میں سیاسی طاقت معاشی ، سیاسی اور نفسیاتی ذرائع سے مقاصد کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے ۔ مملکت کے اندر یہ طاقت منظم سیاسی جماعتوں ، رائے دہندوں، عہدیداروں ، بااثر حلقوں (Pressure Group) ، فوج اور رائے عامہ وغیرہ کو حاصل ہوتی ہے ۔ بین الاقوامی تعلقات میں یہ طاقت افراد ، اداروں یا جماعتوں کو نہیں بلکہ مملکت کو حاصل ہوتی ہے ۔ مملکت کی طاقت قومی پالیسی یا پھر اپنے نقطہ نظر کو حاصل کر لینے کی صلاحیت ہے ۔

طاقت کا بین الاقوامی تصور بہت ہی پیچیدہ ہے اور اس کی کوئی ایک تعریف کرنا مشکل امر ہے ۔ چنانچہ H.J.Morgenthau کے مطابق '' سیاسی طاقت اسے چلانے والوں اور اس کے ماتحتوں یا جن پر کہ طاقت چلائی جاتی ہے کے درمیان ایک نفسیاتی رشتہ ہے ۔ اس سے پہلے کو دوسرے کے اقدامات پر کنٹرول حاصل ہوتا ہے ۔ اور یہ اثر ذہنوں پر ہوتا ہے ۔ جب کہ شوارزن برگر (Schwarzen Berger) کے مطابق '' طاقت سے مراد اپنی مرضی کا دوسروں پر اطلاق ہے'' اس طرح یہ دوسروں کے رویے کو قابو میں کرنے کی صلاحیت کا دوسرا نام ہے ۔ یہ ایک نفسیاتی عمل ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں طاقت کو صرف ایک ذریعہ کے طور پر ہی نہیں بلکہ ایک مقصد کے طور پر بھی اہمیت حاصل ہے ۔ شوارزن برگر نے طاقت کو اثر اندازی (Influence) اور قوت (Force) سے ممتاز کیا ہے ۔ اثراندازی میں دھمکی کا عنصر نہیں ہوتا ، جب کہ اس میں جبر کی جگہ بہلا پھسلا کر مقصد حاصل کرنے پر توجہ دی جاتی ہے ۔ دوسری طرف قوت میں دھمکی کا عنصر ہوتا ہے اور کوئی بھی اپنی قوت کے استعمال کے ذریعہ جنگ کی کیفیت پیدا کرسکتا ہے۔ رابرٹ ڈھل (Robert Dahl) کے الفاظ میں طاقت '' ممکنہ نتیجہ کو تبدیل کرنے کی صلاحیت'' ہے ۔ اس طرح Duchacek کے مطابق طاقت '' اپنی من چاہی مرضی و نتائج کو حاصل کرنے کی صلاحیت کا نام ہے''۔

لرچ اور سعید (Lerche and Said) نے اصطلاح طاقت (Power) کے بجائے

صلاحیت (Capability) کی اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ چونکہ ان کے مطابق اصطلاح طاقت میں جبر کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے مطابق صلاحیت سے مراد "کچھ کرنے کی قابلیت اور ایک حقیقی صورت حال میں با مقصد عمل ہے" لیکن زیادہ تر اسکالرس نے طاقت (Power) کی اصطلاح کے استعمال کو ہی زیادہ موزوں و مناسب سمجھا ہے۔ اسی لیے بین الاقوامی سیاست اور تعلقات میں طاقت کی اصطلاح کا چلن عام ہے۔

طاقت کی قسمیں Kinds of Power

1. طبعی طاقت Physical Power

طبعی طاقت سے مراد کسی ملک کی فوجی طاقت ہے۔ تاریخ بھی یہ بتاتی ہے کہ بعض ممالک فوجی طوپر دوسرے ممالک کے مقابلے میں زیادہ طاقتور تھے اسی لیے وہ دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ سولہویں صدی میں اسپین اپنے طاقتور بحری بیڑہ کی وجہ سے یوروپ کا طاقتور ترین ملک تھا۔ فریڈریک کے دور میں جرمن فوجی طاقت کی وجہ سے یوروپ میں اپنی طاقت کا سکہ جمایا تھا۔ موجودہ دور میں دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور سویت یونین اپنی برتر فوجی طاقت کی وجہ سے عظیم طاقتیں (Super Powers) کہلائے۔ لیکن ملک کی فوجی طاقت کو سیاسی اختیار کے تابع ہونا چاہیے ورنہ فوجی بغاوتیں ہونگی اور سیول حکومت کی جگہ فوجی حکومت لے گی۔ اس لیے مملکت کی طبعی طاقت کو کئی حصوں جیسے بری، بحری اور فضائی افواج میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ آج نیوکلیر طاقت کے حامل ممالک بین الاقوامی سیاست میں اہم حصہ ادا کرتی ہیں۔ انہیں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں حق تنسیخ یا ویٹو پاور (Veto Power) حاصل ہے۔ آج زیادہ سے زیادہ ممالک اپنی سلامتی کے لیے نیوکلیر صلاحیت اور اسلحہ حاصل کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ کسی ملک کی طبعی طاقت کا انحصار کئی باتوں پر ہوتا ہے اور اس کا تعلق اس ملک کو لاحق سلامتی کے خطرات کے علاوہ عالمی حکمرانی کی اس کی خواہش سے ہے۔

2. نفسیاتی طاقت Psychological Power

نفسیاتی طاقت سے مراد کسی قوم کا ذہنی رویہ، اخلاقی حوصلہ اور اس کی فکر و سوچ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا تعلق عوامی جذبات و احساسات سے ہے۔ اس کا اظہار عمومیت سے قومی پروپگنڈہ سے ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے ایک قوم دوسرے پر ذہنی طور پر اثرانداز ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے لیے اچھی حوصلہ مند قیادت اور عوامی امنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔

قومی حوصلے کو بلند کرنے اور دشمن پر اپنی طاقت کا نفسیاتی خوف ڈالنے کے لیے قومیں مختلف قومی مواقع پر اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ کرتی ہیں ۔ ہندوستان میں یوم جمہوریہ کی پریڈ کے موقع پر ملکی اسلحہ کو باوقار طور پر پیش کیا جاتا ہے تاکہ عوام اور دشمن ممالک ہندوستان کی فوجی تیاریوں سے باخبر رہیں اور دشمن ملک اسے کمزور نہ سمجھنے پائے ۔اس کے علاوہ ہرمملکت حریف مملکت کی آبادی میں نفسیاتی طاقت کو پھیلانے کے لیے خصوصی نشریاتی سرویس رکھتی ہے ۔حریف مملکت کی آبادی کی زبان میں پروپگنڈہ کرنے کے لیے اس سرویس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی پشتو ، نیپالی ، اردو اور چینی زبانوں میں سرویس اس کی مثال ہے ۔اسی طرح ریڈیو چین اور ریڈیو پاکستان کی ہندی سرویس اس کی مثالیں ہیں ۔نفسیاتی طاقت کو حریف ملک کے عوام کے حوصلوں کو پست کرنے ، اُن میں اپنی حکومت کے خلاف بغاوت کو فروغ دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔آج کل ٹی۔وی اور انٹرنیٹ کا استعمال بھی اس غرض کے لیے کیا جارہا ہے ۔اس طرح حریف ممالک میں انٹرنیٹ جنگ چھڑی ہوئی ہے ۔ممالک ایک دوسرے کے ویب سائیٹ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں ۔

3. معاشی طاقت Economic Power

کسی ملک کی معاشی طاقت اُس کے لیے ایک عظیم سرمایہ افتخار ہوتی ہے ۔ چنانچہ معاشی طور پر طاقتور قومیں معاشی طور پر غریب اور کمزور ممالک کے رویے اور پالیسیوں پر اثرانداز ہوتی ہیں۔غریب ممالک کو معاشی اور دوسری امداد کے ذریعہ ان پر اثرانداز ہوتی ہیں ۔عرب دنیا میں سعودی عرب کا بلند مقام دوسری اور وجوہات کے علاوہ اس کی معاشی طاقت اور قوت بھی ہے ۔ عالمی تجارت میں امریکہ کا حصہ تقریباً 25% ہے اس وجہ سے وہ عالمی سطح پر اپنی حکمرانی کو قایم کرنے کے قابل ہے ۔ معاشی طور پر خود مکتفی ممالک آزادانہ پالیسیوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور وہ اپنی معاشی قوت کو قومی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ جرمنی اور جاپان اپنی معاشی طاقت کی وجہ سے گذشتہ پچاس برسوں کے دوران اپنی ساکھ بنائے رکھے ہیں ۔کسی ملک کی معاشی طاقت میں اس کے قدرتی وسائل ،ٹکنالوجیکل اور زرعی وصنعتی ترقی بھی شامل ہے

طاقت کی بنیادیں Foundations of Power

عموماً دولت ، قدرتی وسائل عددی قوت اور فوج کو طاقت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے ۔لیکن یہی اس کی بنیادیں نہیں ہیں بلکہ قومی طاقت کی چند اہم بنیادیں بھی ہیں ۔

1. جغرافیہ Geography

قدیم زمانے سے ہی جغرافیہ کو قومی طاقت کی بنیاد سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ سیاسی جغرافیہ (Geo-Politics) کے ماہرین خصوصاً Mackinder اور Spykman نے خصوصیت سے جغرافیہ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ جغرافیہ سے مراد ملک کا رقبہ، محل وقوع، آب و ہوا، آبادی وغیرہ ہے۔ وسیع رقبہ سے قومی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے اور چھوٹا رقبہ مملکتوں کی طاقت کو توڑ دیتا ہے۔ چنانچہ جب تک نوآبادیات تھیں برطانیہ ایک طاقتور ملک تھا۔ وسیع رقبہ کی حامل مملکتوں کی آبادی بھی عموماً زیادہ ہوتی ہے اور ان کے قدرتی وسائل بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ سابقہ سویت یونین رقبہ کے اعتبار سے دنیا کی پہلی بڑی اور طاقتور مملکت تھا۔ امریکہ چین اور ہندوستان بہ اعتبار رقبہ وسیع مملکتیں ہیں اور اس وجہ سے بین الاقوامی تعلقات میں اپنا ایک اثر رکھتے ہیں۔ سویت یونین 1991ء کے اختتام پر بکھراؤ کے بعد ایک عالمی طاقت باقی نہیں رہا بلکہ چھوٹی چھوٹی جغرافیائی مملکتیں وجود میں آئی ہیں جو بین الاقوامی سیاست میں ایک طاقتور رول کی حامل نہیں ہوسکتیں۔ اس طرح کینڈا اپنی منجمد زمین، برازیل اپنے جنگل اور آسٹریلیا اپنے ریگستان کی وجہ سے طاقتور ملک نہیں ہیں۔ وسیع علاقے کا دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اسے فتح کرنا دوسروں کے لیے مشکل ہوجاتا ہے۔ عراق کویت کو محض اس وجہ سے بآسانی ہڑپ کرسکا تھا چوں کہ کویت رقبہ کے اعتبار سے عراق کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹا ملک تھا' اور ایران و عراق اپنی آٹھ سالہ طویل جنگ کے باوجود وسیع رقبہ کی وجہ سے ہی ایک دوسرے کو واضح شکست نہ دے سکے تھے۔

وسیع رقبہ اگر ہو تو فاتح خود مفتوح بن سکتا ہے۔ مثال کے طور پر نپولین اور ہٹلر دونوں ہی اپنے اپنے وقتوں میں روس کو فتح کرنے کی کوششوں میں ناکام ہوئے۔ اسی طرح چین 1937ء میں جاپانی حملوں کے باوجود اپنے وسیع رقبہ کی وجہ سے منتشر نہیں ہوا۔ کسی ملک کا جغرافیہ اور محل وقوع اس کی سلامتی اور تحفظ کے لیے ایک وجہ یا عامل (Factor) بنتا ہے۔ دوسری طرف برطانیہ اور جاپان چھوٹے جزیرے ہونے کے باوجود اپنے محل وقوع کی وجہ سے باقی رہے اور ترقی یافتہ بن گئے۔ برطانیہ اپنے محل وقوع کی وجہ سے دو عالمی جنگوں کے دوران زیادہ متاثر اور فتح نہیں ہوا بلکہ تاریخی طور پر وہ ایک سمندری قوت بنا۔ اسپین اور پرتگال اپنے سمندری جغرافیہ کی وجہ سے عالمی فتوحات حاصل کرسکے۔ مشرق وسطیٰ اور براعظم یوروپ اپنے محل وقوع کی وجہ سے متنازعہ خطے رہے ہیں۔ سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے جغرافیہ کی

اہمیت ختم ہوگئی ہے۔ خصوصاً نیوکلیر ہتھیاروں اور ICBM نظام کی وجہ سے زمینی فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ زمین سے محصور مملکتیں (Land Locked States) بہتر جغرافیہ کی حامل نہیں ہوتیں۔ چنانچہ وہ آزادانہ پالیسیوں کو اپنانے کے موقف میں نہیں ہوتیں' جیسے افغانستان ، نیپال اور بھوٹان وغیرہ۔ سمندری سرحدات کے حامل ممالک کے لیے معاشی ترقی کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ اور وہ آزادانہ پالیسیاں اپنا سکتے ہیں۔

2.قدرتی وسائل Natural Resources

کسی ملک میں ملنے والے قدرتی وسائل اور خام مال کا قومی طاقت میں اہم حصہ ہے قومی وسائل قدرت کا عطیہ ہیں ، جس میں دھاتیں ، جنگل زمین کی زرخیزی ، آبشار ، متصل سمندر وغیرہ سب شامل ہیں جب کہ خام مال انسانی محنت کا نتیجہ ہے اور اس میں غذا ، ربر کپاس وغیرہ شامل ہیں ۔ لیکن قدرتی وسائل خود سے اپنے میں کوئی افادہ نہیں رکھتے بلکہ انہیں سرمایہ جانکاری اور مہارت کے ذریعہ ڈھونڈ نکالنا پڑتا ہے ۔ زمین میں پوشیدہ دولت اس وقت تک کام کے قابل نہیں ہوتی جب تک اسے زمین کے باہر نہ لائیں ۔ چنانچہ برازیل میں لوہے کے وسیع ذخائر ہیں لیکن جب امریکہ کی تکنیکی مدد سے انہیں نکالا گیا تو برازیل کی قومی طاقت میں اضافہ ہوا ۔ اس کے علاوہ صرف کوئی ایک یا دو قدرتی وسائل سے قومی طاقت میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ضروری ہے کہ قدرتی وسائل بڑی تعداد میں اور ہمہ اقسام کے ہوں ۔ موجودہ زمانے میں خام مال جیسے تیل (Petrol) یورانیم اور ایٹمی توانائی کی بڑی اہمیت ہے اور بلاشبہ اس سے قومی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے ۔ دوسرے اہم قدرتی وسائل میں غذائی اشیاء بھی شامل ہیں اور وہ ممالک جو غذائی اشیاء میں خود مکتفی ہوتے ہیں زیادہ طاقت رکھتے ہیں ۔ امریکہ غذائی اجناس میں بڑی حد تک خود مکتفی ہے۔ اگر کسی ملک کو غذائی ضروریات کے لیے بیرونی مارکٹ پر انحصار کرنا ہوتو وہ بین الاقوامی امور میں ایک آزادنہ پالیسی نہیں اپنا سکتا ۔ اس طرح اس کی قوت خود بخود گھٹ جاتی ہے ۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کو دوسرے ممالک سے غذائی اشیاء حاصل کرنے سے روکا گیا تو بالاخر اس کو ہتھیار ڈالنے پڑے ۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کے ایک عظیم طاقت کے طور پر ابھرنے کی ایک اہم وجہ اس کی صنعتی ترقی تھی اور یہ صنعتی ترقی صرف کوئلہ اور لوہے کے ذخائر کی وجہ سے ہوئی ۔ آج کے زمانے میں پٹرول اور قدرتی گیس کو قومی طاقت کا ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے ۔ تیل کے ذخائر رکھنے والے چھوٹے چھوٹے عرب ممالک محض اپنے ختم نہ

ہونے والے یا طویل مدت تک چلنے والے تیل کے ذخائر کی وجہ سے بین الاقوامی سیاست میں اہمیت حاصل کر گئے ہیں۔

3. ٹکنالوجی Technology

ٹکنالوجی سے مراد پیداوار کے سائنسی طریقہ کا استعمال ہے۔ آج کل ٹکنالوجی کو قومی طاقت میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے یوروپی ممالک و جاپان محض اپنی برتر ٹکنالوجی کی وجہ سے بین الاقوامی سیاست میں اہم مقام کے حامل بن گئے ہیں۔ صنعتی برتری مواصلاتی نظام اور فوجی ٹکنالوجی سے مملکت کی قومی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ صنعتی ٹکنالوجی سے قومی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور فاضل دولت پیدا ہوتی ہے۔ مواصلاتی ٹکنالوجی سے ذرائع حمل ونقل کی ترقی میں تبدیلی آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے رہن سہن نظریات اور طور طریقوں میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ مواصلاتی ٹکنالوجی خصوصاً کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے سفارتکاری اور بین الاقوامی تعلقات پر گہرے اثر چھوڑے ہیں۔ تیز رفتار مواصلات کی وجہ سے ڈپلومیٹس (سفارتکاروں) کو اپنے ملک کے دفتر خارجہ سے ہمیشہ احکامات ملتے رہتے ہیں اور وہ انہی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ٹکنالوجی کی ترقی مملکت کی ترقی کی ضامن ہے یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ برطانیہ صنعتی ترقی کی وجہ سے ہی دنیا میں وسیع نوآبادیات پر حکومت کے قابل تھا۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور سویت یونین کو اپنی فوجی اور صنعتی ٹکنالوجی کی وجہ سے ہی اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ اسی طرح جاپان بھی اپنی صنعتی ترقی کی وجہ سے ایک طاقتور قوم بنا۔ کسی ملک میں ٹکنالوجی کی ترقی اس ملک کی ترقی کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے۔ جنوبی کوریا آج اپنی ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے تیز رفتار ترقی یافتہ ملک بن گیا ہے۔ ٹکنالوجی کی ترقی سے روزگار کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے اور ملک کی خوشحالی بڑھتی ہے۔

4. آبادی Population

ملک کی آبادی طاقت کا دوسرا اہم ذریعہ ہے۔ عموماً بڑی آبادی کو طاقت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، لیکن بعض مرتبہ اس کو کمزوری کی وجہ بھی مانا جاتا ہے۔ اگر مملکت دستیاب انسانی وسائل کو موثر طور پر بھرپور استعمال کرے تو یہ لازمی طور پر مملکت کی طاقت کے لیے ایک اثاثہ ثابت ہوتی ہے۔ دوسری طرف اگر مملکت اپنی آبادی کی ضروریات زندگی فراہم نہ کرے تو یہی آبادی مملکت کی کمزوری کا باعث بنتی ہے۔ عام طور پر ترقی یافتہ ممالک میں بڑی آبادی کو طاقت کا

ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے ، جب کہ ترقی پذیر ممالک میں بڑی آبادی کو ایک کمزوری سمجھا جاتا ہے۔ اگر ملک میں مناسب وسائل موجود ہوں تو بڑی آبادی زراعتی و صنعتی پیداوار میں اضافہ کرسکتی ہے ۔ بڑی آبادی سے بڑی فوج بنتی ہے جو اپنے علاقوں پر بہتر نگرانی رکھ سکتی ہے ۔ اگر کسی ملک کی آبادی کی شرح کم ہو ، لیکن اس کی مسابقت کی شرح رفتار زیادہ ہو تو ایسی صورت میں ملک کے لیے یہ بات باعث پریشانی ہوگی ۔ لیکن آبادی کی عددی قوت ہی ملک کی طاقت میں اضافہ کا باعث نہیں ہوتی ، بلکہ آبادی کی قسم (Quality) زیادہ اہمیت رکھتی ہے ۔ اگر کسی ملک کی آبادی میں بچوں اور بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہو تو ایسا ملک ترقی کی راہ پر نہیں ہوسکتا ۔ اس کے برعکس اگر آبادی میں نو جوانوں کی آبادی زیادہ ہو تو اس سے ملک کی معاشی ترقی میں مدد ملتی ہے ۔ اس طرح اگر کسی ملک کی آبادی کا بڑا حصہ زراعت میں مصروف ہو تو اس سے ملک کی ترقی ممکن نہیں ۔ اس کے برعکس آبادی کا بڑا حصہ صنعت میں مصروف ہو تو اس سے قوم کی آمدنی و معیشت میں تیز رفتار اضافہ ہوگا اور یہ بات ملک کی طاقت کے لیے بہتر ثابت ہوگی ۔ آبادی کی دوسری خصوصیات جیسے ، اعلیٰ شرح خواندگی ، حب الوطنی ، اور محنت کشی و جفاکشی ملک کو طاقت بخش تے ہیں ، ناخواندہ ، کاہل اور سست مزاج عوام تعداد میں اضافہ ہونے کے باوجود بھی ملک کے لیے کوئی طاقت نہیں بنتے ۔

5. قومی کردار وحوصلہ National Character and Morale

صرف آبادی میں اضافہ سے قومی قوت میں اضافہ نہیں ہوتا ، بلکہ آبادی کی عمدگی اور کوالٹی قومی طاقت کے لیے زیادہ ضروری ہوتی ہے ۔ قومی کردار اور حوصلہ سے قوم کی ترقی ہوتی ہے۔ اس سے بین الاقوامی سیاست میں قوم کے وزن میں اضافہ ہوتا ہے ۔ یوروپ کی چھوٹی چھوٹی قومیں اپنے اعلیٰ قومی کردار کی وجہ سے ہی ایشیاء و آفریقہ کے بڑے بڑے رقبوں پر حکومت کرسکی ہیں ۔ عوام کا حوصلہ (Morale) دراصل وہ معیار ہے جس کے ذریعہ جنگ و امن کے زمانے میں حکومتوں کو حاصل عوامی تائید کا اظہار ہوتا ہے ۔ رائے عامہ کے ذریعہ اس کا اظہار ہوتا ہے اور جسے کوئی بھی جمہوری حکومت نظر انداز نہیں کرسکتی ۔ ایثار و قربانی کا جذبہ ہمت اور وفاداری عقیدہ و تصورات اس کے لازمی اجزاء ہیں ۔ ڈسپلن اور کردار سے قوم کے حوصلہ کا اندازہ ہوتا ہے ۔ جرمنی اور برطانیہ کے عوام نے دونوں عالمی جنگوں کے زمانے میں اپنے صبر و تحمل اور ایثار و قربانی کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں کہ اس کے بغیر اتنی لمبی مدت تک ان قوموں کے

لیے ان عالمی جنگوں کا لڑنا ممکن نہیں تھا۔ عراقی عوام بھی تمام تر مصائب کے باوجود ایک دہے سے زائد عرصے سے اپنی حکومت کی تائید جاری رکھے ہیں ۔ جرمنی و جاپان کے جفاکش اور پابند ڈسپلن عوام نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ملک کی تعمیر نو کے ذریعہ عالمی برادری میں ایک اعلیٰ موقف حاصل کیا۔

6. معاشی ترقی Economic Development

معاشی ترقی قومی طاقت کو متعین کرنے والے چند عوامل میں سے ایک اہم ترین عامل ہے ۔ صرف خام مال کی موجودگی سے کوئی قوم طاقتور نہیں ہوتی ۔ بلکہ اس کا تعلق ان قدرتی ذرائع اور وسائل کو استعمال کرنے کی صلاحیت سے ہے مثلاً امریکہ ، سابقہ سویت یونین اور ہندوستان میں کوئلے کے وسیع ذخائر ہیں ۔ لیکن امریکہ اور سویت یونین کے مقابلے میں ہندوستان ان ذخائر کو بہتر طور پر استعمال نہ کرسکا اور اس وجہ سے ہندوستان ان دونوں کے مقابلے میں معاشی ترقی میں پیچھے ہے۔ معاشی طور پر ترقی یافتہ ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک میں فاضل پیداوار ہو۔ معاشی ترقی کی شرح متوسط اور اعلیٰ ہو۔ عموماً آٹھ فیصد سالانہ شرح ترقی کی رفتار رکھنے والے ممالک کو معاشی طور پر ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے ۔ اقوام متحدہ کے عالمی بینک نے یومیہ فی کس ایک امریکی ڈالر آمدنی رکھنے والے ممالک کو غریب ترین قرار دیا ہے ۔ جب کہ امریکہ کے لیے یہی حد گیارہ ڈالر کی ہے ۔ آج اعلیٰ صنعتی طاقت کے حامل ممالک معاشی طور پر ترقی یافتہ ہیں اسی لیے وہ عالمی امور پر اثرانداز ہونے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں ۔ 1870ء کے بعد جرمنی کے مقابلے میں فرانس کے زوال کی اصل وجہ اس کی صنعتی پسماندگی تھی اور اسی طرح سرد جنگ کے دوران سویت یونین نے اپنی صنعتی صلاحیتوں میں اضافہ کرتے ہوئے نیوکلیر جنگ لڑنے کے قابل بنا تھا ۔ بعد میں یہی سویت یونین اپنی معاشی کمزوری و کم پیداواریت کی وجہ سے منتشر ہوگیا اور بالآخر اس کا وجود ہی ختم ہوگیا۔ اس کے برعکس جرمنی اپنی معاشی ترقی کی وجہ سے پھر ایک بار طاقتور ترین ملک بن گیا ہے اور اب عالمی معاشی تقسیم میں اس کا اہم حصہ ہے ۔ اسی لیے پروفیسر مورگینتھو نے معاشی ترقی اور صنعتی صلاحیت کو قومی طاقت کے لیے بہت زیادہ اہمیت دی ہے ۔

7. سیاسی تنظیم Political Organization

قومی طاقت میں سب سے زیادہ اہمیت سیاسی نظام اور حکومتی ساخت کی ہے ، جس کے

بغیر نہ تو قومی و قدرتی وسائل سے صحیح طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی قومی کردار کی تعمیر ہوسکتی ہے۔ حکومت قومی مقاصد کا تعین کرتے ہوئے اس کے حصول کے لیے منظّم طریقہ کار کو اپناتی ہے اور دستیاب ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ کامیابی کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ پالیسی اور وسائل کے درمیان توازن ضروری ہے۔ اس کے بعد حکومت قومی طاقت کے تمام اجزاء کو یکجا کرتے ہوئے ان میں توازن پیدا کرتی ہے اور خارجی و داخلی امور میں اپنے مقاصد کو حاصل کرتی ہے۔ چاہے حکومت کی ساخت کچھ ہی کیوں نہ ہو اسے خارجہ پالیسی کا تعین و عمل آوری کے لیے موزوں ہونا چاہیے۔ حکومت کا کام صرف خارجہ پالیسی کو بنانا ہی نہیں بلکہ اسے عملی جامہ پہنانا بھی ہوتا ہے۔ کسی بھی پالیسی کو اس وقت تک موثر طور پر روبہ عمل نہیں لایا جاسکتا جب تک کہ عوام اس کے لیے حکومت کو تعاون نہ دیں، چاہے وہ ایک سپاہی، عہدیدار، صارف یا محض ایک ٹیکس دہندہ کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حکومت کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ سیاسی نظام میں عوام کی شرکت کو یقینی بنائے۔ حکومت پروپگنڈہ، سیاسی جماعتوں اور بیوروکریسی (دفتر شاہی) کے ذریعہ عوام کی تائید حاصل کرسکتی ہے۔ ایک مرتبہ خارجہ پالیسی کو بنانے اور اس پر عوامی تائید حاصل کرنے کے بعد اس کو عملی جامہ پہنانے کا کام شروع ہوتا ہے۔ یہاں پر بھی سیاسی ادارے اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ملک کی پارلیمنٹ اور دیگر عوامی ادارے خارجہ پالیسی کی تدوین میں مسلسل رہنمائی کا کام کرتے ہیں۔ خارجہ پالیسی کے مقاصد کو بات چیت اور ترغیب جیسے پر امن طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ کام ملک کی ڈپلومیسی (سفارتکاری) کرتی ہے۔ اس لیے ڈپلومیسی کو طاقت کا ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈپلومیسی کو طاقت کا دماغ کہا جاتا ہے۔

حکومت قومی معیشت میں بھی ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ حکومت کی موزوں مدد کے بغیر جدید صنعتی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ یہ حکومت ہی ہوتی ہے جو فوج پر کنٹرول رکھتی اور ہدایات دیتی ہے۔ امریکہ کا صدارتی نظام حکومت اسے ایک سوپر پاور بننے میں مدد دیا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ امریکیوں کو ایک صدر چاہیے جو ان پر نہیں بلکہ دنیا پر حکمرانی کرے۔ امریکی صدارتی نظام کی خصوصیات صدر کو عالمی سیاست میں موثر رول ادا کرنے کے مواقع مہیا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ امریکی کانگریس صدر کے اختیارات میں عموماً حائل نہیں ہوتی۔ امریکی صدر کی معاونت کے لیے جو معتمدین (وزراء) ہوتے ہیں وہ صدر کو راست جوابدہ

ہوتے ہیں ۔ اس لیے صدر ان کی کارکردگی پر راست نظر رکھتے ہوئے خصوصاً خارجہ امور میں قومی مفادات کی نگرانی کرتا ہے اور یہی بات امریکہ کو گذشتہ صدی میں ایک عظیم طاقت بننے میں مدد دی ہے ۔

8. نظریاتی عنصر Ideological Elements

گذشتہ برسوں میں سرد جنگ کے دوران عالمی سیاست میں نظریات کو قومی طاقت میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے ۔ چنانچہ حکومت کے نظریات اور تصورات ہی داخلی و خارجی معاملات میں اہم رول ادا کرتے ہیں ۔نظریاتی بنیاد پر ہی حکومت اپنی ایک خاص خارجہ پالیسی کو وضع کرتی ہے۔ چنانچہ خارجی امور میں حکومت کے عملی اقدامات کو اس کے نظریاتی پس منظر میں سمجھا جاسکتا ہے ۔ جدید دور میں سوشلزم ، کمیونزم ، لبرلزم، جمہوریت اور گلوبلائیزیشن کے تصورات اہمیت کے حامل ہیں اور یہ قوموں کے درمیاں تعلق و لین دین کی بنیاد بنتے ہیں ۔ چنانچہ Pedelford اور Lincoln نے نظریات کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ نظریات سماجی معاشی اور سیاسی اقدار و مقاصد سے متعلق وہ تصورات ہیں جن کے مطابق اپنے مقاصد کے حصول کے پروگرام بنائے جاتے ہیں ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا نظریاتی بنیادوں پر دو خیموں میں تقسیم ہوگئی تھی ۔ نظریاتی وفاداریاں قوموں کو ایک دوسرے سے قریب کرتی ہیں ۔ تیسری دنیا کے ممالک کی اکثریت نظریاتی طور پر سویت یونین سے قریب تھی جب کہ چین اور سویت یونین کے درمیان مخالفت کی وجہ ان کا مخصوص تصور کیمونزم تھا۔نظریات ذہنی طور پر قومی آبادی کو متحد کرتے ہیں اور ان میں اپنے نظریئے کے لیے لڑنے اور قربانیاں دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران سویت یونین کی سرخ افواج انقلابی نظریے سے سرشاری کے باعث ہی ہٹلر کی افواج کو ناکوں چنے چبواسکی تھیں ۔

9. قیادت Leadership

عوامی طاقت میں ملکی قیادت کو نمایاں مقام حاصل ہوتا ہے ۔ قائد کی رہنمایانہ قابلیت ، مدبرانہ صلاحیت اور کارکردگی کا ملک کی خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی سیاست پر اثر پڑتا ہے ۔ قائد کی تدبرانہ صلاحیت اور فلسفیانہ رہبری سے نہ صرف خارجہ پالیسی کی تدوین میں مدد ملتی ہے بلکہ مقاصد کا تعین بھی صحیح خطوط پر کرتے ہوئے بین الاقوامی سطح پر قوموں سے دوستی کے تعلقات بھی قائم کیے جاسکتے ہیں ۔ اگر ملک کی قیادت ذہین باشعور اور مستحکم ہو تو ایسا ملک بین الاقوامی

امور میں ایک اہم رول ادا کرسکتا ہے اور وہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ گذشتہ صدی کے اوائل سے امریکہ کے عروج میں سابق صدر وڈرو ولسن (Wood Row Wilson) کی مدبرانہ صلاحیتوں اور قیادت کو بڑا دخل ہے ۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد صدر F.D.Roosevelt اور Harry Trueman نے امریکہ کو بہترین قیادت فراہم کی تھی جس کی وجہ سے امریکہ ایک سوپر پاور بنا۔ وزیراعظم نہرو کی مدبرانہ قیادت میں ہندوستان کو تیسری دنیا میں قائدانہ موقف حاصل تھا۔ چنانچہ ہندوستان غیر جانبدارانہ تحریک کے قیام اور فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ قیادت کو یہ صلاحیت، ہوشمند اور ذہین ہونا چاہیے تاکہ بحرانوں کا سامنا کرسکے۔ چنانچہ نپولین نے کہا تھا کہ اگر گیدڑ فوج کا سپہ سالار شیر ہو تو وہ اس فوج کو بھی کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے۔

10. فوجی تیاریاں Military Preparations

کسی ملک کی حقیقی طاقت کا صحیح اندازہ اس کی فوجی تیاریوں اور فوجی طاقت سے لگایا جاسکتا ہے۔ فوجی طور پر مستحکم و طاقتور قوم ہی آزادانہ خارجہ پالیسی کے ذریعہ اپنے مفادات کا تحفظ کرسکتی ہے۔ عصری ہتھیاروں اور جدید اسلحہ سے لیس ملک نہ صرف فوجی طور پر طاقتور ہوتا ہے بلکہ اس کے عوام کا حوصلہ بھی بلند ہوتا ہے اور یہ بات قومی طاقت و وقار کے لیے ایک مثبت پہلو رکھتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمنی کو اپنے جدید آبدوزوں کی وجہ سے برطانیہ پر برتری حاصل تھی۔ اس طرح نیوکلیر ہتھیار رکھنے والے ممالک کو زیادہ طاقتور سمجھا جاتا ہے اور یہ ممالک با آسانی دوسروں پر اثرانداز ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ فوجی قیادت بھی قومی طاقت کے لیے ایک اہم عامل ہے۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں نپولین ایک عظیم فوجی قائد کے طور پر ابھرا اور ہر طرف کامیابی کے جھنڈے لہرادیئے ۔ عراق اپنی فوجی تیاریوں کی وجہ سے 1991ء میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا دیڑھ ماہ تک مقابلہ کرسکا۔ نپولین کے الفاظ میں فوجی طاقت کے بغیر خارجہ پالیسی ایسی ہی ہے جیسے آلہ کے بغیر موسیقی ۔ چنانچہ ہر مملکت خارجہ پالیسی کے مقاصد کے حصول کے لیے فوجی طور پر ہمیشہ تیار رہتی ہے۔

11. سفارتکاری Diplomacy

ڈپلومیسی کو قومی طاقت میں اہم مقام حاصل ہے بلکہ اسے طاقت کے تمام عوامل پر برتری حاصل ہے ۔ کمزور ممالک بھی اپنی شاطرانہ سفارتکاری کے ذریعہ اپنے قومی مقاصد کو بہ آسانی

حاصل کرسکتے ہیں ۔ اسی لیے مارگنتھو نے سفارتکاری کو قومی طاقت کا دماغ قرار دیا ہے۔ سفارتکاری وہ ذریعہ ہے جس کے استعمال سے کوئی قوم اپنے مفادات کا تحفظ کرتی ہے یا پھر خارجہ پالیسی کو روبہ عمل لاتی ہے ۔ چالاک ، ذہین اور دانشمند سفارتکار (ڈپلومیٹ) قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں ۔ اگر چہ کہ جدید مواصلاتی نظام سے ڈپلومیسی کا کام قدرے گھٹ گیا ہے ، اس کے باوجود اس کی اہمیت اور ضرورت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے ۔ کسی بحران یا جنگ کے دوران امن کا انحصار سفارتکاروں کی تیزئ دماغ اور فراست پر ہوتا ہے ۔ قوموں کے درمیان روزمرہ کے تعلقات میں بھی یہ اہم رول ادا کرتے ہیں۔

قومی طاقت کی تحدیدات

قومی طاقت کا حقیقی تعین ایک مشکل امر ہے ، چوں کہ قومی طاقت کے عوامل مستقل نہیں ہوتے بلکہ یہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں ۔ اس کے علاوہ قومی تحدیدات پر کئی تحدیدات بھی عائد ہوتے ہیں جو اس طرح سے ہیں ۔

1. توازن طاقت Balance of Power

توازن طاقت سے مراد طاقت کو طاقت کے ذریعہ روکنا ہے ۔ بین الاقوامی سیاست میں کسی قوم یا قومی گروہوں کی طاقت کو کسی ایک قوم یا قومی گروہوں کی طاقت کو بڑھنے سے روکنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ یہ اپنی مرضی کو دوسروں پر لاگو نہ کرسکے ۔ چنانچہ توازن طاقت کا اظہار راست مخالفت یا مسابقت کے ذریعہ ہوتا ہے ۔ پہلے طریقے میں ایک مملکت دوسری مملکت کی راست مخالفت کرتی ہے تاکہ جوں کی توں حالت (Statusquo) کو برقرار رکھا جاسکے۔ دوسرے طریقے میں دو قومیں کسی تیسری قوم پر کنٹرول قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مسابقت کرتی ہیں ۔ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کے ذریعہ بھی توازن طاقت کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اس طرح توازن طاقت قومی طاقت پر خود بخود تحدیدات عائد کردیتی ہے ۔

2. بین الاقوامی اخلاق International Morality

بین الاقوامی سیاست میں طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہوتا ہے ۔ اس کے باوجود آج کی جدید مہذب دنیا میں طاقت کو بالکل مطلق نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی طاقت کے ذریعہ تمام مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں ۔ چنانچہ سماج کو بچانے کے لیے چند اخلاقی اصول اور ضابطے ہوتے ہیں

جنہیں سیاست داں اور ڈپلومیٹ قوموں کے درمیان پرامن تعلقات کے لیے استعمال کرتے ہیں ، جیسے وعدے اور معاہدات کو پورا کرنا ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا ، مہذب طریقہ سے پیش آنا ، بین الاقوامی قانون کی اطاعت کرنا ، اقلیتوں کا تحفظ کرنا اور جنگ سے احتراز کرنا وغیرہ یہ وہ اصول ہیں جو سیاستدانوں اور سفارتکاروں پر تحدیدات عائد کرتے ہیں ۔ یہ وہ اصول و اخلاقی ضابطے ہیں جن سے خود بہ خود قومی طاقت پر تحدیدات عائد ہوتے ہیں ۔ ان بین الاقوامی اصولوں کو اکثر بین الاقوامی اخلاق بھی کہا جاتا ہے۔

3. عالمی رائے عامہ World Public Opinion

قومی طاقت پر ایک اور تحدید عالمی رائے عامہ کی ہے ۔ چنانچہ عالمی رائے عامہ ویت نام کی جنگ' لیبیا پر امریکی بمباری' 1991ء کی خلیجی جنگ اور اکٹوبر 2001ء میں افغانستان پر امریکی حملوں کے خلاف تھی ۔ اس طرح خارجہ پالیسی پر عالمی رائے عامہ کے اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔ قوموں کو اپنے کسی بھی اقدام سے پہلے عالمی احساسات اور رائے کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے ورنہ بین الاقوامی تنقیدوں اور مذمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ عالمی رائے عامہ زبردست اخلاقی قوت کی حامل ہوتی ہے جس کی کوئی طاقت بھی ان دیکھی نہیں کرسکتی۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے مباحث عالمی رائے عامہ کے مظہر ہوتے ہیں۔اور قوموں پر اخلاقی دباؤ ڈالتے ہیں۔

4. بین الاقوامی قانون International Law

بین الاقوامی امور میں بین الاقوامی قانون کو ایک اہم عامل کی حیثیت حاصل ہے ۔ یہ قومی طاقت پر زبردست تحدیدات عائد کرتا ہے ۔کوئی بھی قوم بین الاقوامی قانون اور اُصولوں کو اپنے اقدامات کے ذریعہ مکمل رد نہیں کرسکتی ۔ بین الاقوامی قانون بین الاقوامی سماج کا تحفظ اور قوموں کے درمیان بہترین دوستانہ تعلقات کے قیام کا ضامن ہوتا ہے ۔ یہ قوموں کے درمیان روابط کے لیے اصولوں کا تعین کرتا ہے جن کے ذریعہ قومیں آپسی تعلقات کو استوار کرتے ہوئے جنگ سے گریز کرسکتی ہیں ۔ مسلمہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں قوموں کو عالمی مذمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

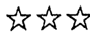
5. ترک اسلحہ Disarmament

عالمی امن کے قیام کے لیے ترک اسلحہ کو ضروری سمجھا گیا ہے ۔ چنانچہ قوموں کی جانب سے ترکِ اسلحہ کی بھاری دوڑ سے انسانیت کے وجود کو لاحق خطرات کے نتیجے میں سوپر پاورز

امریکہ اور سویت یونین کو ترکِ اسلحہ کے لیے دوطرفہ (Bi-lateral) اقدامات کے معاہدات جیسے SALT-I اور SALT-II کرنے پڑے تھے۔ اسی طرح عالم گیر ترکِ اسلحہ کے لیے NPT اور CTBT کے معاہدات قوموں کو ترکِ اسلحہ پر مجبور کرتے ہیں جن کی وجہ سے قوموں کی طاقت میں کمی آتی ہے۔

6. بین الاقوامی تنظیمیں International Organizations

بین الاقوامی تنظیمیں جیسے مجلس اقوام (Leage of Nations) اور اقوام متحدہ UNO سے قوموں کی طاقت میں کمی آتی ہے۔ ان عالمی تنظیموں کی وجہ سے قومیں بے ہنگم طور پر اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کرسکتیں۔ بین الاقوامی تنظیمیں قوموں کے لیے ایک پلیٹ فارم فراہم کرتی ہیں، جہاں قومیں آپسی مسائل کو گفت وشنید کے ذریعہ حل کرسکتی ہیں۔ بین الاقوامی تنظیموں کے منشور کے مطابق قوموں کو عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ قومی طاقت پر ایک تحدید ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادیں اور دیگر بین الاقوامی ادارے و تنظیمیں جیسے قوموں کی دولت مشترکہ (Common Wealth of Nations)، عرب لیگ، تنظیمِ اسلامی کانفرنس وغیرہ کے فیصلے قومی طاقت پر روک لگاتے ہیں۔ آج اقوام کسی نہ کسی تنظیم اور ادارے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے وہ انفرادی فیصلوں کے مقابلہ میں اجتماعی فیصلوں کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہیں۔



باب 5

توازنِ طاقت
Balance of Power

بین الاقوامی طاقت کے تعلقات میں قوموں کے درمیان تعلقات اور آپسی رویے کو متعین کرنے والے اہم عوامل میں قوموں کے درمیان طاقت اور اس کی تقسیم اہم ہے۔ آزاد قوموں کے درمیان روایتی تعلقات کو توازن طاقت کا ہی نام دیا جاتا تھا۔ بین الاقوامی سیاست میں قومی طاقت کو امن کے قیام کے لیے یا پھر امن کو درہم برہم کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ طاقت تشدد کو روکنے کا اہم ہتھیار اور ذریعہ بھی ہے۔ اسی لیے بین الاقوامی سیاست اور تعلقات میں توازن طاقت کے نظریے کو بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے۔ عام معنوں میں توازن طاقت سے مراد مختلف قوموں کے درمیان متوازن طاقت کا قیام ہے۔ توازن (Balance) کا تصور تکنیکی مطالعہ سے لیا گیا ہے اور اسے مختلف علوم پر منطبق کیا جاتا ہے۔ کوئی قوم علیحدگی میں نہیں رہ سکتی۔ اس کے علاوہ دنیا میں مختلف طاقتوں کی حامل قومیں رہتی ہیں۔ ہر قوم اپنی قوت میں اضافہ کی کوشش کرتی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قومیں مختلف گروہ بناتی ہیں تاکہ کوئی ایک قوم یا قوموں کا گروہ زیادہ طاقتور ہوکر اثرانداز ہونے کی صلاحیت حاصل نہ کر سکے۔ ایک گروہ کی طاقت کو دوسرے گروہ کی طاقت سے توازن میں لایا جاتا ہے اور جب تک اس طرح کا توازن قائم رہتا ہے امن قائم رہتا ہے اور جنگ ہی عدم توازن کی جانچ ہوتی ہے۔

توازن طاقت کی کوئی ایک واضح تعریف کرنا مشکل کام ہے۔ چنانچہ Inis-L-Claude کہتا ہے کہ ”توازن طاقت کے سلسلے میں مشکل یہ نہیں کہ اسکے کوئی معنی نہیں ہیں، بلکہ مشکل تو یہ ہے کہ اس کے کئی معنی ہیں“۔ اس کے باوجود توازن طاقت کے معنی بہت آسان ہیں۔ میزان (ترازو) کے پلڑوں میں وزن مساوی ہو تو یہ توازن ہوگا۔ اس طرح بین الاقوامی تعلقات میں نظریہ توازن طاقت کا مطلب Palmer اور Perkins کے مطابق ”بدلتے ہوئے اتحادات اور مخالف دباؤ کے ذریعہ کسی طاقت اور گروہ کو اتنا مضبوط ہونے نہ دیا جائے کہ اس سے دوسروں کی سلامتی کو خطرہ ہو“۔ پروفیسر Fay نے انسائیکلو پیڈیا سوشیل سائنس میں توازن طاقت کی تعریف اس طرح کی ہے ”قوموں کے درمیان انصاف پر مبنی طاقت کا توازن اس طرح سے

ہو کہ اس میں کوئی زیادہ طاقتور ہو کر اپنی مرضی دوسروں پر لاگو نہ کر سکے"۔ اس طرح سے توازن طاقت کا تصور اس بنیادی مفروضہ پر قایم ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کے نظام میں کہیں بھی زائد طاقت دوسری اکائیوں کے لیے خطرہ ہوتی ہے اور طاقت کو طاقت کے ذریعہ ہی قابو میں لایا جاسکتا ہے۔

طاقت کا توازن دو طرح کا ہوتا ہے جو دو مساوی قوتوں کے درمیان پیدا ہوتا ہے اور جو مختلف قومی گروہوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف پیدا ہوتا ہے۔ **Morgenthau** کے الفاظ میں "یہ وہ حقیقی حالت ہے جس میں کئی قوموں کے درمیان مساوات کے ساتھ طاقت کی تقسیم ہوتی ہے"۔ اس طرح یہ نظریہ توازن ونگرانی **(Checks and Balance)** پر منحصر ہے۔ مارگنتھو نے اس نظریے کے چار معنی بتلائے ہیں۔ **1.** بطور پالیسی جسکا مقصد مخصوص حالت ہے **2.** بطور حقیقی امور کی پالیسی **3.** بطور مکمل طاقت کی تقسیم کی پالیسی **4.** بطور تقسیمِ قوت کی پالیسی۔

Earnest B.Haas نے بھی اس اصطلاح کے چار استعمالات بتائے ہیں۔

1. بطور ایک بیان **(As a Statement)** : توازن طاقت کو بطور ایک بیان اسوقت کہیں گے جب کہ اس سے ایسی حالت ظاہر ہوتی ہو جس میں طاقت کے رشتہ کو متوازن کیا جاتا ہے جب کہ ایک گروہ دوسرے کے مقابل برتر ہوتا ہے۔

2. بطور ایک پروپگنڈہ اور نظریہ: توازن طاقت کی بطور پالیسی اُس وقت شناخت کی جاتی ہے جب یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ غیر متوازن طاقت نقصان دہ ہوتی ہے۔ اس طرح سے ہمیشہ مملکتی نظام میں کسی ملک کے زیادہ طاقت حاصل کرنے کو خطرناک سمجھا جاتا ہے اور اسے طاقت کے ذریعہ ہی روکا جاسکتا ہے۔

3. بطور تجزیاتی تصور **(As an Analytical Concept)** : توازن طاقت کو ہم ایک نظام کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس کا مطلب بین الاقوامی تعلقات میں مملکتوں کے درمیان تعلقات کے انتظامات سے ہے۔

4. بطور نسخہ **(As a prescription)** :توازن طاقت کو حقیقت پسندی کی علامت کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے جس میں کوئی بھی طاقت کے توازن کو نظرانداز کرنا نہیں چاہتا۔ حقیقت پسند مکتب **(Realists)** طاقت کے توازن کو طاقت کی جدوجہد **(Struggle for Power)** سے

تعبیر کرتے ہیں۔ یہ تصور' طاقت کی سیاست کی حقیقت پسندی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خصوصیات Characteristics

پہلے یہ کہ یہ اصطلاح خود توازن کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن تاریخ کا ہر طالب علم اچھی طرح جانتا ہے کہ تاریخ میں مسلسل تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ خصوصاً سیاسی نظام اور بین الاقوامی تعلقات میں عدم توازن کی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی اس نظریہ پر توازن کی اصطلاح میں بحث کی جاسکتی ہے جو کہ بین الاقوامی توازن سے متعلق ہے۔ دوسرے یہ کہ توازن طاقت کا عمل عارضی اور غیر مستحکم ہوتا ہے جیسا کہ Destia اور Singer نے کہا ہے کہ "کوئی بھی توازن طاقت کا نظام صرف چند صدیوں سے زائد برقرار نہیں رہا۔ اس نظام میں جدوجہد کرنے والی تقریباً ابتدائی طاقتیں آزاد قوت کی حیثیت سے صرف مختصر سے عرصے کے لئے زندہ رہ سکیں"۔

Nicholson J.Spykman کے مطابق توازن طاقت خدا کا عطیہ نہیں بلکہ یہ انسانی سرگرمی سے حاصل ہوتی ہے۔ کوئی بھی مملکت توازن طاقت کے خود بہ خود قایم ہونے کا انتظار نہیں کرسکتی، بلکہ اسے اپنے خلاف اُبھرنے والے توازن طاقت کے خلاف جنگ کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ چنانچہ توازن طاقت ایک تاریخی عمل کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ڈپلومیٹک ترکیبوں کا نام ہے۔

عموماً توازن طاقت کا مقصد و منشاء جوں کی توں حالت (Statusquo) حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ ایسی پالیسی جو کہ بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت نہیں رکھتی آخر تباہ و فنا ہوسکتی ہے۔ چنانچہ موثر توازن طاقت کے لئے ضروری ہے کہ وہ بدلتی اور متحرک رہے۔

حقیقی توازن طاقت کبھی قائم نہیں ہوتا، بلکہ کسی بھی مملکت کے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ کب توازن طاقت حاصل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ توازن تجزیہ طاقت (Balance of Analysis of Power) کی اصطلاح کو استعمال کرنا چاہیے۔ توازن طاقت کی صحیح جانچ صرف جنگ ہے۔ اگر جنگ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ توازن طاقت باقی نہیں تھا۔

نظریہ توازن طاقت ایک تاریخ داں کے مقصدی نکتہ نظر (Objective Approach) اور ایک سیاستداں کے موضوعاتی (Subjective Approach) نکتہ نظر دونوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک مورخ کے مطابق توازن طاقت اُس وقت قائم ہوگا جب کہ مخالف گروہ اپنی طاقت کے

اعتبار سے مساوی ہو۔ جب کہ ایک سیاست داں توازنِ طاقت اُس حالت کو کہتا ہے جس میں طاقت کا توازن اس کی طرف جھکا ہو اور دوسرے پر اپنی برتری و طاقت رکھتا ہو۔ درحقیقت توازن طاقت کا کھیل کھیلنے والی قومیں توازن نہیں بلکہ عدم توازن چاہتی ہیں۔

توازن طاقت کے تصور میں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ تصور بنیادی طور پر امن کو قائم کرنے کا ایک ذریعہ نہیں ہے۔

توازن طاقت کا یہ کھیل صرف بڑی طاقتوں کے لیے ہے اور اس کے اطراف کی چھوٹی طاقتیں مختلف اوزان (Weights) کا کام انجام دیتی ہیں۔ چھوٹی مملکتیں بڑی مملکتوں کے توازن کا شکار ہوتی ہیں یا پھر وہ اس کھیل کو صرف تماشائی کی طرح دیکھتی ہیں۔ البتہ چھوٹی مملکتیں اجتماعی طور پر بڑی مملکتوں کے توازن طاقت پر اثر انداز ہوسکتی ہیں جیسے عرب لیگ ، آرگنائیزیشن آف امریکہ (OAS) وغیرہ۔ علاقائی توازن میں چھوٹی مملکتیں اپنی آزادی کی بقاء کے لیے اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔ توازن کی پالیسی نہ تو جمہوریت کے لیے اور نہ ہی آمریت کے لیے موزوں ہوگی اُس وقت تک جب تک کہ جغرافیائی ، سیاسی ، فوجی اور دیگر عوامل اپنے مفاد میں نہ ہوں۔ توازن کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ توازن کی جدوجہد میں مصروف طاقت کے لیے ایک کامیاب نظام کی عمل آوری ہورہی ہو۔

تصور کا تاریخی ارتقاء

جدید مملکتی نظام کے آغاز سے توازن طاقت کے تصور کا آغاز ہوا ہے۔ سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک یہ تصور یوروپ میں کامیابی سے کام کرتا رہا ہے۔ شمالی اٹلی کے حکمرانوں اور اسپین کے حکمرانوں کے درمیان رقابتوں کا فائدہ اٹھا کر فرانس اور پروشیا کی اٹلی کی سیاست میں مداخلت کی کوششیں اس تصور کا عملی اطلاق ہیں۔ اس تصور کے پہلے اظہار کا سہرا Bernardo Rucellain (1449-1514) کے سر جاتا ہے۔ بعد میں اس تصور کو میکیاولی نے بھی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''حکمراں'' (The Prince) میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کوئی بھی دوسرے کی ترقی میں حصہ ادا کرے گا وہ اپنے آپ کو تباہ کردے گا۔ مارگنتھو کہتا ہے کہ فرانس اول کی جانب سے ہنری ہشتم اور ترکوں سے ہاپسبرگ کے چارلس پنجم کے استحکام اور توسیعت کو روکنے کے لیے کیے جانے والے معاہدات ایک قوم کے خلاف ایک اتحاد کی وہ مثال ہے جس کے ذریعہ توازن طاقت کو قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ سترھویں صدی میں تیس سالہ جنگ

(1618-48) کا توازن طاقت کے نکتہ نظر سے تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ معاہدہ ویسٹ فیلیا 1648ء نے مملکتی نظام کو قائم کیا جس سے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کا تعین ہوا۔ جس کے نتیجے میں پہلے سے کہیں زیادہ توازن طاقت کے کھیل کا آغاز ہوا۔ جب فرانس کے لوئیس چہاردہم (Louis XIV) کے جوش سے توازن کے تباہ ہونے کا خطرہ پیدا ہوا تو انگلینڈ اور نیدرلینڈ نے اس کا متحدہ مقابلہ کیا۔

اُنیسویں صدی میں نپولین کے عروج سے یورپ کا توازن طاقت پھر ایک مرتبہ متاثر ہوا۔ ویانا کی کانگریس (Vienna Congress) نے جائز اور جوں کی توں حالت (Statusquo) کی بنیاد پر توازنِ طاقت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ منرو اُصول (Munroe Doctrine) 1823 عالمی پیمانے پر اس تصور کے رفتہ رفتہ پھیلاؤ کا باعث بنے۔ یورپی سرزمین سے باہر توازن طاقت کو مزید توسیعت اس وقت ملی جب کہ 1854ء میں برطانیہ اور آسٹریا، روس کے خلاف متحدہ محاذ بنائے اور یہ اعلان کیا کہ '' یوروپ کی مملکتوں کے درمیان توازن طاقت کو قائم رکھنے کے لیے سلطنت عثمانیہ کا اپنی موجودہ سرحدات کے ساتھ وجود ضروری ہے''۔ اس کے بعد جنگ کریمیاء (Creamean War 1854-56) کا اعلان نامہ سامنے آیا۔

بیسویں صدی میں یوروپ دوخیموں میں منقسم تھا۔ برطانیہ فرانس اور روس کا اتحاد 1907ء جو اتحادِ سہ گانہ (Triple Entente) کہلایا۔ جرمن، آسٹریا ہنگری اور اٹلی کا اتحاد 1882ء جو اتحاد ثلاثہ (Tripl Alliance) کہلایا۔ جب کہ بلقان کے علاقے میں توازن طاقت بگڑ گیا تو 1914ء میں پہلی جنگ عظیم لڑی گئی1919ء سے 1939ء کے دوران محض اقوام کی اجتماعی سلامتی (Collective Security) کے تصور سے توازن طاقت کا نظریہ کام نہ کرسکا۔ لیکن مجلس اقوام کی کمزوری سے یہ نظام پھر مضبوط ہوا۔ توازن طاقت کے نام پر اتحادات اور مخالف اتحادات ہونے لگے۔ دو قطبی نظام (Bi-Polarity) اور ہمہ قطبی نظام (Multi- Polarity) توازن طاقت کی سب سے خطرناک شکل ثابت ہوئے۔ سویت یونین کے بکھراؤ سے جو یک قطبی نظام (Uni-Polarity) وجود میں آیا ہے اس کی وجہ سے اب توازن طاقت مکمل طور پر امریکہ کی جانب جھکا ہوا ہے۔ مما لک کی نئی سیاسی شیرازہ بندی اس توازن کو توڑ دے گی۔ چنانچہ دوحریف مما لک چین اور سویت یونین کی معاہداتی دوستی اور چند ایک مما لک کی مخالف امریکی گروہ بندی کے نتیجے میں ممکن ہے کہ آنے والے برسوں میں طاقت کا ایک نیا توازن قایم ہو۔

توازنِ طاقت کے طریقے

توازن طاقت کوئی قدرتی عمل نہیں ہے بلکہ اس کے لیے خصوصی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ حسب ذیل طریقوں کو توازن طاقت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

1. اتحادات اور مخالف اتحادات

یہ توازن طاقت حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ یہ طاقت حاصل کرنے یا مخالف کو کمزور بنانے کا ایک روایتی طریقہ ہے۔ اتحادات حملہ کے لیے (Offensive) اور دفاعی (Defensive) دوطرح کے ہوتے ہیں۔ ایک طریقہ کے اتحاد میں اپنے اراکین کے لیے موجودہ توازن طاقت کو درہم برہم کرنا ہوتا ہے تا کہ توازن طاقت اپنے حق میں ہوسکے۔ دوسرے طریقے میں کسی اتحاد کا مقصد حقیقی طور پر توازن کو قائم کرنا اور برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ اتحادات مشترکہ دشمن کے خلاف مشترکہ مفادات کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں اور مقصد کے حصول کے بعد ایسے اتحادات ختم بھی ہوسکتے ہیں۔ اتحادات کے عمل اور ردعمل کے نتیجے میں جنگ بھی ہوسکتی ہے۔ ناٹو (NATO) اور معاہدہ وارسا (Warsaw pact) اس کی مثالیں ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد معاہدہ وارسا کے اتحاد کو تحلیل کردیا گیا۔

2. معاوضہ Compensation

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں علاقے کی شکل میں معاوضہ کی ادائیگی توازن طاقت کے حصول کا ایک عام طریقہ تھا۔ خصوصاً طاقتور قومیں کمزور قوموں سے جنگ کے بعد حاصل کردہ علاقوں کے ذریعہ توازن طاقت کو حاصل کرلیتی تھیں۔ 1919ء میں صدر ولسن کی وجہ سے یہ طریقہ ترک کردیا گیا۔ صدر ولسن نے توازن طاقت کی ڈپلومیسی کو ترک کردیا اور اس کی جگہ اپنے چودہ نکاتی پروگرام کو پیش کیا۔ اس کے باوجود یہ طریقہ بالواسطہ طور پر تولیتی نظام (Mandatory System) کی شکل میں جاری رہا' جس میں کسی علاقہ کو ایک ملک کی نگرانی میں تولیت (Mandates) کی شکل میں دے دیا جاتا تھا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد اس طریقہ کو مکمل طور پر ختم کردیا گیا۔

3. اسلحہ اور ترک اسلحہ Armaments and Disarmaments

قومی دفاع کا سب سے اچھا طریقہ فوجی تیاریاں ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی کی وجہ سے جنگی طریقے وتکنیک بدل گئی اور عام تباہی کا خوف بہت زیادہ ہوگیا۔ چنانچہ توازن

طاقت کے حصول کے لیے ترک اسلحہ کی مسلسل جدوجہد ضروری ہے۔ بیسویں صدی میں معاہدہ ورسیلز کے ذریعہ اس سمت میں پہلا قدم اٹھایا گیا تھا۔ اس کے بعد دوسرا قدم 1922ء میں واشنگٹن بحری کانفرنس (Washington Naval Conference) میں لیا گیا۔ مخالف قوتیں اپنے آپ کو اسلحہ سے لیس کرتے ہوئے اپنے حق میں توازن طاقت کے لیے جدوجہد کرتی ہیں اور یہ جدوجہد مخالف قوتوں کے درمیان راست اقدام کی صورت میں ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ قومیں توازنِ طاقت کے لیے بڑی طاقتوں کا سہارا بھی لیتی ہیں۔

4. مداخلت اور جنگ Intervention and War

مداخلت اور جنگ کو توازن طاقت کے آخری حربے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے طاقتور قومیں دوسرے ممالک کے داخلی معاملات میں دخل اندازی کرتی ہیں۔ جرمنی اور اٹلی جنرل فرانکو کی تائید میں اسپین کی خانہ جنگی کے دوران مداخلت کئے۔ برطانیہ یونان میں امریکہ کیوبا اور لاوس میں سویت یونین شالی کوریا، ہنگری، مشرقی یوروپ اور افغانستان وغیرہ میں مداخلت کے ذریعہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کئے اور یہ مداخلت دوسرے معنوں میں جنگ کہلاسکتی ہے۔ جب کوئی قوم اپنی طاقت سے مطمئن نہ ہو تو طاقت میں مزید اضافہ کے لیے دوسرے مما لک میں مداخلت کے ذریعہ اپنی قوت کو مجتمع کرتی ہے۔

5. تقسیم کرو اور حکومت کرو پالیسی Divide and Rule Policy

اس طریقے کو قومیں اپنے حریف کو کمزور کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ لیکن یہ ایک موقتی پالیسی ہوتی ہے۔ چنانچہ وقتی مفادات کی خاطر قومیں اپنے حریفوں کو متحد ہونے نہیں دیتیں بلکہ اُن میں پھوٹ ڈالتی ہیں تاکہ یہ مستحکم اور طاقتور نہ ہونے پائیں۔

6. چھوٹی مملکتیں Small States

دو بڑی مملکتوں کے درمیان چھوٹی مملکتیں توازنِ طاقت کے لیے آلہ کار بن جاتی ہیں اور بعض مرتبہ یہی چھوٹی مملکتوں کی سرحدات اگر دو بڑی مملکتوں کی سرحدات سے منسلک ہوں تو ان دونوں بڑی مملکتوں کے درمیان توازن طاقت کے لیے یہ میزان کا کام انجام دیتی ہیں جیسے انیسویں صدی میں افغانستان، روس اور برطانوی ہند کے درمیان ایک Buffer State کے طور پر کام کیا تھا۔ اسی طرح یوروپ میں فرانس اور جرمنی کے درمیان بلجیم اور ہالینڈ بفر اسٹیٹس کا کام کیے تھے۔ یہ بفر اسٹیٹس جنگ کو روکتے ہوئے بڑی طاقتوں کے درمیان توازن طاقت کا کام

کرتی ہیں۔

جائزہ اور تنقید

توازنِ طاقت کا نظریہ اجتماعی سلامتی کے نظام کی عدم موجودگی میں امن کی ضمانت دیتا ہے۔ گذشتہ چارسو سال سے توازنِ طاقت کی پالیسی اکثر اوقات امن کے قیام میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ توازن طاقت کا نظریہ کسی ایک ملک کی طاقت کو غیرضروری اور زائد طاقت کے حصول سے روکتا ہے۔ اسی نظریہ سے جدید مملکتی نظام میں مدد ملی ہے۔ دوسرے الفاظ میں توازنِ طاقت چھوٹی مملکتوں کی آزادی کی ضمانت ہے۔ چوں کہ بین الاقوامی قانون کو لاگو کرنے کے لیے کوئی مشنری نہیں ہے ایسے میں توازنِ طاقت ہی بین الاقوامی قوانین کی عمل آواری کے لیے قوموں کو مجبور کرسکتا ہے۔

توازنِ طاقت سے امن کے قیام کی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ جب کہ یہ واضح ہے کہ موجودہ دنیا میں بڑی بڑی جنگیں صرف توازن طاقت کے غلط اندازوں کی بناء پر لڑی گئیں۔ ہر طاقت اپنے کو دوسرے سے برتر اور مضبوط سمجھتی ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ اگر کوئی ایک ملک یا گروہ زیادہ طاقتور ہوتو امن کے لیے ہمیشہ خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ نظریہ اس مفروضہ پر قائم ہے کہ کسی قوم کی طاقت مضبوط ہوتی ہے اور اس میں علاقائی توسیع پسندی اتحادات اور فوجی مداخلت کے ذریعہ اضافہ نہیں ہوتا۔ جب کہ دوسری طرف کسی قوم کی طاقت میں سائنس اور ٹکنالوجی اور داخلی وسائل کے استعمال کے ذریعہ اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس نظریہ کی کمزوری یہ ہے کہ قومیں اتحاد کو بنانے یا توڑنے میں آزاد نہیں ہوتیں بلکہ یہ اپنے سیاسی معاشی اور نفسیاتی مفادات کے تابع ہوتی ہیں۔ ہر قوم اپنے فطری مفادات کی بنیاد پر اپنے دوستوں کا تعین کرتی ہے۔ یہ نظریہ بین الاقوامی اخلاقی اُصولوں کے مغائر خودغرضی پر مبنی ہے۔ یہ نظریہ دوسری مملکتوں کو اپنا دشمن مان کر چلتا ہے۔ اس طرح طاقت کا حصول قوموں کا مقصد بن جاتا ہے۔ جب کہ قوموں کے معاشی اور تہذیبی مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ یہ ایک خالصتاً میکانیکل نظریہ ہے۔ اس کے علاوہ امن صرف توازن طاقت کے میکانزم پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ امن کا تعلق قوموں کے اخلاقی شعور پر ہوتا ہے۔ اس نظریہ کا یہ مفروضہ کہ کسی مملکت کی طاقت کی پیمائش کی جاسکتی ہے غلط ہے۔

توازنِ طاقت کا تصور آج کے حالات میں

توازنِ طاقت کے تصور میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ تیزی سے بدلتی دنیا میں

اس تصور کی موزونیت پر سوالات اُٹھائے جارہے ہیں اور اپنے کلاسیکی (قدیم) معنوں میں اس تصور کا اطلاق آج کے حالات میں ممکن نظر نہیں آتا۔ ایک مکتب فکر کے مطابق یہ نظریہ اپنی افادیت کھوچکا ہے۔ جب کہ دوسرا مکتب فکر اس تصور کو آج بھی اہم مانتا ہے۔ حسب ذیل وجوہات کی بنا پر یہ تصور از کار رفتہ ہو چکا ہے۔

1. نئی قوتیں New Forces

توازنِ طاقت کا یہ تصور جدید تاریخ کے اس دور میں کارآمد تھا جب کہ یوروپ میں کئی مملکتیں یکساں اور مساوی قوت کی حامل تھیں۔ بعد میں جب یوروپ کا توازنِ طاقت عالمی توازن طاقت میں تبدیل ہوا تو اس نظریہ کی کامیاب عمل آوری کے لیے موافق حالات نہیں رہے۔ قوم پرستی (Nationalism)، صنعتیت (Industrialism)، جنگ کے نئے طریقے، بین الاقوامی قانون اور تنظیم کا ارتقاء قوموں کے بڑھتے ہوئے باہمی معاشی انحصار، نوآبادیت کے خاتمے اور نئے اقوام کے اُبھرنے سے ایک نئی دنیا سامنے آئی ہے۔ یہ تمام قوتیں (Forces) طاقت کے توازن کو بدل دیتی ہیں۔

2. طاقتوں کی تعداد میں کمی

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے وقت دنیا میں پانچ تا سات بڑی طاقتیں تھیں۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور سویت یونین دو ہی بڑی طاقتیں باقی رہیں جس کی وجہ سے طاقت کا قدیم توازن ختم ہوگیا اور طاقت کے نئے توازن میں صرف دو عظیم طاقتیں امریکہ اور سویت یونین ایک دوسرے کے حریف بنے۔ اس کے علاوہ طاقت کے توازن کے کھیل میں زیادہ سے زیادہ مہروں (Actors) کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ان کے گھٹ جانے سے یہ تصور ہی ختم ہوگیا۔

3. دو قطبی نظام Bi-Ploarity

توازنِ طاقت کے لیے یکساں طاقت کی حامل تین یا اس سے زائد طاقتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد دو عظیم طاقتوں کے اُبھرنے سے ایک نیا دو قطبی نظام پیدا ہوا اور کوئی بھی قوم دو عظیم طاقتوں امریکہ اور سویت یونین کے درمیان طاقت کا توازن قائم کرنے کے قابل نہیں تھی۔ چنانچہ عظیم طاقتوں اور دوسری طاقتوں کے درمیان فرق اتنا زیادہ تھا کہ قوموں کا کوئی بھی گروپ ان دو عظیم طاقتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ دوسری بڑی طاقتیں

توازن پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئیں۔ چنانچہ چھوٹی طاقتوں کی مرضی اور طاقت بے معنی ہوگئی۔ دوسری طرف دو قطبی نظام کو خود امن کی ضمانت سمجھا گیا تھا۔ چنانچہ چالیس سالہ سرد جنگ کے دوران دونوں عظیم طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف عام تباہی کے ہتھیار (Weapons of Mass Destruction) کو کبھی استعمال نہیں کیے۔ بلکہ یہ ہتھیار ایک دوسرے کے خلاف موثر تحدید کا کام کیے۔

4. نیوکلیر ہتھیار Nuclear Weapons

نیوکلیر ہتھیاروں کی وجہ سے توازن طاقت کا تصور ناکارہ ہوچکا ہے۔ جنگ اور ہتھیاروں کی نوعیت کی وجہ سے توازن طاقت کا کوئی بھی حمایتی جنگ کی تباہ کاریوں سے بچ نہیں سکتا۔ چنانچہ کوئی بھی ملک کسی طاقت کی حمایت کرتے ہوئے جنگ کا جوکھم مول لینا نہیں چاہتا۔ قدیم طاقت کے توازن میں قومیں جنگ کی دھمکی کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتی تھیں۔ لیکن آج تباہ کن اسلحہ کی وجہ سے یہ دھمکی ممکن نہیں۔

5. نظریاتی عوامل Ideological Factor

آج کی دنیا میں نظریاتی تصورات اتنے طاقتور ہیں کہ قومیت کا تصور ماند پڑ گیا ہے۔ لوگ قومی سرحدوں سے اُوپر اُٹھ کر عالم گیر نکتہ نظر سے سوچ رہے ہیں جس کی وجہ سے توازن طاقت کی اہمیت ختم ہوگئی ہے۔ جب کسی قوم کی خارجہ پالیسی نظریاتی خطوط پر چلتی ہو تو یہ توازنِ طاقت میں دلچسپی نہیں رکھتی۔

6. اجتماعی سلامتی Collective Security

بین الاقوامی اداروں مجلس اقوام (League of Nations) اور تنظیم اقوام متحدہ (UNO) جیسے اداروں کے ذریعہ اجتماعی سلامتی کے تصور نے توازن طاقت کی اہمیت و افادیت کو گھٹا دیا ہے۔ اب قومیں وسیع تر عالمی پلیٹ فارم پر اپنے مسائل پر گفتگو کرنے لگی ہیں اور اب کسی بھی معاملے میں پوری عالمی برادری کی شمولیت ناگزیر ہوسکتی ہے۔ عالمی رائے عامہ بھی توازنِ طاقت کے میکانزم کو کمزور بنادی ہے۔ چنانچہ اب عالمی اداروں اور رائے عامہ کو ہی امن کی ضمانت سمجھا جارہا ہے۔

توازنِ ہیبت Balance of Terror

نیوکلیر مملکتوں کے درمیان طاقت کا وہ توازن جس میں اُن کے درمیان نیوکلیر جنگ کی

صورت میں زبردست تباہی کا خوف ہوتا ہے توازن ہیبت کہلاتا ہے۔ امریکہ اور سویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے چالیس برسوں کے دوران توازن خوف اس بات پر اور سوجھ بوجھ پر قایم تھا کہ دونوں کے پاس مختلف قسم کے اسلحہ کا وہ نظام ہے جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کی آبادی کے مراکز پر عظیم تباہی لا سکتے ہیں اور جسے دفاعی اقدامات کے ذریعہ روکا نہیں جاسکتا۔ توازن ہیبت باہمی تباہی کا یقین MAD (Mutual Assured Destruction) کے عقیدے پر قائم تھا اور یہ خیال کہ اچانک پہلا وار دوسرے کے حفاظتی اور وسیع پھیلے ہوئے نظام کو تباہ نہیں کرسکتا ختم ہوا۔ توازنِ ہیبت سے مزاحمت (Deterrence) کی صلاحیت کا شعور پیدا ہوا۔ اسی نظریے سے دونوں جانب فریق ممالک کے درمیان تباہ کن ہتھیاروں کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔

توازنِ مزاحمت Balance of Deterrence

ایک مملکت یا مملکتوں کے ایک گروہ کی جانب سے کی جانے والی وہ سرگرمیاں جس کا مقصد دوسری مملکتوں کو ایسی پالیسیوں کے اپنانے سے باز رکھتا ہو جس سے اُس مملکت یا گروہ کو نقصان پہنچتا ہے توازن مزاحمت (Balance of Deterrence) کہلاتا ہے۔ اس میں سزا یا دھمکی کی وہ حکمت عملی اپنائی جاتی ہے جس میں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مخالف ملک کو اپنی پالیسیوں یا سرگرمیوں کے عوض کچھ حاصل نہ ہوگا اور فائدہ اُس کے اندازے سے کم ہی ہوگا۔ یہ پالیسی اپنانے والی مملکتیں اپنی فوجی صلاحیتوں میں اضافہ کرتی ہیں۔ ایسے اعلیٰ قسم کے ہتھیار بناتی اور اپناتی ہیں جس سے بڑی تباہی آتی ہو۔ اس میں ممالک معاہدات بھی کرتے ہیں اور مخالفین کو دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں۔



باب 6

قومی مفاد
National Interest

بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ میں قومی مفاد کا تصور بہت اہمیت کا حامل ہے۔ خصوصاً قوموں کی خارجہ پالیسی کے مطالعہ میں یہ ایک اہم ترین تصور ہے چونکہ قومیں اسی کی بنیاد پر خارجہ پالیسی وضع کرتی ہیں۔ بلکہ خارجہ پالیسی کا مقصد ہی قومی مفاد کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن قومی مفاد کا تعین کرنا آسان نہیں چونکہ یہ ہمیشہ یکساں رہتا بلکہ وقت اور حالات کے لحاظ سے یہ بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ Joseph Frankel کے مطابق قومی مفاد کو ''مملکت کے جذبات و احساسات اور خواہشات کہا جاسکتا ہے''۔ قومی مفاد کے نام پر قومی لیڈر اپنے اقدامات کو جائز قرار دیتے ہیں۔ نپولین نے روس پر حملے کو قومی مفاد کے نام پر جائز قرار دیا تھا۔ اڈولف ہٹلر نے بھی اپنی توسیعت پسندی کی پالیسیوں کو قومی مفاد میں جائز قرار دیا تھا۔ امریکی صدر Lyndon B.Johnson نے تاریخی ویت نام کی جنگ میں امریکی مفاد کو خطرہ میں بتایا تھا۔ خلیجی جنگ کے دوران امریکی صدر جارج بش نے امریکی مفادات کو لاحق خطرات کا حوالہ دیا تھا۔

معنی اور تعریف

جوزف فرانکل نے قومی مفاد کو دو بڑے درجوں میں تقسیم کیا ہے، ایک مقصدی (Objective) اور دوسرا موضوعاتی (Subjective)۔ پہلے درجے میں وہ نکتہ نظر ہیں جو قومی مفاد کو ایک ایسا تصور سمجھتے ہیں جس کی تعریف کی جاسکتی ہے اور چند متعینہ کسوٹیوں پر ان کی جانچ کی جاسکتی ہے۔ جب کہ دوسرے درجے میں وہ تصورات ہیں جو قومی مفاد کو بدلتے حالات میں ایک بدلتا میکانزم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ قومی مفاد کی تعریف کا انحصار ایک خاص فرد کی جانب سے مختلف موضوعات جیسے نظریات بمقابلہ ذاتی مفاد عینیتی (Idealists) بمقابلہ حقیقت پسند مختصر مدتی اور طویل مدتی تعلق خاطر اور روایتی و انفرادی تعلق خاطر پر اس کے موقف سے ہے۔ کسی مملکت کی داخلی و بین الاقوامی سرگرمیاں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں چنانچہ ایسے میں قومی مفاد کی تعریف کرنا ایک مشکل امر بن جاتا ہے۔ اس لیے قومی مفاد کو مقصدی (Objective) اور موضوعاتی (Subjective) نکتہ نظر کی آمیزش سمجھا جاتا ہے۔ ہر ملک میں حکومتی فیصلے صرف مٹھی

بھر افراد ہی کرتے ہیں اور یہی فیصلے قومی مفاد سے تعبیر کیے جاتے ہیں چنانچہ Hugh Section Watson نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ''قومی مفاد'' کا تصور تنگ ہے چونکہ حکومتیں خارجہ پالیسی بناتی ہیں قومی مملکتیں نہیں۔ چنانچہ قومی مفاد کی جگہ ''حکومتی مفاد'' کی اصطلاح کو استعمال کیا جانا چاہیے۔لیکن اس دوسری اصطلاح کا استعمال عام نہیں ہے۔ جوزف فرانکل کے مطابق ''قومی مفاد سے مراد قوم کی مجموعی قدریں ہیں''۔ عام معنوں میں قومی مفاد سے مراد وہ عمومی اور جاریہ مقاصد ہیں جن کے مطابق ایک قوم کام کرتی ہے۔لرچ اور سعید (Lerche and Said) کے الفاظ میں'' قومی مفاد عام طویل مدتی اور مسلسل جاری رہنے والا مقصد ہے جسے مملکت، قوم اور حکومت سب ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں''۔ Dyke کے مطابق ''مملکتیں ایک دوسرے سے تعلقات میں جس چیز کو حاصل کرنا اور جس کا تحفظ کرنا چاہتی ہیں وہ قومی مفاد ہے''۔اس میں مقتدر مملکت کی خواہشات بھی شامل ہیں جو ہر ایک کے لیے مختلف ہوتی ہیں۔ اس طرح قومی مفاد کو قومی اقدار اور مقاصد کی مشکل میں دیکھا جاتا ہے۔

قومی مفاد کو قومی بقاء کے معنوں میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ مارگنتھو کے خیال میں کسی بھی قومی مملکت کا مقصد کم از کم اپنی طبعی، سیاسی اور تمدنی شناخت کو دوسری قومی مملکتوں کی مداخلت سے بچانا ہے۔ یہاں طبعی شناخت کے تحفظ سے مراد کسی قوم کی علاقائی یکجہتی ہے۔ سیاسی شناخت کے تحفظ سے مراد موجودہ سیاسی و معاشی حکمرانی کا تحفظ ہے۔ شاہی جمہوری، کمیونسٹ، اشتراکی اور مطلق العنان حکومتیں اپنے نظام حکومت کے تحفظ کو اولین ترجیح دیتی ہیں اور یہی اُن کے لیے قومی مفاد بن جاتا ہے۔اسی طرح تہذیبی شناخت کے تحفظ سے مراد نسلی، مذہبی، لسانی اور تاریخی روایتوں و طریقوں کی پاسبانی ہے۔ مارگنتھو کا کہنا ہے کہ اپنے ان مقاصد کے حصول کے لیے قومی مملکتوں کے حکمران مختلف پالیسیاں جیسے اسلحہ کی مسابقتی دوڑ، توازن طاقت، بیرونی امداد، اتحادات، پھوٹ اور معاشی پروپگنڈہ جنگ وغیرہ کو اپناتی ہیں۔

قومی مفاد کے فرائض اور مقاصد

لرچ اور سعید کے مطابق قومی مفاد کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ پہلے تو یہ خارجہ پالیسی کو بیرونی ماحول کے متعلق ایک عام ذہن عطا کرتا ہے، دوسرے یہ کہ یہ فوری حالات میں انتخاب کی کسوٹی فراہم کرتا ہے۔اس طرح قومی مفاد خارجہ پالیسی میں مملکت کی طویل مدتی کوششوں کی نوعیت کا تعین کرتا ہے اور مختصر مدتی تناظر میں اس کو کیا کرنا چاہیے اس کا بھی تعین ہوتا ہے۔

قومی مفاد ملک کی خارجہ پالیسی میں یکسانیت اور تسلسل کے عنصر کو پیدا کرتا ہے۔ اس طرح قومی مفاد سے ملک کی خارجہ پالیسی کے لیے مستقل بنیادیں فراہم ہوتی ہیں۔ ہر بدلتی صورتحال کے لحاظ سے قومی مفاد بدلتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خارجہ پالیسی بھی بدلتی جاتی ہے۔

قومی مفاد کو متعین کرنے والے عوامل

کسی ملک کے قومی مفاد کو متعین کرنے میں کئی ایک داخلی و خارجی عوامل اہم رول ادا کرتے ہیں۔ جن میں سے اہم یہ ہیں۔

1. خارجہ پالیسی کو بنانے والے افراد کی شخصیت، تصورات و نظریات اور ان کی کارکردگی
2. کسی ملک میں کام کرنے والے سب سے زیادہ طاقتور اور بااثر گروہ کے مفادات اور ان کے تقاضے۔
3. حکومتی ساخت، اس کا بنیادی فلسفہ اور طریقہ کار، شاہی یا جمہوری، مطلق العنان یا آمرانہ حکومت اور اس کا بنیادی فلسفہ جیسے اشتراکی یا لبرل فکر و ذہن وغیرہ اس کے علاوہ پارلیمانی اور صدارتی حکومت کا طریقہ کار بھی قومی مفاد کو بنانے میں نمایاں رول ادا کرتا ہے۔
4. قوم کے تمدنی تصورات، تہذیب و تاریخی ارتقاء، ہندوستان کی پنچ شیل کی پالیسی تہذیبی و تمدنی اثرات کا نتیجہ ہے۔
5. ملک کا سیاسی جغرافیہ اور محل وقوع پڑوسیوں سے تعلقات کی نوعیت اور تاریخ۔
6. بڑی طاقتوں سے تعلقات اور ان کے اثرات۔
7. کسی دیئے گئے وقت میں بین الاقوامی ماحول' عالمی تناظر اور اس کے اثرات

اس میں شک نہیں کہ یہ تمام باتیں کسی ملک کے قومی مفاد کو متعین کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک ملک کا قومی مفاد وقت اور حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس کے عوامل بھی بدلتے رہتے ہیں۔ خصوصاً ملک کی داخلی سیاست میں تبدیلی کا اثر خارجہ پالیسی پر پڑتا ہے اور نئے حکمرانوں کی ترجیحات اور نظریات قومی مفاد کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔

قومی مفاد کی قسمیں

Thomas W.Robinson نے قومی مفاد کی چھ قسمیں بتائی ہیں۔ جو اس طرح ہیں۔

1. ابتدائی مفادات Primary Interests

ان کو بنیادی یا اہم مفادات بھی کہتے ہیں۔ ان میں ملک کی طبعی سیاسی اور تمدنی شناخت

کا تحفظ شامل ہوتا ہے اور مملکت ممکنہ طور پر بیرونی حملوں و دخل اندازی سے اس کو بچانا چاہتی ہے ۔ یہ بنیادی یا اہم اس وجہ سے ہے کہ ان مفادات کو حکومت کسی قیمت پر بھی بچانا چاہتی ہے اور کوئی بھی حکومت ان مفادات سے سمجھوتہ نہیں کرسکتی ۔ اس کے لیے اگر ضروری ہو تو مملکت جنگ سے بھی گریز نہیں کرے گی ۔

2. ثانوی مفادات Secondary Interests

یہ مفاد ابتدائی مفاد کے مقابلے میں ثانوی درجہ رکھتا ہے لیکن بین الاقوامی قبولیت اور بقاء کے لیے اسے اہم ترین مفاد سمجھا جاتا ہے ۔ چنانچہ یہ مفاد بیرونی ممالک میں مقیم اپنے شہریوں کے تحفظ اور اپنے سفارتی عملے (Diplomatic Staff) کے لیے سفارتی مراعات کو حاصل کرنا اور ان کے تحفظ کو یقینی بنانے پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اسے خارجی مفاد بھی کہا جاسکتا ہے ۔

3. مستقل مفادات Permanent Interests

یہ مملکت کے طویل مدتی اور مستقل مفادات ہیں ۔ مستقل مفادات میں کوئی بھی تبدیلی اچانک نہیں ہوتی ۔ ان کی مثال امریکہ کی وہ پالیسیاں ہیں جن کا مقصد اُس کی عالمی برتری کو باقی رکھنا ہے ۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے امریکہ 1991ء میں خلیجی جنگ لڑا اور کویت سے عراق کو نکال باہر کیا۔ نئے عالمی نظام کا تصور اس کے طویل مدتی مفادات کا ایک جز ہے۔ اس طرح برطانیہ گذشتہ چند صدیوں کے دوران سمندروں میں جہاز رانی کی آزادی کے لیے کوشاں رہا ہے تاکہ اُس کی بیرونی نوآبادیات تک تجارت کو یقینی بنایا جاسکے ۔

4. بدلتے مفادات Variable Interests

یہ وہ مفادات ہیں جنہیں بدلتے حالات میں قوم کے لیے فائدہ بخش سمجھا جاتا ہے ۔ اس طرح بدلتے مفادات ابتدائی اور مستقل مفادات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں ۔ ان بدلتے مفادات کا تعین مختلف عوامل جیسے شخصیتوں ، رائے عامہ ، گروہی مفادات ، گروہی سیاست ، سیاسی و اخلاقی اُصولوں اور فوری ضرورتوں سے ہوتا ہے ۔ ملک میں پالیسی ساز شخصیتوں کی تبدیلی سے مفادات تبدیل ہوجاتے ہیں ۔

5. عام مفادات General Interests

ان کا تعلق اُن مثبت حالات سے ہے جن کا اطلاق کئی قوموں پر ہوتا ہے ۔ معیشت، تجارت ، سفارتی تعلقات کے میدانوں میں قوموں کے درمیان خصوصی تعلقات عام مفادات پر

مشتمل ہوتے ہیں۔ مثلاً براعظم یوروپ میں توازن طاقت کو برقرار رکھنا برطانیہ کے عام قومی مفاد (General National Interests) میں تھا۔

6. خصوصی مفادات Specific Interests

وقت اور مقام سے جڑے مفادات خصوصی مفادات کہلاتے ہیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ نے یوروپ میں توازن طاقت کے تحفظ کے لیے نئے ممالک کی آزادی کی برقراری کو خصوصی قومی مفاد قرار دیا تھا۔

ان چھ قومی مفادات کے علاوہ رابنسن کے مطابق مزید تین مفادات ہوتے ہیں جنھیں وہ بین الاقوامی مفادات (International Interests) قرار دیتا ہے۔ جو اس طرح سے ہیں

1. یکساں مفادات Identical Interests

یہ وہ مفادات ہیں جو کئی ممالک میں مشترک پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ اور امریکہ دونوں ہی اس بات میں دلچسپی رکھتے تھے کہ یوروپ میں کسی ایک طاقت کا غلبہ نہ ہونے پائے۔ اس طرح تیسری دنیا کے ممالک مشترکہ طور پر جدید بین الاقوامی معاشی نظام New International Economic Order کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ عرب ممالک کا مشترکہ مفاد فلسطین کا تحفظ رہا ہے۔ ہندوستان کی دولت مشترکہ میں شمولیت اس گروپ کے ممالک کے مفادات سے ہندوستانی مفاد کی ہم آہنگی ہے۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ یکساں مفاد بھی بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ G-15 گروپ سے رکن ممالک کی عدم دلچسپی اس کو ظاہر کرتی ہے۔

2. ایک دوسرے سے جڑے مفادات Complementary Interests

یہ وہ مفادات ہیں جو یکساں نہیں ہوتے لیکن چند خصوصی مسائل پر دوسرے ممالک اور قوموں کے ساتھ ہم آہنگی و سمجھوتے کی بنیاد ہوتے ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر برطانیہ اسپین کے خلاف پرتگال کی آزادی میں دلچسپی رکھتا تھا تاکہ وہ بحراوقیانوس کے علاقہ پر اپنا سکہ جما سکے۔ اُسی طرح پرتگال بھی اسپین کی برتری کو روکنے کے لیے سمندروں پر برطانیہ کی حکمرانی کی تائید میں تھا۔

3. متصادم مفادات Conflicting Interests

عالمی سطح پر مندرجہ بالا مفادات سے ہٹ کر جو مفادات ہوتے ہیں وہ متصادم مفادات کہلاتے ہیں۔ متصادم مفادات متعین نہیں ہوتے بلکہ یہ وقت اور حالات کے لحاظ سے بدلتے

جاتے ہیں ۔ آج کے متصادم مفادات کل ایک دوسرے سے جڑے مفادات بن سکتے ہیں اس طرح ایک دوسرے سے جڑے مفادات اور یکساں مفادات متصادم مفادات میں تبدیل ہوسکتے ہیں چنانچہ گزرتے وقت کے ساتھ قوموں کے مشترکہ اور متصادم مفادات بدلتے جاتے ہیں ۔ان کا تعلق عالمی صورتحال اور ضرورتوں سے ہے ۔

قومی مفاد کو فروغ دینے کے طریقے اور ذرائع

1. سفارتکاری Diplomacy

قوموں کے درمیان تعلقات کو استوار کرنے کے طریقوں اور تکنیک کو سفارتکاری کہتے ہیں ۔ سفارتکاری خارجہ دفاتر' ساری دنیا میں پھیلے سفارت گھروں ،قونصل خانوں اور خصوصی مشن کے ذریعہ کام کرتی ہے ۔ دوملکوں کے درمیان خوشگوار تعلقات اور امن کی برقراری کا انحصار ان کے درمیان کامیاب سفارتکاری پر ہے ۔اگر یہ ناکام ہوتی ہے تو بڑا بحران پیدا ہوتا ہے جو جنگ کی وجہ بھی بن سکتا ہے ۔سفیر سفارتکاری کے فرائض انجام دیتا ہے ۔ وہ دوسرے ممالک میں حکومت کی آنکھ اور کان ہوتا ہے ۔ اُس کا اہم کام دوسرے ممالک میں اپنی حکومت کی پالیسیوں کو روبعمل لانا اور اپنے ملک کے مفادات کا تحفظ کرنا ہوتا ہے ۔اس کے علاوہ وہ اپنے ملک کے شہریوں کے تحفظ کے اقدامات کرتا ہے اور اپنی حکومت کو جس ملک میں وہ سفیر ہوتا ہے وہاں کے حالات سے باخبر رکھتا ہے ۔ دونوں حکومتوں کے درمیان بات چیت اور لین دین کے تعلقات کے لیے اہم ذمہ دار فرد ہوتا ہے ۔دوسرے الفاظ میں وہ دوملکوں کے درمیان رابطہ کار ہوتا ہے۔

2. اتحادات Alliances

مشترکہ مفادات کے تحفظ کے لیے دو یا اس سے زائد ممالک کے درمیان اتحادات ہوتے ہیں ۔ معاہدہ ہونے کے بعد ان مشترکہ مفادات کا تحفظ کرنا معاہدہ کرنے والے ممالک کی ذمہ داری ہوتی ہے اور ممالک متحدہ طور پر ان مفادات کو حاصل کرنے کی جستجو بھی کرتے ہیں۔ معاہدات مختصر مدتی یا طویل مدتی ہوتے ہیں ۔ اس کا انحصار ممالک کے مفادات کی نوعیت اور ان کو حاصل کرنے کی ان کی خواہش پر ہوتا ہے ۔

3. پروپگنڈہ Propaganda

قومی مفاد کے حصول کے لیے پروپگنڈہ ایک اہم ترین ہتھیار ہے ۔ پرپگنڈہ اپنے

مفادات کے حصول کے لیے دوسرے ممالک پر دباؤ کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ممالک پروپگنڈہ کے لیے خصوصی ایجنسیوں کو قائم کرتے ہیں۔ خصوصاً قومی ریڈیو اور ٹیلی ویژن اس میں نمایاں کام انجام دیتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سرد جنگ کے دوران دونوں عظیم طاقتیں امریکہ اور سویت یونین ایک دوسرے کے خلاف پروپگنڈہ کو بطور ہتھیار استعمال کیے۔ خصوصاً مخالف ممالک ایک دوسرے کے خلاف پروپگنڈہ کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ پروپگنڈہ وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعہ ممالک اپنے مفادات و مقاصد اور خارجہ پالیسی کی تشہیر کرتے ہے۔ پروپگنڈہ کے ذریعہ رائے عامہ کو ہموار کرتے ہوئے مفاد کو حاصل کرنیکی کوشش کی جاتی ہے۔ دشمن گروہ میں پھوٹ ڈالنے' کمزور کرنے اور اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لئے پرپگنڈہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

4. نفسیاتی و سیاسی جنگ

نفسیاتی و سیاسی جنگ ممالک کے درمیان چلنے والی سرد جنگ کا دوسرا نام ہے۔ نفسیاتی جنگ کو سابق امریکی صدر آئیزن ہوور (Eisenhower) نے ''انسانی دماغوں کے لیے جدوجہد'' قرار دیا ہے۔ سیاسی معاشی اور فوجی اقدام کو آگے بڑھانے کے لیے نفسیاتی طریقوں و اُصولوں کا استعمال نفسیاتی جنگ ہے۔ دشمن کے خلاف مخالف پروپگنڈہ کے ذریعہ اُسے نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے فوجی معاشی و سیاسی اقدامات بھی کیے جاتے ہیں جس سے دشمن کو نقصان پہنچتا ہو۔

سیاسی جنگ میں عملی جنگ (Actual War) سے ہٹ کر تمام اقدامات کیے جاتے ہیں۔ جن کا مقصد دشمن کو کمزور کرنا ہوتا ہے۔ ایسی ڈپلومیسی اور پروپگنڈہ جس کے ذریعہ دشمن کو نقصان پہنچتا ہو سیاسی جنگ ہے۔ ہر سیاسی فیصلہ یا اقدام سیاسی جنگ نہیں ہے بلکہ اس سے حاصل ہونے والا مقصد اُسے سیاسی جنگ بناتا ہے۔

5. معاشی طریقے Economic Methods

ایک مملکت اپنے قومی مفادات کو حاصل کرنے کے لیے کئی پالیسیاں اپناتی ہے۔ اگر کوئی مملکت اپنے عوام کی معاشی فلاح و بہبود کے لیے کوئی پالیسی اپناتی ہے تو یہ بات الگ ہے لیکن اگر اس کی معاشی پالیسیوں کا مقصد دوسرے کی معیشت اور قومی مفاد کو نقصان پہنچانا ہو تو اس سے ایک الگ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ بین الاقوامی نظام میں ہر مملکت دوسرے سے الگ

اور آزاد ہوتی ہے اس لیے اُسے اپنی مرضی کی پالیسیوں کو اپنانے کا اختیار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف مملکتیں دوسروں کی پالیسیوں کے دباؤ اور اثرات کو قبول بھی کرتے ہیں۔ قومی مفاد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی پالیسی اپنائی جاتی ہے تو یہ قومی مفاد کو حاصل کرنے کا ایک معاشی آلہ ہوتی ہے۔

6. سامراجیت اور نوآبادیت Imperialism and Colonialism

گذشتہ صدیوں کے دوران یوروپی اقوام نے اپنے قومی مفاد کو حاصل کرنے کے لیے ان پالیسیوں کو اپنایا تھا۔ سولہویں صدی سے مختلف یوروپی اقوام نے نئے علاقوں پر اپنی حکمرانی کے قیام کو اپنا قومی مقصد بنالیا تھا اور اس کے لیے اُن کے درمیان رسہ کشی بھی ہوتی رہی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کو کمیونسٹ سامراجیت اور مغربی سامراجیت کا خطرہ تھا۔ مغربی سامراج سے آزاد ممالک جدید نوآبادیت کے شکنجے میں جکڑے گئے۔ اس طرح نوآبادیت ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک دوسری شکل میں سامنے آئی۔ خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک اس کا شکار رہے ہیں۔

7. جبری طریقے اور جنگ Coercive Methods and War

ایک مملکت اپنی حفاظت اور سلامتی اور علاقے کے تحفظ کے لیے جبری اقدامات بھی کرسکتی ہے۔ چنانچہ غیر اخلاقی ہونے کے باوجود یہ قومی مفاد کے حصول کے لیے خارجہ پالیسی کا ایک حصہ اور تسلسل ہی ہوتی ہے۔ دشمن ملک اور اُس کے عوام کی جائیداد کو ضبط کرتے ہوئے ایک ملک اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ بعض مرتبہ اپنی سلامتی کے لیے اپنے سمندری حدود میں بلا اجازت گھس آنے والے جہازوں کو ضبط کرتا ہے یا فضائی حدود میں دخل اندازی پر جہازوں کو مار گرایا جاتا ہے۔ ضرورت ہوتو کیے گئے معاہدات کو منسوخ بھی کیا جاسکتا ہے۔ جدید دور میں بڑی طاقتیں قومی مفاد کے حصول کے لیے فوجی آپریشنس بھی کررہی ہیں۔ بمباری اور فوجی مداخلت جبرو دباؤ کے دوسرے طریقے ہیں۔



حصہ دوم

جدید بین الاقوامی تاریخ

Recent International History

باب 7

سامراجیت اور نوآبادیت
Imperialism and Colonialism

19 ویں صدی صنعتی ترقی ، سیاسی قوم پرستی ، معاشی ترقی 'بین الاقوامیت اور سامراجیت کا ایک عجیب امتزاج تھی۔ کسی نہ کسی شکل میں سامراجیت ہزاروں سالوں سے رہی ہے۔ لیکن 1870اور 1914ء کے درمیان نوآبادیت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اگرچیکہ اس دور میں سامراجیت کی کئی شکلیں تھیں جو آج بھی ہیں لیکن عوامی دماغوں میں نوآبادیت کی شناخت صرف 19 ویں صدی سے ہی ہوئی۔ نوآبادیت کی کئی وجوہات ہیں۔ معاشی وجوہات کے علاوہ نوآبادیت اور سامراجیت کی وجوہات کا پتہ چلانے کے یے ضروری ہے کہ ہم 19 ویں صدی سے قبل تاریخ کا جائزہ لیں۔

یہ موضوع بین الاقوامی تعلقات کو سمجھنے کے لیے کم از کم تین وجوہات کی بناء پر ضروری او راہم ہے۔ پہلے یہ کہ اقوام متحدہ کی سرگرمیوں پر اس کے اہم اثرات ہیں۔ دوسرے یہ کہ لاکھوں صنعتی طور پر پسماندہ عوام کے مستقبل کا تعین ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ عوامل اور اہم طاقتور ممالک جیسے ہندوستان ، انڈونیشیاء اور چین اس کے ساتھ ہی لاطینی امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کے کئی ممالک کے بین الاقوامی امور کے رجحانات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ عوام جو پہلے نوآبادیت کے تحت تھے اب آزاد رہنے اور کسی بھی قیمت پر کسی بھی طاقت کے زیر اثر نہ آنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یوروپین اور امریکن کے متعلق عوام کے احساسات مشکوک ہیں۔ صدیوں سے یوروپین ایشیاء میں نوآبادی حکمراں رہے ہیں۔ نوآبادیت دراصل سامراجیت کا کھلا مظاہرہ ہے اور سامراجیت کو ایک بڑی مدت تک قوم کی خصوصیت کہا جاتا رہا ہے۔

تعریف

اگر نوآبادیت سامراجیت کا مظاہرہ ہے تو پھر سامراجیت کی تعریف کیا ہوگی ؟ مختلف لوگوں نے مختلف نکتۂ نظر سے اس کی تعریف کی ہے۔ مارکس کے مطابق سامراجیت سرمایہ دا ریت کی ایک ناگزیر حالت ہے۔ سامراجیت کی وسیع تعریف یہ ہے کہ سامراجیت ایک مملکت قوم یا عوام کا دوسرے عوام قوم یا مملکت پر سیاسی معاشی راست یا بالواسطہ کنٹرول یا حکومت ہے۔

اس طرح اس تعریف کے مطابق انسانی نسل کا ایک بڑا حصہ سامراجیت ہی کا عکاس ہے۔ یہ تصور اتنا وسیع ہے کہ اسمیں تمام فتوحات' قبضہ جات شامل ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے الفاظ میں ایک عوام کا دوسرے عوام پر طاقت کے ذریعہ اپنے نسلی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی اثرات کے نقوش کو چھوڑنے کی کوشش سامراجیت ہے۔قوم پرستی دراصل اس کا خاصہ ہے جب طاقت کا کھلا استعمال نہ ہوتا ہوتو سامراجی سرگرمیوں اوراسی طرح کی دوسری غیرسامراجی سرگرمیوں میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ پروپگنڈہ کوموجودہ اداروں کی اہمیت کوکم کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔کسی مملکت میں بیرونی وابستگیاں بھی وہ مثال ہے جن سے سامراجیت کوسمجھنے میں مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بعض مرتبہ یہ سامراجی اور بعض مرتبہ غیرسامراجی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ طاقتور حکومت کمزور حکومت کو معاشی قوت کے ذریعہ اس پر اثر انداز ہونے کے لیے قرضہ بھی دیتی ہے۔ اس طرح طاقت کی سیاست کا کھیل کھیلنے والی مملکتیں کئی سامراجی حربے استعمال کرسکتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر قرضہ سامراجیت کی ہی ایک شکل ہوتا ہے بلکہ یہ ایک عوامی طور پر منتخبہ جمہوری حکومت کو معاشی ترقی بڑھانے اور پیداوار میں اضافے کا عامل بن سکتا ہے۔

مقاصد Motives

سامراجیت کے پیچھے کئی ایک مقاصد کارفرما ہوتے ہیں اور اس کے مقاصد اورعوامل کا تعین کرنا مشکل ہے۔ اکثر مصنفین، کمیونسٹ اور غیرکمیونسٹ دونوں کوبھی سامراجیت کی معاشی تعبیر دکھائی دیتی ہے۔اس صدی کے نصف حصے میں اکثر مصنفین نے سامراجیت کے پیچھے معاشی عوامل کواہمیت دی ہے۔ غیرکمیونسٹ اگرچیکہ معاشی وجوہات کو اہم سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے وجوہات کواس کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ **J.A.Hobson** نے زائد اورکم صرفہ معاشی سرگرمیوں کے نظریات کوسامراجیت سے جوڑ دیا ہے۔ چنانچہ تجارت اور معاشی سرگرمیوں کا بین قومی لین دین اس کی مثال ہے۔خصوصاً یوروپی ممالک اپنی زائد پیداوار کی کھپت اورنئی معاشی منڈیوں کی تلاش میں ہی نوآبادیاتی نظام کو رائج کیئے۔ زائد آبادی، قومی وقار، ومعاشی قوم پرستی اورحفاظت خوداختیاری دراصل پوری سامراجیت کےعوامل تھے۔

جدید سامراجیت اور نوآبادیت کے حامی ''گورے آدمی کا بوجھ'' کی اصطلاحوں میں اپنے مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنے آپ کوحق بجانب قرار دیتے رہے ہیں اور وہ اپنے لیے معقول ذرائع بھی یہ کہتے ہوئے تلاش کرتے رہے کہ ترقی یافتہ قوموں کا یہ فرض ہے کہ وہ

پسماندہ قوموں کو مہذب بننے میں مدد دیں۔ اس کے برعکس اس کے مخالفین سامراجیت اور نوآبادیت کے مقابلے میں دوسری ہی زبان استعمال کرتے ہوئے اسے جنگ، دہشت پسندی، استعمار اور نفرت قرار دیتے رہے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ سلطنت کی توسیع اور جد و جہد سلطنت کو وسیع اور وسیع بناتی ہے۔ اس کے باوجود قوموں کی حرص نہیں مٹتی اور اس طرح اس کے کوئی حدود نہیں ہوتے۔ سامراجیت اور نوآبادیت کو قومی پالیسی کے ایک آلے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

سامراجیت کیا ہے ؟

سامراجیت کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ چونکہ مختلف لوگوں کے لیے اس کے مختلف معنی ہیں۔ Mortiz Julius Brown کے مطابق "سامراجیت وہ پالیسی ہے جس کا مقصد ایک سلطنت کو پیدا کرنا، منظّم کرنا اور چلانا ہوتا ہے اور یہ سلطنت وسیع رقبہ ہوتی ہے جس میں مختلف کم و بیش قومی اکائیاں ہوتی ہیں اور جو کہ ایک واحد مرکزی طاقت کے تابع ہوتی ہیں" Parker.T.Moon کے الفاظ میں "سامراجیت کا مطلب غیر یوروپی مقامی نسلوں پر بالکلیہ الگ یوروپی اقوام کا غلبہ ہے" Charles A.Beard کے الفاظ میں "سامراجیت حکومت اور سفارتکاری کے ذریعہ علاقوں، رقبوں اور دائرہ اثر میں اضافہ ہے۔ عموماً دوسری نسل یا عوام صنعتی تجارت اور سرمایہ کاری کے مواقع کو فروغ دینے کے لیے قابض ہوتے ہیں"۔ ان تعریفوں سے ظاہر ہے کہ Brown چھوٹی سامراجیت کے امکانات کو مسترد کرتے ہوئے ایک مقداری پیمانہ بتایا ہے۔ جب کہ Beard نے تمام کو مسترد کرتے ہوئے سوائے معاشی مقاصد کے اس نے حکومتی اقدامات کو سامراجیت کا ایک ناقابل علاحدہ حصہ بنادیا۔ جب کہ Moon نسلی اختلافات کو سامراجیت کا حصہ بنادیا ہے۔ مارگنتھو اور لینن وغیرہ نے سامراجیت کی چند زائد شرائط بھی بتائے ہیں۔ چنانچہ مارگنتھو نے سامراجیت کو مملکت کی طاقت کی اپنے سرحدات سے باہر وسعت قرار دیا ہے۔ اس طرح وہ سامراجیت کو توسیع پسندی کہتا ہے۔ جب کہ لینن نے سامراجیت کو بین الاقوامی سرمایہ داریت کی ترقی کا ایک مرحلہ اور مقام قرار دیا ہے۔ ان تمام تعریفات کی روشنی میں سامراجیت کی کوئی ایک تعریف پر پہنچنا مشکل ہے۔ لیکن چند کارآمد مشاہدات کو بتایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ پہلے یہ کہ سامراجیت ایک انتہائی موضوعاتی لفظ ہے۔ جس کی مصنفین نے اپنی مرضی کے مطابق تعریف کی ہے۔ دوسرے یہ کہ سامراجیت کسی بھی دوسری چیز سے زیادہ پرانا لفظ بن

گیا ہے۔ روسی مغربی مملکتوں کی پالیسیوں کی مذمت کے لیے اس لفظ کو استعمال کئے ہیں۔ تیسرے یہ اس لفظ کے عام استعمال میں موقتی شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا جاسکتا۔ سامراجیت کا مقصد پروفیسر Hodys کے الفاظ میں پسماندہ عوام کے مقدر کو زیادہ ترقی یافتہ کے مفاد میں متاثر کرنا ہے۔ عالمی قوت کے نقطہ نظر سے معاشی اور تہذیبی سامراجیت دو مختلف قسم کی سامراجیت دکھائی دیتی ہیں۔ اگر چیکہ انھیں بہرصورت سامراجیت ہی کہا جاسکتا ہے۔ بیرونی تجارت اور بیرونی سرمایہ ہر جگہ ہے اور بہت سی مملکتوں کی تہذیب کے چند پہلو دوسری مملکتوں میں اپنا مقام حاصل کرلیتے ہیں۔ یہ تمام چند اثرات کو ظاہر کرتے ہیں۔ لہذا سامراجیت کو محض اثرات ہی سمجھا جائے تو یہ لفظ تقریباً بے معنی ہوگا۔

سامراجیت کے عام مقاصد

1.معاشی فوائد Economic Benefits

اس میں فتح میں ہونے والی لوٹ مار بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ آزاد مارکٹ اور خام مال کے وسائل کا سرمایہ داروں کے لیے سرمایہ مشغول کرنے زمین کی تلاش وغیرہ بھی شامل ہے۔سامراجیت کا ابتدائی پہلو معاشی پہلو ہی ہے۔ خام مال کی تلاش بیروزگار آبادی کے لیے نئے روزگار کے مواقع اور پیداوار کی کھپت یہ وہ ضرورت تھی جس کی وجہ سے یوروپی قوموں کو توسیعت پسندی کے لیے ایشیاء اور آفریقہ کی طرف رخ کرنا پڑا۔

2.قومی وقار National Prestige

سامراجیت کی مدافعت کرنے والوں کا خیال ہے کہ مملکت کو اقتدار اور قومی وقار میں اضافے کے لیے توسیعت پسند ہونا ضروری ہے۔ انگریزوں کی کئی نسلیں اس بات پر فخر کرتی تھیں کہ سلطنت برطانیہ میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ مسولینی آفریقی صحراء اور پہاڑی زمین ان تمام علاقوں پر اپنا ہاتھ پھیرنا چاہتا تھا جنہیں وہ اپنی توسیعت کے ذریعہ اطالوی جھنڈے کے تحت لایا تھا۔اس غلبہ نے اس کے فخر میں اضافہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ آج امریکی بھی اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کا اقتدار بیرون ملک بھی ہے۔ اسی وجہ سے بین الاقوامی فورم میں ان کا رویہ اور عمل دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔

3.'گورے آدمی کا بوجھ' White man's Burden

ماضی میں جدید مغربی سماج کے کئی اراکین یہ سمجھتے تھے کہ انکی مملکت کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ

وہ اپنے مذہب اور تہذیب کو "پسماندہ عوام تک لے جائیں"۔ ان کے خیال میں گورے آدمی کا یہ فریضہ ہے کہ وہ بدقسمت، ایشیاء اور آفریقہ کے کالے و رنگ دار لوگوں کی ترقی کے لیے کام کریں۔ ان میں سے اکثر لوگ مخلص تھے۔ جنھوں نے مشنریوں کے ذریعہ خدمت خلق انجام دیا۔ برطانوی سامراجیت کے شاعر Rudyard Kipling نے سفید آدمی کے بوجھ کے نظریے کو آگے بڑھایا۔

4. قومی دفاع National Defence

سامراجیت سے کئی طرح سے قومی دفاع کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے۔ ملک کے دفاع کے لیے علاقہ اور اڈے، ضروری مارکٹ اور خام مال، فوج اور مزدوری کے لیے آبادی فراہم کرتے ہوئے قومی دفاع کے مقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مملکتیں اپنے آپ بچاؤ کے لیے سرحدی علاقوں کے کنٹرول یا مکمل طور پر اپنے علاقوں کو ماتحتی میں لیتے ہوئے یا برائے نام آزاد ممالک (جنھیں Buffer State کہتے ہیں) کے ذریعہ اپنی حفاظت کے انتظامات کرتے ہیں۔ اس طرح کے انتظامات دشمن کو اپنی سرحدات سے بہت دور رکھنے اور اپنی دفاعی تنصیبات کی حفاظت کے لیے کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ برطانیہ نے روس سے ہندوستان کی حفاظت کے لئے افغانستان ایران اور تبت جیسے Buffer State پر بھی انحصار کیا تھا۔ خام مال پر قبضہ کے ساتھ ہی معاشی اور فوجی فوائد حاصل ہوتے ہیں چنانچہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض مملکتیں تیل اور دوسرے خام مال کے لیے اپنے نوآبادیاتی وسائل پر انحصار کرتے ہیں اور چند اہم پیداوار سامراجیت کے پھیلاؤ میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مملکتیں جن شکتی (Man Power) کے لیے بھی نوآبادیات پر انحصار کرتی ہیں۔

5. خاص آبادی Specific Population

مدبّرین سامراجیت کی تائید کرتے رہے ہیں۔ چونکہ اس سے تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل کو حل کرنے کا موقع ملا تھا۔ کئی یوروپی ممالک کی آبادیاں نوآبادیوں میں منتقل ہوگئیں۔ خصوصاً برطانوی آبادی بڑی تعداد میں اپنی نوآبادیوں میں منتقل ہوگئی۔ 1925ء اور 1933ء کے درمیان جب جاپان چین پر اپنے منصوبے کو حق بجانب قرار دے رہا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کی آبادی ان علاقوں کو ہجرت کرچکی تھی۔

مارکسسٹ لینینسٹ نظریہ Marxist Leninist theory

سامراجیت کے متعلق مارکسی اپنا الگ نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ اسے سرمایہ داریت کی توسیعت پسندی کا ایک طریقہ بتاتے ہیں۔ اس طرح Leninist اور سامراجیوں کے درمیان

گہرے اختلافات ہیں جو کہ سرمایہ داریت کی موروثی غیر مساوات کے متعلق ہے۔ لینن کا نظریہ سامراجیت اس مفروضہ پر قایم ہے کہ تمام سیاسی اقدار معاشی اقدامات کے تحت ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں جب سرمایہ دارانہ سماج یہ محسوس کرتا ہے کہ پیداوار اس نقطہ پر پہنچ گئی ہے جہاں پر مناسب بازار نہیں مل سکتا تو وہ باہر کے علاقوں کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنی سیاسی قوت کو استعمال کرتے ہیں تا کہ فاضل پیداوار اور سرمایہ کو مشغول کر سکیں۔ اس طرح سرمایہ داریت خود سامراجیت کی وجہ ہے۔ جب کہ چند مارکسٹوں کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ مملکتیں تقریباً کم و بیش اپنے انتخاب کے ذریعہ سامراجیت کی طرف بڑھتی ہیں۔ جب کہ لینن کے خیال میں سرمایہ داریت کا جذبہ خود سامراجیت ہے۔

سامراجیت کے معاشی نظریات

سامراجیت کا معاشی نظریہ اس نظریہ پر مشتمل ہے کہ تمام سیاسی اقدامات معاشی قوتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ چنانچہ سامراجیت کا سیاسی واقعہ اپنے معاشی نظام کی پیداورا ہوتا ہے اور یہ معاشی نظام سرمایہ داریت کا ہے۔ مارکسٹ نظریئے کے مطابق سرمایہ دارانہ سماج کو اپنی پیداوار کے لیے موزوں مارکٹ اور اپنے سرمایہ کے لیے موزوں **Investments** اپنے علاقہ میں نہیں ملتے اس لیے وہ غیر سرمایہ دارانہ علاقوں کی تلاش میں نکلتے ہیں اور ان کو اپنے علاقوں میں شامل کر لیتے ہیں۔ اعتدال پسند مارکسی یہ سمجھتے ہیں کہ سامراجیت کی پالیسی ایک انتخاب **(Choice)** کی پالیسی ہے جسے سرمایہ دار حالات کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف **Lenin** اور اس کے حامی سامراجیت کو سرمایہ داریت کی ہی ایک شکل سمجھتے ہیں۔ سرمایہ داریت کی آخری شکل اجارہ داری **(Monopoly)** ہے اور سامراجیت اس کے مساوی ہے۔

مارکس کے نظریئے میں سرمایہ داریت اصل برائی ہے اور سامراجیت لازماً ایک مظاہرہ ہے۔ اس کے برعکس لبرل مکتب خیال کے حامیوں کے ایک اہم نمائندہ **J.A.Hobson** کے مطابق لوگ سامراجیت کو ہی اصل برائی قرار دیتے ہیں اور اسے سرمایہ دارانہ نظام کی چند غلط کاریوں کی وجہ سمجھتے ہیں۔ مارکسزم کے ساتھ مل کر لبرل مکتب سامراجیت کی جڑوں کی تشخیص کرتے ہیں اور اسے زائد پیداوار سرمایہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن **Hobson** کے خیال میں سامراجی توسیعت نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی یہ کوئی معقول طریقہ ہے۔ فاضلات کی نکاسی کا طریقہ دراصل نتیجہ ہے قوت خرید کی غلط تقسیم کا۔ چنانچہ معاشی اصلاحات کے ذریعہ گھریلو مارکٹ میں

اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح داخلی متبادل طریقہ سامراجیت کی جگہ لے سکتا ہے اور سامراجیت کے متعلق مارکٹ اور لبرل نقطہ نظر میں یہی فرق ہے۔ سامراجیت کا شیطانی (Devil) نظریہ ان دونوں نظریات سے زیادہ کم دانشورانہ ہے اور یہ نظریہ قنوطیت پسندوں کا نظریہ ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نظریہ Nye Committee کا سرکاری فلسفہ ہے جس نے 36-1934 میں امریکی سینٹ کی جانب سے پہلی جنگ عظیم میں امریکی مداخلت کے معاشی اور صنعتی مفادات کی تحقیق کی تھی۔ اس کمیٹی کی کاروائی Devil Theory کے طور پر مشہور ہوئی۔ یہ نظریہ ان چند گروہوں کی نشاندہی کرتا ہے جن کو جنگ سے فائدہ ہوتا ہے۔ جیسے اسلحہ ساز، بین الاقوامی بینکر، Wall Street وغیرہ۔ چونکہ جنگ سے فائدہ پہنچتا ہے اس لیے وہ جنگ سے دلچسپی رکھتے ہیں اس طرح جنگ سے فائدہ حاصل کرنے والے لڑائی خور بن جاتے ہیں۔ اور یہی وہ شیطان ہوتے ہیں جو اپنے فائدے کے لیے جنگ کے منصوبے بناتے ہیں۔

سامراجیت کی قسمیں Kinds of Imperialism

سامراجیت کی حقیقی شکل جوں کی توں حالت (Statusquo) کو ختم کرنے کی پالیسی ہے۔ چنانچہ اسے بہتر طور پر واضح کیا جاسکتا ہے۔ اسکی حسبِ ذیل قسمیں ہیں۔

1. فاتح جنگ Victorious War

جب ایک قوم دوسری قوم سے جنگ میں مصروف ہوتی ہے تو وہ قوم جو کامیابی کی امید رکھتی ہے یہ سوچے بغیر کہ جنگ کے آغاز کے وقت اس کے مقاصد کیا تھے۔ ایک ایسی پالیسی اپناتی ہے جس سے ہارنے والے دشمن کے ساتھ طاقت کے تعلقات میں مستقل تبدیلی آتی ہے۔ اس بدلی ہوئی پالیسی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فاتح اور مفتوح کے تعلقات کو بدلا جائے تاکہ امن سمجھوتوں سے نیا Statusquo پیدا ہوسکے۔ اس طرح وہ جنگ جو فاتح کی جانب سے ایک مدافعتی جنگ کے طور پر شروع کی گئی تھی اپنے Statusquo اور طاقت کے قیام کے لیے فتح کے ساتھ ہی یہ جنگ ایک سامراجی جنگ میں بدل جاتی ہے اور یہ Statusquo میں مستقل تبدیلی کے لیے ہوتا ہے۔

2. ہاری ہوئی جنگ Lost War

یہ وہ صورتحال ہوتی ہے جہاں پر ہاری ہوئی قوم اپنے Statusquo اور اپنی طاقت کو گنوا چکی ہوتی ہے اور اس سے جیتی ہوئی قوم کے Statusquo میں اضافہ ہوتا ہے اور طاقت کا توازن اس کی طرف ہوتا ہے۔ اس طرح جیتی ہوئی قوم کی سامراجی پالیسی دراصل سامراجیت کا

مظاہرہ ہے اور اگر جیتی ہوئی قوم کی طاقت مستحکم نہ ہوتو ہاری ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کرنا چاہے گی بلکہ ممکن ہوسکا تو اس سے کچھ زیادہ ہی۔ اس کی مثال جرمنی کی ہے جو کہ پہلی جنگ عظیم میں ہار چکا تھا لیکن 1935ء سے دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ تک جیتی ہوئی قوموں کی سامراجیت کے خلاف سامراجیت سے کام لیا۔

3. کمزوری Weakness

کمزور مملکتیں سامراجی پالیسیوں کی تائید کرتی ہیں اور یہ کمزور مملکتیں ہمیشہ طاقتور مملکتوں کے لیے ایک کشش رکھتی ہیں۔ یہ وہ حال ہے جس سے نوآبادیت و سامراجیت بڑھتی ہے۔ نپولین اور ہٹلر کی سامراجیت جزوی طور پر اسی خصوصیت کی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری مرحلے کے دوران اور اس کے بعد کے دہے میں طاقتور اور کمزور قوموں کے درمیان تعلقات بڑھتی ہوئی سامراجیت ہی تھی۔ خصوصاً طاقت کے خلاء کو پر کرنے کے لئے جب بڑی قومیں آگے بڑھتی ہیں تو اس سے چھوٹی قوموں کو نقصان پہنچتا ہے اور بڑی قوموں کا یہ اقدام سامراجی اقدام ہوتا ہے۔

سامراجیت کے تین مقاصد

چونکہ سامراجیت تین خصوصی صورتوں میں آگے بڑھتی ہے اس لیے سامراجیت تین خصوصی مقاصد کی طرف آگے بڑھتی ہے۔ اس کے تین اہم مقاصد ہوتے ہیں۔ چنانچہ سامراجیت کا مقصد سیاسی طور پر منظّم قبضہ ہوسکتا ہے، یعنی عالمی سلطنت یا براعظمی سلطنت یا جغرافیائی طور پر محدود علاقائی کنٹرول حاصل کرنا ہوتا ہے۔

1. عالمی سلطنت World Empire

غیرمحدود سامراجیت کی نمایاں تاریخی مثالیں سکندر اعظم، روم، 17 ویں اور 18 ویں صدی میں عرب، نپولین اول اور ہٹلر وغیرہ کی توسیعت پسندانہ پالیسیاں ہیں۔ یہ سب مشترکہ طور پر غیرمعقول حدود کے توسیعت پسند تھے اور یہ اس وقت تک آگے بڑھتے ہی گئے جب تک کہ انہیں روکنے والی کوئی برتر حکومت سامنے نہ آئی۔ اقتدار کے لیے ان کی ہوس اس وقت تک ختم نہیں ہوئی جب تک کہ ان کے لیے چیلنج ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس طرح یہ غیرمحدود سامراجیت عالمی سلطنت کے خواب دیکھتی رہی۔

2. براعظمی سلطنت Continental Empire

جغرافیائی طور پر متعین سامراجیت کا مظاہرہ یوروپین کی پالیسی سے ہوتا ہے جو براعظم

یوروپ میں برتر مقام کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کی گئی تھیں۔ لوئیس چہاردہم، نپولین اور ولیم دوم اس کی مثالیں ہیں۔ 1850ء میں جزیرہ نما اٹلی پر Cavour کی برتری' 13-1912 بلقان کی جنگوں میں شرکت کنندہ جو بلقان میں اپنی حکمرانی چاہتے تھے' مسولینی جس نے بحیرہ روم کو اطالوی جھیل بنانا چاہا تھا کی مثالیں جغرافیائی سامراجیت کی ہیں جو اپنے براعظم میں ایک مخصوص جغرافیائی خطہ پر اپنی برتری کے لیے کوشش کیے تھے۔

3. علاقائی برتری Regional Supremacy

علاقائی سامراجیت کا اظہار 18 ویں اور 19 ویں صدی کی شاہی پالیسیوں سے ہوتا ہے 18 ویں صدی میں فریڈرک اعظم، لوئیس ۱۵، ماریہ تھریسیا، پیٹر اعظم اور کیتھرائین دوم اس طرح کی خارجہ پالیسی کی متحرک قوتیں تھیں۔ 19 ویں صدی میں بسمارک اس طرح کی خارجہ پالیسی کا ماہر تھا جس نے Statusquo کو ختم کرتے ہوئے اپنے دائرے میں سیاسی برتری قائم کرنا چاہتا تھا۔ فن لینڈ، مشرقی یوروپ، بلقان، ایران، افغانستان وغیرہ پر کنٹرول روسی سامراجیت کے علاقائی مقاصد کو ظاہر کرتی تھی۔ حالیہ عرصہ میں خلیج فارس (Persian Gulf) پر کنٹرول کے لئے ایران اور عراق کی جدوجہد علاقائی برتری کی خواہش کو ظاہر کرتی ہے۔

سامراجیت کے تین طریقے

سامراجیت کے تین طریقے ہیں چنانچہ ہمیں فوجی، معاشی اور تہذیبی سامراجیت میں فرق کرنا چاہیئے۔ سامراجیت کے مقاصد کے لحاظ سے معاشی سامراجیت کا مقصد دوسرے عوام کا معاشی استحصال ہوتا ہے۔ یہ غلط فہمی سامراجیت کے معاشی نظریات بین الاقوامی تعلقات میں طاقت کے عنصر کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فوجی سامراجیت کا مقصد فوجی فتح، معاشی سامراجیت کا مقصد معاشی استحصال، تہذیبی سامراجیت کا مقصد ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے بدلنا ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے اور وہ ہے Statusquo کو ختم کرنا۔

1. فوجی سامراجیت Military Imperialism

سب سے قدیم واضح اور سامراجیت کی بہتر شکل فوجی حملوں کی ہے۔ ہر زمانے کے عظیم فاتح عظیم سامراجی رہے ہیں۔ سامراجی قوم کے نقطۂ نظر سے اس طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ فوجی فتوحات سے پیدا ہونے والے نئے طاقت کے رشتوں کو صرف ایک دوسری جنگ سے ہی

بدلا جاسکتا ہے۔ نپولین اول یوروپ اور دنیا میں فرانس کے اقتدار کو قائم کرنے کے لیے ہوسکتا ہے کہ صرف انقلاب فرانس کے تصورات پر ہی بھروسہ کیا ہو۔ یعنی اس نے فوجی فتوحات کے بجائے تہذیبی سامراجیت چنا تھا ہوگا۔ دوسری طرف اگر وہ فوجی فتوحات کا راستہ اپنایا ہوتا تو اس کے سامراجی مقاصد بڑی تیزی سے پورے ہوتے اور اسے شخصی تشفی حاصل ہوتی۔

وہ قوم جو سامراجی مقاصد کے لیے جنگ کو شروع کرتی ہے اسے جیت سکتی ہے، باقی رکھ سکتی ہے۔ جیسا کہ روم نے کیا۔یا مزید دوسرے علاقوں کو حاصل کرنے کی کوششوں میں حاصل شدہ علاقوں کو بھی کھوسکتی ہے۔ جیسا کہ نپولین کے ساتھ ہوا۔ یا یہ جنگ جیت یا ہار سکتی ہے اور بعد میں دوسرے کی سامراجیت کا شکار ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ جرمن اور جاپان کے ساتھ ہوا چنانچہ فوجی سامراجیت ایک جوا ہے۔

2.معاشی سامراجیت Economic Imperialism

معاشی سامراجیت ، فوجی سامراجیت کی بہ نسبت کم اثر انداز ہے اور یہ جدید دور کی پیداورا ہے۔ یہ سرمایہ داریت کی دین ہے۔ اس کی اہم مثال'' ڈالر سامراجیت'' ہے۔ معاشی سامراجیت نے برطانیہ اور فرانسیسی سامراجیت کی تاریخ میں ایک اہم رول ادا کیا۔ 18 ویں صدی کی ابتداء سے پرتگال میں برطانیہ کے اثرات نے معاشی کنٹرول کو مستحکم کیا۔عرب دنیا میں برطانیہ کی برتری معاشی پالیسیوں کا نتیجہ تھی۔ معاشی سامراجیت کی عام خصوصیات اس کے رجحانات ہیں۔ چنانچہ طاقت کے تعلقات کو بدلتے ہوئے Statusquo کو ختم کردیتی ہے اور اس کے لیےفوجی نہیں بلکہ معاشی کنٹرول قائم کرنے کے لیے اس علاقہ پر کنٹرول رکھنے والوں پر کنٹرول قائم کرتی ہے۔ وسطی امریکی جمہورتیں اگرچیکہ آزاد اور اقتدار اعلیٰ کی حامل ہیں لیکن ان کی معاشی زندگی امریکی درآمدات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ یہ ممالک کوئی بھی ایسی داخلی یا خارجی پالیسی اپنا نہیں سکتے جس سے امریکہ کو اعتراض ہوتا ہو۔ معاشی سامراجیت ایک بالواسطہ سامراجی طریقہ ہے۔

3.تہذیبی سامراجیت Cultural Imperialism

تہذیبی سامراجیت بہت ہی نازک اور کامیاب طریقہ سامراجیت ہے۔ اس میں نہ تو علاقے فتح کیے جاتے ہیں اور نہ معاشی زندگی پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس میں دماغوں کو فتح کیا جاتا ہے۔دوقوموں کے درمیان تعلقات کو بدلنے کے لیے ثقافت سیاسی نظریات وغیرہ تہذیبی

سامراجیت کے تحت خود بخود بدل جاتے ہیں اور برتر قوم اپنی تہذیب، ثقافت اور سیاسی نظریات کو دوسری قوموں پر لاگو کرتی ہے۔اس طرح تہذیبی سامراجیت کی بنیادیں فوجی اور معاشی سامراجیت سے زیادہ گہری و مضبوط ہوتی ہیں۔

نوآبادیت Colonialism

نوآبادیت کا عروج و زوال جدید تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔اٹھارویں اور اُنیسویں صدیاں یوروپی نوآبادیت کے استحکام اوران کے درمیان سامراجی رقابتوں کی صدیاں تھیں تو بیسویں صدی نوآبادیت کے خاتمے کی صدی تھی۔نو آزاد قومیں جو ایشیاء، آفریقہ اور لاطینی امریکہ میں پھیلی ہوئی ہیں تیسری دنیا کے طور پر اُبھریں اور اب ان ممالک کو آزادی٬ معاشی ترقی، قومی یکجہتی اور سب سے بڑھ کر جدید نوآبادیت کے چیلنجوں کا سامنا ہے۔عموماً نوآبادیت (Colonialism)اور سامراجیت (Imperialism) کو ہم ایک ہی معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں۔لیکن درحقیقت یہ الگ معنیٰ و مطالب کے الفاظ ہیں۔نوآبادی دراصل وہ آبادی ہوتی ہے جو کسی بڑی اکائی سے دور مقام پر آباد ہوتی ہے۔اس طرح نوآبادی مہاجرین کی آبادی ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ یہ آبادی ایک نئی مملکت کی شکل بھی اختیار کرسکتی ہے۔لیکن اس نئی مملکت کے عوام اپنے ابتدائی وطن سے جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس سامراجیت کے معنی کمزور عوام پر طاقتور عوام کی حکومت اور غلبہ ہوتا ہے اور اس میں ہجرت کا کوئی عنصر شامل نہیں ہوتا۔ لیکن جدید دور میں برطانیہ، فرانس، ولندیزی، پرتگالی اور اسپینی سلطنتوں کے عروج اور وسعت نے نوآبادیت اور سامراجیت Imperialism کو ایک دوسرے کے ہم معنیٰ الفاظ بنادیا ہے۔یہ سلطنتیں فوجی فتوحات کی وجہ سے نہیں بلکہ سماجی اور معاشی استحصال اور سیاسی غلبہ کے ذریعہ وجود میں آئیں تھیں۔ اس طرح نوآبادیاتی رشتہ اس وقت وجود میں آیا جب یوروپی اقوام جغرافیائی بیرونی سیاسی اکائیوں پر سیاسی غلبہ قائم کئے اور سیاسی انتظام اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

عہد وسطیٰ رومی سلطنت کے انتشار اور یورپ میں سیاسی نزاع کے عہد سے تعبیر ہے۔ تیرہویں صدی میں بڑی قومی مملکتوں کے آغاز نے تہذیب کے نئے دور کا آغاز کیا۔جس میں مارکو پولو (Marcopolo) جیسے مہم بازوں نے نئے راستوں کی تلاش میں دنیا کے چکر کاٹے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ یوروپ چینی، ہندوستانی، منگولیائی یا ترکی سلطنتوں سے برتر نہیں تھا۔لیکن اس کے باوجود مسالحے، ریشم اور سونے سے مالا مال مشرق کی عظمت جب بحراحمر کے راستے یوروپ

کو پہنچی تو پندرہویں اور سولہویں صدی میں یوروپ کے صنعتی انقلاب نے ایشیائی سلطنتوں پر یوروپ کی برتری کو قایم کردیا اور جدید برتر اسلحہ اور سمندری طاقت کے ذریعہ یوروپی اقوام نئے نئے علاقوں کو دریافت اور ان پر اپنا غلبہ قائم کرنے لگے۔ اس عمل میں تجارت نے ایک اہم رول ادا کیا۔ پرتگالی اور ولندیزی تجارتی اجارہ داری کے ذریعہ سیاسی غلبہ قائم کرنے لگے۔ اسپین امریکہ کو دریافت کیا تو فرانس اور برطانیہ ان ہی راستوں کے ذریعہ مشرق اور مغرب میں پہنچ گئے۔ اس طرح ساری دنیا پر ''گورے آدمی'' کا غلبہ ہوگیا۔

سترہویں صدی عیسوی میں یوروپین اقوام امریکہ کی نئی دنیا کو ہجرت کرنے لگے جہاں پرگنجان آبادی نہیں تھی۔ اس طرح اس علاقے میں کئی نوآبادیات قائم ہوگئیں۔ یہ نوآبادیات اپنے مادر وطن سے روحانی رشتے کو برقرار رکھتے ہوئے نوآبادیوں کو اپنے وطن سے دور مادر وطن کا ایک حصہ سمجھنے لگیں۔ چنانچہ جدید برطانیہ (امریکہ)، جدید فرانس (کناڈا)، جدید اسپین (میکسیکو) کہلانے لگے۔ مشرق ... ہندوستان اور ملیشیاء کے ممالک میں چارٹر کمپنیوں کے ذریعہ اعلیٰ منافع کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کر لیے۔ بالآخر سیاسی مفاد پرستی کیساتھ مقامی آبادیوں کا سیاسی استحصال کئے اور سیاسی غلبہ حاصل کر لئے۔ اس طرح مشرق و مغرب میں سامراجی نظام قائم ہوگیا۔ لیکن بہت جلد اٹھارویں ... میں سامراجی طاقتیں آپس میں لڑنے لگیں۔ برطانیہ کے ہاتھ سے امریکہ نکل گیا۔ نپولینی جنگوں کے بعد فرانس سے سمندر پار کے علاقے ہاتھ سے نکل گئے۔ ولندیزی سلطنت ختم ہوگئی اور اسپین کے ہاتھ سے جنوبی امریکہ چلا گیا۔

اُنیسویں صدی میں یوروپی ٹکنالوجی میں مزید ترقی ہوئی۔ برتر قسم کے اسلحہ تیار کیے گئے۔ بھانپ کے انجن نے فاصلوں کو کم کردیئے۔ استوائی بیماریوں سے لڑنے کے لیے ادویات ایجاد ہوئیں اور سب سے بڑھ کر یورپ میں صنعتی انقلاب نے نئے منڈیوں کی تلاش کے عمل کو تیز کردیا۔ چنانچہ فاضل پیداوار کی کھپت کے لیے نئی منڈیوں کی تلاش، بیروزگار آبادی کے لیے روزگار کے مواقع کی جستجو اور صنعتی پیداوار کے لیے خام مال کی ضرورت نے یوروپی اقوام کو نئے نئے علاقوں کی تلاش اور ان پر اپنا غلبہ حاصل کرنے کے لیے مجبور کیا۔ سرمایہ دارانہ توسیعت، قوم پرستی اور قومی عظمت کی خواہش نے نہ صرف ایشیاء، آفریقہ اور لاطینی امریکہ کے دور دراز علاقوں پر نوآبادیاتی تسلط قائم کیا بلکہ اس کے لیے نوآبادیاتی طاقتوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں، جس کی مثال ہندوستان میں فرانس اور برطانیہ کے درمیان کشمکش، مراقش (Morocco) پر برطانیہ اور

جرمنی کا تنازعہ، سوڈان پر فرانس اور برطانیہ کی لڑائی اور کانگو پر فرانس اور جرمنی کی جدوجہد ہے۔ جس کے نتیجے میں ساری دنیا نوآبادیاتی طاقتوں کے ہاتھوں منقسم ہوگئی۔ آج کالونی کا مطلب امریکہ، کناڈا اور آسٹریلیا کی طرح یوروپ کے باہر یوروپ کی آبادی نہیں رہا۔ بلکہ اب نو آبادیات کا مطلب ایشیاء، آفریقہ اور لاطینی امریکہ کے وہ ممالک ہیں جو سامراجی استحصال کا شکار سامراجی چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہندوستان کو برطانوی سلطنت میں ضم کرلیا گیا اور چین کا بھی انضمام تقریباً ہوچکا تھا۔ جاپان اپنے نظام میں مغربی تبدیلیاں لاتے ہوئے اپنے آپ کو اس چنگل سے بچالیا تھا۔

ایشیاء آفریقہ اور لاطینی امریکہ میں یوروپی نوآبادیاتی طاقتیں

اسپین سب سے قدیم نوآبادی طاقت تھا اور سب سے پہلے اس کی نوآبادیات ختم ہوگئیں۔ 1492ء میں کرِسٹوفر کولمبس نے اسپین کے لیے امریکہ دریافت کیا تھا اور اسی سال اسپین کا اتحاد بھی عمل میں آیا۔ سولہویں صدی کے پہلے نصف عہد میں اسپین ایک برتر طاقت بن گیا۔ اس دور میں میکسیکو، پیرو (Peru)، ویسٹ انڈیز اور جنوبی امریکہ کا ایک بڑا حصہ اسپین کے قبضے میں چلا گیا۔ Megallan دنیا کے اطراف چکر کاٹتے ہوئے فلپائن دریافت کیا۔ آفریقہ سے غلاموں کو خرید کر اسپین کی نوآبادیات میں ان سے جبری محنت لی جانے لگی۔ لیکن ہند آفریقی نسلوں کے آپسی تعلق سے ایک نئی نسل "Creoles" پیدا ہوئی۔ انکے معاشی اور سیاسی انحصار نے اُن میں بغاوت کا جذبہ پیدا کیا' جسے دبایا نہیں جاسکتا تھا۔ فرانسیسی انقلاب نے ان میں آزادی کی نئی خواہش پیدا کی۔ چنانچہ 1830ء تک کیوبا اور فلپائن کے سوا تمام اسپینی آبادیات کے لیے آزادی کی ضمانت دی گئی۔ کیوبا اور فلپائن کے لیے 1898ء میں امریکہ اور اسپین کے درمیان جنگ ہوئی۔ جس میں امریکہ کو کیوبا حاصل ہوگیا بعد میں اسپین آفریقہ کے مغربی ساحل تک ہی محدود رہ گیا۔

پرتگالی سلطنت The Portuguese Empire

کولمبس ایشیاء دریافت کرنے کی کوشش میں امریکہ دریافت کیا اور پرتگالی ہندوستانی راستے کی تلاش میں جنوبی امریکہ میں برازیل پہنچ گئے۔ جہاں پر انہیں فرانسیسیوں اور ولندیزیوں سے جنگ کے بعد برازیل پر اپنی برتری قائم کرنی پڑی۔ پرتگال نے برازیل کو افریقی مہاجروں سے بھر دیا۔ اس طرح گوروں، نیگروں (Negroes) اور ہندوستانیوں سے ملکر ایک متحدہ برازیلی نسل

پیدا ہوگئی۔ 1888ء میں برازیل جمہوریہ بنا اور پرتگال سے لسانی اور تہذیبی تعلقات کو جاری رکھا۔

چودھویں صدی کی ابتداء میں بحرِ ہند اور مشرقِ بعید کی سمندری تجارت پر عرب ملاحوں کی اجارہ داری تھی۔ 1498ء میں پرتگالی ملاح واسکوڈی گاما آفریقہ کا طویل چکر کاٹتے ہوئے ہندوستانی ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ عرب اجارہ داری کے کمزور پڑتے ہی بحرِ ہند پر پرتگالیوں نے اپنا قبضہ جمالیا اور ہندوستانی ساحل کے اطراف اپنے تجارتی مراکز قائم کرلیے، گوا ہندوستان میں پرتگالی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ جہاں سے تجارتی سامان جمع کر کے Lisban بھیجا جاتا تھا اور وہاں سے تجارتی سامان یوروپی ممالک کو بھیجا جاتا تھا۔ لیکن 1580ء میں پرتگال پر اسپین کے شاہ فلپ دوم کے قبضے کے بعد Lisban سے یوروپ کو ایشیاء کی سربراہی بند ہوگئی۔ ملیشیاء پرتگالیوں کے قبضے سے نکل کر ولندیزیوں کے قبضے میں چلا گیا لیکن اس کے باوجود آفریقہ کے ساحل پر پرتگالیوں ہی کا قبضہ رہا اور انگولا اور موزمبیق (Mozambique) پرتگالی کالونیاں بنیں۔ اس کے علاوہ گیانا کے جزائر پر پرتگالیوں نے قبضہ جمالیا۔ ایشیاء میں گوا 'دیو' تیمور اور مکاؤ پرتگالی نوآبادیاں تھیں۔

برطانوی سلطنت The British Empire

سولہویں صدی عیسوی میں ملکہ الزبتھ اول کے عہد میں برطانیہ ایک سمندری طاقت بنا۔ صنعتی انقلاب نے برطانیہ کو یورپ کا ترقی یافتہ ملک بنادیا تھا اور برطانیہ دوسرے معنوں میں دنیا کا کارخانہ (Workshop of the world) بن گیا۔ 1600ء میں مشرق کے ممالک اور خصوصاً ہندوستان سے تجارت کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی گئی۔ جو مشرق اور ہندوستان سے ریشم اور مسالحوں کی تجارت کرتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ دیسی حکمرانوں کی کمزوریوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سیاسی استحصال کا موقع دیا اور اس طرح دیسی ریاستوں کے حکومتی معاملات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل اس قدر بڑھ گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا۔ 1763ء میں معاہدہ پیرس کے ذریعہ برطانیہ کو کناڈا حاصل ہوگیا۔ اس کے علاوہ براعظم آفریقہ میں برطانوی سامراج کے پھیلاؤ میں عیسائی مشنریوں نے ایک اہم رول ادا کیا۔ چنانچہ کینیا، یوگینڈا، گھانا، نائجیریا، مصر، سوڈان، صومالیہ، جنوبی آفریقہ اور رہوڈیشیاء پر برطانیہ کو غلبہ حاصل ہوا۔ برطانوی سامراج کو آفریقہ میں ولندیزیوں سے مقابلہ آرائی کرنی پڑی جس میں وہ کامیاب ہوگئے۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں جنوبی آفریقہ، کینڈا، آسٹریلیا اور نیوزی

لینڈ کو Dominion کا درجہ دیا گیا۔ لیکن ایشیاء اور آفریقہ کے کئی ممالک میں برطانیہ کا سامراجی دور جاری رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد مجلس اقوام کے انتدابی نظام کے تحت برطانیہ کو ترک (Turkey) اور جرمن نوآبادیات حاصل ہوگئیں۔ اس طرح برطانیہ کے اقتدار کا سورج پورے آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا اور برطانیہ کو ایک برتر موقف حاصل ہوگیا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کی طاقت کمزور پڑگئی اور نوآبادیاتی نظام کے خاتمے نے برطانیہ کی سامراجی حیثیت کو ختم کردیا' برطانوی نوآبادیات رفتہ رفتہ آزاد ہونے لگیں اور گذشتہ صدی کا چھٹا دہا نوآبادیت کے خاتمے کا دہا ثابت ہوا۔

فرانسیسی سلطنت The French Empire

نوآبادیت کے ابتدائی دور میں فرانس امریکہ اور کینڈا میں اپنی نوآبادیاں قائم کیا۔ ہندوستان کے مشرق میں فرانس نے کئی تجارتی کمپنیاں قائم کیں۔ چنانچہ مداغاسکر میں ایک کمپنی کا مرکز قائم کیا گیا۔ ویسٹ انڈیز فرانسیسی نوآبادی فرانس کے لیے خوشحالی لائی۔ تمباکو اور گنے کی کاشت کے لیے آفریقہ سے غلاموں کی تجارت کی گئی۔ بحر ہند میں پانڈیچری ہندوستان میں فرانسیسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ Louis پندرہ کے عہد میں لڑی گئی یوروپی جنگوں نے ہندوستان اور کینڈا کی نوآبادیات کو فرانس کے قبضے سے چھین لیا۔ اس کے علاوہ انقلابِ فرانس نے بھی نوآبادیات میں آزادی کی جدوجہد پیدا کردی۔ 1805ء میں ٹرافلگر (Trafulgar) میں فرانس کی شکست سے سمندروں پر سے فرانس کا قبضہ ختم ہوگیا اور کئی فرانسیسی نوآبادیاں برطانیہ کے قبضے میں چلی گئیں۔ سینٹ ڈومنک جمہوریہ بنا اور 1815ء تک فرانس مشکل سے ہی نوآبادی طاقت تھا۔

معاہدہ ویانا کی رو سے فرانس کو آفریقہ میں چند علاقے مل گئے اور خلیج بنگال میں فرانس کو پانڈیچری کے بشمول پانچ علاقے حاصل ہوگئے۔ 1830ء میں الجیریا فرانس کی کالونی بنا اور 1859ء تک الجیریا مکمل فرانس کے قبضے میں چلا گیا۔ 1850ء سے پہلے ہی Tahiti اور Ivory Coast پر فرانس کا قبضہ ہوا۔ 1859ء میں ہند چین کا علاقہ فرانسیسی نوآبادیاتی علاقہ بن گیا اور کمبوڈیا میں فرانسیسی حکومت قائم ہوگئی۔ 1870ء سے 1940ء کے دوران فرانس کی تیسری جمہوریہ نے فرانس کے نوآبادیاتی مفادات کو آگے بڑھایا اور 1881ء میں تیونس پر قبضے کے بعد اسے سرمایہ دارانہ تجارت کا مرکز بنایا گیا۔ فرانس کی آفریقی نوآبادیات کا ایک وسیع بلاک قائم کیا گیا۔ 1912ء میں مراقش، فرانسیسی نوآبادیات کا حصہ بنا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت ترکی

کے علاقوں شام اور لبنان اور جرمن علاقوں ٹوگو (Togo) اور کیمرون (Cameroon) کو انتدابی نظام کے تحت فرانس کے قبضے میں دیا گیا۔ 1939ء تک اس طرح فرانس برطانیہ کے بعد دوسری بڑی نوآبادیاتی طاقت بنا۔

نوآبادیت کے عروج کی وجوہات

نوآبادیت کی ایک نمایاں خصوصیت اقوام اور عوام میں عدم مساوات کو فروغ دینا تھا۔ نوآبادیاتی طاقتوں نے مفادات کے لیے سماجی، معاشی سیاسی اور نظریاتی استحصال کیا۔ اور نوآبادیاتی نظریئے کو مذہبی روپ دیا گیا۔ عیسائیت کا فروغ بھی نوآبادیت کے عروج کا ایک ذریعہ بنا۔ مذہبی پیشواؤں کے علاوہ حکمرانوں نے بھی مذہبی تبلیغ کے لیے نوآبادیت میں مبلغین کو روانہ کیے تھے۔ اس کے علاوہ یوروپ میں اصلاحی تحریکوں اور جمہوریت کے فروغ نے نوآبادیت کے ارتقاء میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ داریت کے ارتقاء نے یوروپ سے ایشیاء، آفریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام میں یوروپی سامراجیت کی مضبوط بنیادیں کھڑی کردیں۔ اس طرح نوآبادیات کی بنیادی وجہ معاشی تھی۔ تاریخی طور پر تیرہویں اور چودہویں صدی میں جاگیردارانہ نظام کے خاتمے نے سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ دیا۔ تجارت میں وسعت کے ساتھ ہی یوروپ کے حکمرانوں نے سونے اور چاندی کے لیے نئے راستوں کی تلاش میں مہمات کی سرپرستی کی اور خصوصاً ایسی مہمات نئے مشرقی راستوں کے لیے تھیں۔ کولمبس مغرب کی طرف سفر کیا تو واسکوڈی گاما براعظم آفریقہ کا چکر کاٹتے ہوئے 1498ء میں کالی کٹ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس طرح سمندری راستے دریافت کرلیے گئے۔ ان نئے راستوں نے مشرقی تجارت پر Venice کی اجارہ داری ختم کردی اور اس سے ترکی پر انحصار ختم ہوگیا۔ بحر اوقیانوس نئی گذرگاہ بنا۔ پرتگال، اسپین، ہالینڈ، انگلینڈ اور فرانس تجارتی طاقتیں بنیں اور اب بین الاقوامی تجارت صرف یوروپی تجارت نہیں رہی۔ مارکٹ کے پھیلاؤ سے معاشی سرگرمیوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور اپنی پیداوار کو فروخت کرنے کے نئے مواقع ہاتھ آئے۔ اس طرح خام مال کے حصول کے نئے وسائل بھی پیدا ہوئے۔ ان نئی سرگرمیوں اور دولت کی ریل پیل سے سولہویں صدی اور سترہویں صدی میں جوائنٹ اسٹاک کمپنی کا آغاز ہوا۔ ان کمپنیوں نے اپنے حصص کے فروغ کے ذریعہ سرمایہ کو جمع کیا اور اس کے ذریعہ سمندری مہمات منظم کیے۔ ان کمپنیوں میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ کمپنی برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی۔ ان کمپنیوں نے تجارت سے

متعلق کئی رعایتیں حاصل کیں اور تجارت پر اپنی اجارہ داری کی وجہ سے بے پناہ منافع کمایا۔ اس طرح جمع شدہ سرمایہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں صنعتوں میں وسیع پھیلاؤ کے لیے استعمال کیا گیا۔ اپنے منافع کے لیے ان کمپنیوں نے اپنی پسند کا توازن تجارت کا نظریہ اپنایا اور درآمدات و برآمدات کے فرق کی قیمت کو سونے اور چاندی جیسی قیمتی دھاتوں کی شکل میں حاصل کیا گیا۔ اس طرح یہ کمپنیاں نوآبادیات کا معاشی استحصال جاری رکھیں۔

نوآبادیات کو ایسے اشیاء کی تیاری سے باز رکھا گیا جس کا نوآبادیات کی معیشت پر اثر پڑسکتا تھا۔ مثال کے طور پر امریکی نوآبادیات میں ٹوپیوں (Hat)، لوہے کی اشیاء اور اونی اشیاء کی تیاری کو ممنوع قرار دیا گیا۔ بلکہ ان نوآبادیات سے خام مال برطانیہ بھیجا جاتا تھا اور تیار شدہ اشیاء نوآبادیات کو برآمد کی جاتی تھیں۔ اس طریقے کو تمام نوآبادی طاقتوں نے استعمال کیا۔

اس کے علاوہ نوآبادی طاقتوں نے اپنی نوآبادیات میں نسلی امتیازات کی پالیسی کے ذریعہ سماجی تفریق کی دیواریں کھڑی کیں اور اپنی برتری کو مقامی عوام پر قائم کرتے ہوئے ان کا ذہنی ونظریاتی استحصال کیا۔ اس طرح اپنی تعلیم، زبان، تہذیب کو اپنی نوآبادیات میں عام کرتے ہوئے مقامی تہذیب اور تمدن کو ختم کرنے اور نوآبادیات کو اپنی ہی زمین کے توسیع شدہ حصے کے طور پر فروغ دینے کی کوشش کیے۔ اس کے علاوہ نوآبادی طاقتوں نے نوآبادیات پر اپنے غلبہ کو حاصل کرنے کے لئے بالواسطہ حکمرانی کے طریقے استعمال کیے۔ جس میں وہ دیسی حکمرانوں کے توسط سے مقامی باشندوں پر حکومت کرنے لگے۔ اسکے علاوہ نوآبادی طاقتوں نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے مقامی عوام میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے ہتھکنڈے استعمال کیے اور اپنی نوآبادیات پر حکومت کرتے رہے۔

بیسویں صدی کے وسط میں دوسری جنگ عظیم کے بعد رفتہ رفتہ نوآبادیت کا خاتمہ ہونے لگا۔ بالآخر گذشتہ صدی کے چھٹے دہے تک ایشیاء آفریقہ اور لاطینی امریکہ کی نوآبادیات آزاد ہوگئیں۔ نوآبادیت کی آخری نشانی نامیبیاء بھی اب آزاد ہوچکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سابقہ نوآبادیات آج بھی جدید نوآبادیت (Neo-Colonialism) کے ہتھکنڈوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ باب پندرہ میں اس امر پر تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

☆☆☆

باب 8

پہلی جنگ عظیم- وجوہات اور اثرات
The First World War-Causes and Impact

بیسویں صدی کی عالمی جنگیں عالمی انسانی تاریخ کا ایک اہم ترین باب ہیں۔ چنانچہ 1914ء تا 1918ء تک لڑی گئی پہلی جنگ عظیم انسانی تباہی اور اثرات کے لحاظ سے حقیقی معنوں میں ایک مکمل اور عالمی جنگ تھی۔ گذشتہ صدی کی ابتداء میں یوروپ کے ممالک کی نوآبادیاتی دوڑ کی وجہ سے یوروپ کی بڑی طاقتوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ علاقوں تک رسائی اور ان پر قبضے کے لیے رسہ کشی جاری تھی۔ عالمی نوآبادیاتی نظام میں برطانیہ اور فرانس کا حصہ بہت زیادہ تھا جبکہ جرمنی اور اٹلی کی نوآبادیات بہت تھوڑی تھیں جس کے نتیجے میں جرمنی برطانیہ اور فرانس سے مسابقت کرنے لگا۔ اس طرح یوروپی اقوام کے درمیان نفسیاتی جنگ کا آغاز ہوگیا۔ پہلی جنگ عظیم کی کئی وجوہات ہیں جن کا ذیل میں مختصراً جائزہ لیا جائے گا۔

جنگ کی وجوہات

1. خفیہ معاہدات Secret Alliances

خفیہ معاہدت کو پہلی عالمی جنگ کی ایک اہم وجہ سمجھا جاتا ہے۔ 1870ء میں جرمنی کے اتحاد کے بعد بسمارک (Bismarck) نے جرمنی کو ایک طاقتور قوم بنادیا۔ 1870ء میں فرانس کو شکست دے کر 1871ء میں فرانس کے علاقے Alsace Lorraine کو اپنے قبضے میں کرلیا اور فرانس کے انتقامی حملوں سے بچنے کے لیے 1879ء میں یوروپ کی ایک دوسری بڑی طاقت آسٹریا۔ ہنگری سے اتحاد کیا۔ 1882ء میں اس اتحاد میں اٹلی شامل ہوگیا اور بسمارک کی کوششوں کے نتیجے میں فرانس اور روس ایک دوسرے کے قریب نہ آنے پائے۔ جرمنی، آسٹریا ہنگری اور اٹلی کا یہ تکونی محاذ اتحاد ثلاثہ (Triple Alliance) کہلاتا ہے۔

دوسری طرف برطانیہ عظمیٰ بھی عالمی علاحدگی سے نکلتے ہوئے 1902ء میں جاپان سے خفیہ معاہدہ کرلیا، 1904ء میں اس معاہدہ میں فرانس شامل ہوگیا اور 1907ء میں روس بھی اس معاہدہ میں شامل ہوگیا۔ جاپان کو چھوڑ کر اس معاہدہ کی تین طاقتیں یوروپی تھیں اس لیے اسے اتحاد سہ گانہ (Triple Entent) کہتے ہیں۔ اس طرح یوروپ دو محاذی خیموں میں تقسیم ہوا ایک

کیمپ میں جرمنی، آسٹریا ہنگری، اٹلی اور ترکی تھے تو دوسرے کیمپ میں جاپان، برطانیہ فرانس اور روس شامل تھے۔ ان دو کیمپوں کے درمیان حسد اور دشمنی تھی جس کے نتیجے میں پہلی جنگ عظیم ہوئی۔

2. فوجی تیاریاں Militarism

پہلی عالمی جنگ کی ایک اہم وجہ یوروپ کی جنگی تیاریاں تھیں۔ یوروپ کی تمام بڑی طاقتوں جیسے برطانیہ، فرانس، جرمنی، آسٹریا ہنگری، اٹلی اور ترکی وغیرہ کی فوجی و بحری طاقت میں سال بہ سال اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اگرچیکہ یہ تیاریاں دفاع امن اور سلامتی کے نام پر کی جارہی تھیں، لیکن ان کے نتیجے میں ان ممالک کے درمیان خوف، بدگمانی اور مسابقت کا ماحول پیدا ہوا جس سے تناؤ اور کشیدگی بڑھی۔ خصوصاً برطانیہ و جرمنی کے درمیان بحری طاقت میں اضافہ کے لیے مسابقت ہونے لگی۔ جرمنی کی جانب سے بنائے جانے والے ہر ایک بحری جنگی جہاز کے جواب میں برطانیہ دو جہاز تیار کرنے لگا۔ ایسی مسابقت کے نتیجے میں جنگ لازمی ہوتی ہے۔ 1914ء سے جرمن افواج کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوگیا تھا کہ جرمنی کے متعلق کہا جاتا تھا کہ ''جرمنی ایک ملک نہیں ہے جس کی ایک فوج ہے بلکہ جرمنی ایک فوج ہے جس کا ایک ملک ہے''۔

3. قوم پرستی Nationalism

قوم پرستی اور وطن پرستی کو پہلی عالمی جنگ کی ایک اور وجہ سمجھا جاتا ہے۔ اپنے ملک سے محبت اور دوسرے ملک سے نفرت و دشمنی کے نتیجے میں دو قوموں کے درمیان کشیدگی اور جنگ کا ماحول بنتا ہے۔ جرمن عوام میں جرمنی سے محبت اور فرانس سے نفرت کا جذبہ شدید تھا۔ اسی طرح سربیا (Serbia) کی سخت قوم پرستی اور آسٹریا ہنگری سے نفرت و دشمنی کے نتیجے میں آسٹریا ہنگری کے ولیعہد آرچ ڈیوک فرڈینڈ کا 1914ء میں قتل ہوا جو پہلی عالمی جنگ کی فوری وجہ ثابت ہوئی۔ یوروپ میں قوم پرستانہ جذبات کے نتیجے میں 1789ء سے 1914ء تک 54 جنگیں یا بغاوتیں ہوئیں۔

4. سامراجیت Imperialism

صنعتی ترقی کے نتیجے میں یوروپی اقوام کے درمیان نئی منڈیوں کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ ہونے لگی۔ تیز صنعتی ترقی اور صنعتی پیداوار کی بہتات نے ممالک کو نئے علاقوں کی کھوج کے لیے مجبور کیا۔ چنانچہ برطانیہ، فرانس اور جرمنی کے درمیان مسابقت بہت زیادہ

تھی۔ جب جرمنی برطانیہ کی منڈیوں میں رسائی حاصل کرنے لگا تو اس سے برطانیہ و جرمنی کے درمیان تناؤ اور کشیدگی کا ماحول پیدا ہوا۔ جب کہ برطانیہ جرمنی کے حق میں اپنی منڈیوں سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ممالک کے درمیان یہ سامراجی دوڑ جنگ کا باعث بنی۔

5. رائے عامہ Public Opinion

پہلی جنگ عظیم کی ایک اور وجہ اخبارات کی جانب سے رائے عامہ کو پراگندہ کیا جانا تھا۔ تمام ممالک میں اخبارات نے دوسرے ممالک کی غلط تصویر کشی کے ذریعہ اپنے ملک کے عوام میں قومی جذبات کو خوب اچھالا اور اُسے ہوا دی۔ دو ممالک کے اخبارات کسی ایک مسئلہ کو لیتے اس کو خوب ہوا دیتے اور اپنی مبالغہ آرائیوں کے ذریعہ حالات میں کشیدگی پیدا کردیتے، یہاں تک کہ اخبارات میں جنگ کی کیفیت پیدا ہوجاتی۔ بعض مرتبہ کسی مسئلہ کے متعلق اتنی غلط تصویر پیش کرتے کہ اس کی وجہ سے حکومتوں کو معذرت خواہی کرلینا پڑتا تھا۔

6. ولیم قیصر دوم کا کردار

پہلی عالمی جنگ کی ایک اور وجہ جرمنی کے حکمران ولیم قیصر دوم کا کردار ہے۔ وہ ایک جذباتی اور پرجوش حکمران تھا۔ وہ جرمنی کو دنیا کی طاقتور ترین قوم بنانا چاہتا تھا۔ وہ ''عالمی طاقت یا زوال'' کی پالیسی میں یقین رکھتا تھا اور بین الاقوامی امور میں کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھا۔ انگریزوں کے متعلق وہ غلط فہمی کا شکار تھا اور سمجھتا تھا کہ انگریز کمزور ہیں اور لڑنے کے بجائے جرمنی کے تمام مطالبات کو قبول کرلیں گے۔ برقراری امن کی برطانوی خواہش اس کی بزدلی یا کمزوری کی وجہ سے نہیں تھی۔ اس طرح ولیم قیصر دوم کی غلط فہمی کی وجہ سے جرمنی برطانیہ کے خلاف جارحانہ پالیسی رکھتا تھا۔

7. السک لورین کا مسئلہ

فرانس کے عوام جرمنی سے السک لورین (Alsace-lorraine) کی واپسی چاہتے تھے جسے 1871ء کی جنگ میں جرمنی فرانس سے چھین لیا تھا۔ فرانس کی تیسری جمہوریہ (Third Republic) کی حکومت اس مسئلہ کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ یا کسر باقی نہیں چھوڑی اور فرانسیسی عوام میں انتقام کا جذبہ پیدا کی۔ معاشی طور پر السک لورین کے معدنی وسائل سے محرومی فرانسیسی عوام کے دلوں میں انتقام کا جذبہ پیدا کردی اور وہ سمجھنے لگے تھے کہ جرمنی کی معاشی ترقی کی وجہ السک لورین کے معدنی وسائل اور ذخائر ہیں' چنانچہ انھیں دوبارہ واپس حاصل کرلینا

چاہیئے تاکہ اپنے وسائل کے استعمال سے وہ معاشی طور پر طاقتور بن سکیں۔

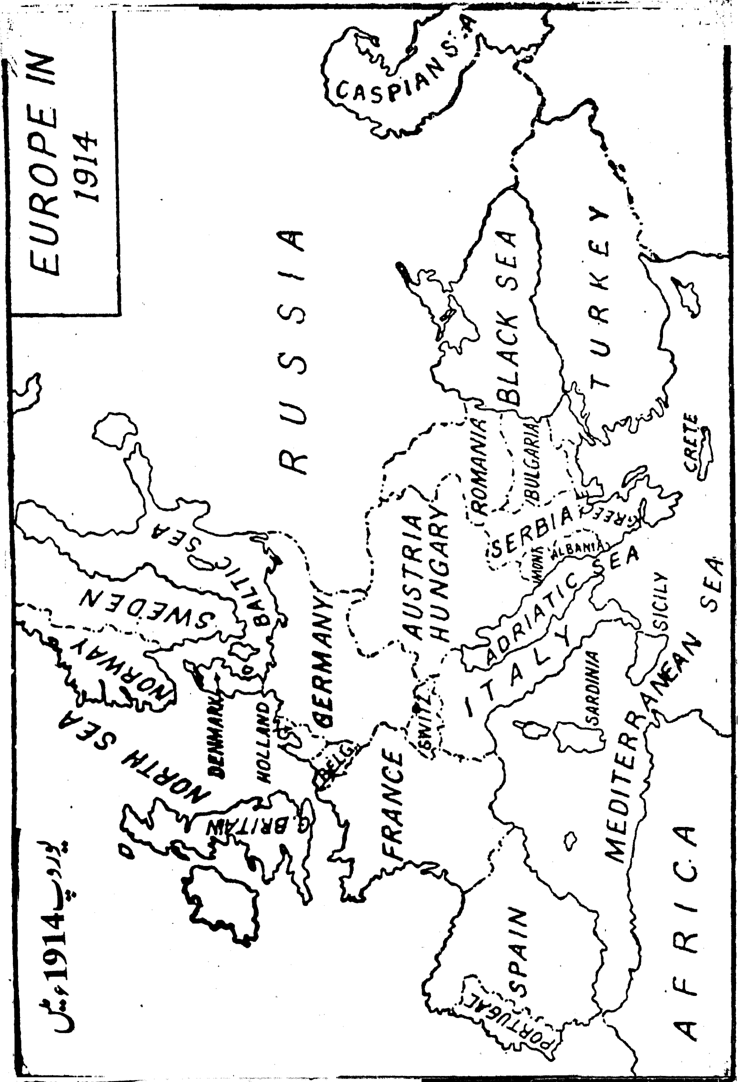
8. بوسنیا اور ہرزی گووینا کا مسئلہ

یوسنیا اور ہرزی گووینا کا مسئلہ بلقان کا ایک اہم سلگتا مسئلہ تھا۔ 1878ء کی برلن کانگریس نے ان دوصوبوں کو آسٹریا ہنگری کے حوالے کیا تھا۔لیکن آسٹریا ہنگری کو ان صوبوں پر اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں تھا بلکہ وہ محض ایک نگرانکار منتظم کے طور پر ان صوبوں کے لیے ذمہ دار تھا۔ ان پر ترکی کے حکمران کا اقتدار اعلی تھا۔لیکن 1908ء میں آسٹریا ہنگری نے یکطرفہ اقدام کے ذریعہ ان صوبوں کے الحاق کا اعلان کردیا۔جس کے خلاف سربیا میں عوام کا سخت احتجاجی ردعمل سامنے آیا اور عوام آسٹریا ہنگری سے ان علاقوں کو حاصل کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ دوسری طرف بوسنیا ہرزی گووینا کے عوام آسٹریا ہنگری اور سربیا دونوں ہی سے آزادی چاہتے تھے۔لیکن آزادی کے لیے وہ سربیا سے مدد کے خواہاں تھے۔ 1909ء کے بعد آسٹریا ہنگری اور سربیا کے درمیان رقابت نکتہ عروج پر پہنچ کر 1914ء میں پہلی عالمی جنگ کی ایک وجہ بنی۔

9. فوری وجہ

ان خراب حالات میں آسٹریا کے تخت کے وارث شہزادہ آرچ ڈیوک فرڈینڈ کا قتل فوری وجہ ثابت ہوئی۔ واقعات کے مطابق آرچ ڈیوک فرڈینینڈ اپنی بیوی کے ہمراہ بوسنیا کے شہر ساراجیو (Sarajevo) کے دورہ پر تھا۔ 28 جون 1914ء کو جب کہ وہ شہری استقبالیہ میں شرکت کے بعد موٹروں کے قافلے کے ساتھ ٹاون ہال سے واپس آرہا تھا کہ ایک مخالف انتہاپسند گروہ کے رکن نے موٹروں کے قافلے پر بم پھینکے۔ اس حادثے میں آرچ ڈیوک فرڈینینڈ اور اسکی بیوی دونوں مارے گئے۔

آسٹریا ہنگری جو پہلے سے ہی سربیا سے شاکی تھا، اس حادثہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سربیا کو کچلنے کا عزم کرلیا۔ معاہدہ کے مطابق جرمنی آسٹریا ہنگری کی مدد کا وعدہ کیا۔ چنانچہ آسٹریا ہنگری نے سربیا کو جنگ کا الٹی میٹم دیدیا۔ ادھر روس نے سربیا کی مدد کا اعلان کیا جو حوصلہ پاکر سربیا آسٹریا ہنگری کے مطالبات کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس طرح آسٹریا ہنگری و سربیا کے درمیان 28 جولائی 1914ء کو جنگ کا آغاز ہوگیا۔ سربیا کو روس کی مدد کے خلاف جرمنی میدان جنگ میں کود گیا اور بلجیم پر حملہ کیا۔1839ء میں کئے گئے ایک معاہدہ کی رو سے بلجیم ایک غیرجانبدار (Neutral) ملک تھا اور اس معاہدہ پر دستخط کرنے والے ممالک میں برطانیہ بھی تھا،



یورپ 1914ء میں

چنانچہ برطانیہ بلجیم کے تحفظ کے لیے جرمنی کے خلاف اگست 1914ء میں جنگ میں شامل ہوگیا۔ اس جنگ میں فرانس اور برطانیہ سربیا کی مدد کئے۔ جاپان بھی جرمنی کے خلاف اس جنگ میں شامل ہوگیا۔ اگر چیکہ اٹلی اتحاد ثلاثہ (Triple Alliance) معاہدہ میں شامل تھا، لیکن وہ جرمنی کی طرف سے جنگ میں شامل نہیں ہوا اور ایک سال بعد 1915ء میں آسٹریا ہنگری اور جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ ترکی اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے محوری طاقتوں (Axis power) کی طرف سے جنگ میں شامل ہوگیا۔

1917ء تک روس اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں شامل رہا۔ لیکن 1917ء میں بالشیوک انقلاب کے بعد روس جرمنی کے ساتھ Brest-Litvosk معاہدہ کیا۔ جس سے جرمنی کا موقف بہت طاقتور ہوگیا۔ 7 مئی 1915ء کو جرمن آبدوز (Submarine) نے ایک تجارتی امریکی جہاز Lusitiana کو سمندر میں غرق کردیا جو نیویارک سے لندن جارہا تھا اور جس میں کوئی دو ہزار مسافر سفر کررہے تھے جس کی وجہ سے کئی امریکیوں کو اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ امریکی عوام کی ناراضگی اور دباؤ کے نتیجے میں صدر وڈرو ولسن کو 6 اپریل 1917ء کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑا۔ یوروپ میں تازہ امریکی کمک کے پہنچنے سے جرمن افواج اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود محاذ پر ٹک نہ سکیں۔ بالآخر 11 نومبر 1918ء کو ہتھیار ڈال دیئے۔ ترکی بھی جرمنی کی طرف سے جنگ میں شرکت کیا تھا۔ لیکن اسے بھی شکست سے دوچار ہونا پڑا اور ہتھیار ڈالدیا۔ جاپان 1914ء میں ہی محوری طاقتوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا اور آخر وقت تک لڑکر فاتحین میں شامل ہوگیا۔

جنگ کے اثرات

پہلی عالمی جنگ جو تقریباً 1565 یوم چلی، دوررس اثرات کو پورے عالم پر مرتب کی۔ یہ اب تک لڑی گئی تمام جنگوں سے مختلف تھی۔ بلکہ اسے ایک "مکمل جنگ" (Total war) کہا جاتا ہے۔ 1931ء میں بین پارلیمانی یونین کی جانب سے کی گئی تحقیق کے مطابق اس جنگ میں کوئی چار کروڑ چودہ لاکھ پینتیس ہزار لوگ مارے گئے۔ ایک خام اندازے کے مطابق اس جنگ میں 186 ملین ڈالر کے مالی نقصانات ہوئے۔ اس جنگ کی وجہ سے یوروپ مالی طور پر دیوالیہ ہوگیا۔ یوروپ کا توازن تجارت (Balance of Trade) متاثر ہوا۔ یوروپ کی معاشی اور صنعتی برتری ختم ہوگئی اور اس کی جگہ امریکہ ایک طاقتور صنعتی ملک کے طور پر ابھرا۔ مشرق بعید

(Far-east) کے علاقے میں جاپان کے عروج سے یوروپی اقوام کے مفادات متاثر ہوئے اور ان ممالک پر سے ان کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ پہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں یوروپ میں شہنشاہیتوں کو زوال آیا اور جمہوریت کو فروغ حاصل ہوا۔ جرمنی، آسٹریا، اٹلی اور روس وغیرہ میں بادشاہت ختم ہوئی اور وہاں پر جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں۔ یوروپ اور دوسرے براعظموں میں محنت کش طبقات کی حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے اور فلاحی قانون سازی پر توجہ دی جانے لگی۔ مجلس اقوام بھی اپنے ادارہ انٹرنیشنل لیبر آرگنائیزیشن کے ذریعہ مزدوروں کے لئے فلاحی اقدامات کی ہمت افزائی کرنے لگی۔

پہلی جنگ عظیم کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹر شپ کو عروج حاصل ہوا۔ جرمنی میں نازی ازم اور اٹلی میں فاشزم کے جابرانہ تصورات و نظریات فروغ پائے۔ جرمنی میں ہٹلر کی قیادت میں نازی پارٹی جرمن نسل کی برتری کے تصور کو فروغ دینے لگی جب کہ اٹلی میں مسولینی کی قیادت میں فاشزم کی جبر و ظلم کی حکومت پروان چڑھی۔ روس میں کمیونسٹ انقلاب سے یوروپ اور یوروپ کے باہر ایک نیا توازن طاقت پیدا ہوا۔ جس کی وجہ سے عالمی امن کے قیام کے لیے ذمہ دار عالمی ادارہ مجلس اقوام کا اجتماعی سلامتی کا نظام کارگر نہیں ہوا۔

مشرقِ بعید میں جاپان کا عروج یوروپ اور امریکہ کے لئے ایک چیلنج تھا۔ جاپان سے بحرالکاہل کے علاقے میں امریکی مفادات کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ جاپان جنگ کے بعد کے دنوں میں ہندوستان، چین اور جنوبی امریکہ کے ممالک میں اپنی کپڑے کی صنعت کے لیے بڑی مارکٹیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جس سے یوروپی ممالک کے مفادات متاثر ہونے لگے۔ اسی طرح امریکہ بھی رفتہ رفتہ ایک بڑی طاقت بن کر ابھرنے لگا۔ عالمی تجارت اور اس کی برآمدات میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ جنگ کے دوران اور بعد میں امریکہ یوروپ کے لیے بڑا قرض دہندہ ملک بن گیا۔ یوروپ کی معاشی تعمیر نو اور قرضوں کی ادائیگی میں امریکہ یوروپ کی مدد کیا۔ قرضوں اور تاوان جنگ کے مسائل کی وجہ سے یوروپی ممالک اپنے سونے کے ذخائر امریکہ میں محفوظ کرنے لگے۔ مجلس اقوام کے بانی کے طور پر امریکہ کا وقار مزید بڑھ گیا۔ مجلس اقوام سے اس کا عدم تعاون مجلس اقوام کی ناکامی کا باعث بنا۔

پہلی جنگ عظیم کا ایک اور اہم اثر قوم پرستی کا فروغ تھا۔ وڈرو ولسن کے اُصول خود اختیاری (Self-determination) سے یوروپ میں کئی نئی مملکتیں جیسے ہنگری، آسٹریا، پولینڈ،

یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ، لتھوانیا، استونیا اور لتویا قائم ہوگئیں اور ان تمام مملکتوں میں، نسلی و لسانی بنیادوں پر قوم پرستی کے جذبات فروغ پائے۔ نوآبادیاتی ممالک میں جنگ کے بعد کے برسوں میں قومی جد و جہد آزادی میں شدت پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں گاندھی جی نے 1921ء میں تحریک عدم تعاون اور تحریک نافرمانی وغیرہ کا آغاز کیا۔ مصر 1922ء میں آزادی حاصل کرلیا، 1921ء میں آئیرش فری اسٹیٹ کو ڈومنین کا درجہ حاصل ہوا۔

عظیم معاشی کساد بازاری (Great Economic Depression) پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ یوروپی عوام میں معاشی عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا' وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ بینکوں میں جمع انکی بچت پونجی محفوظ نہیں ہوگی۔ چنانچہ وہ بینکوں سے پیسے نکالنے لگے۔ اکٹوبر 1929ء میں نیو یارک اسٹاک اکسچینج (Wall Street) نے اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کیا۔ پوری دنیا میں صنعتی پیداوار گھٹ گئی' اجرت میں کمی آگئی اور بیروزگاری میں اضافہ ہوا۔ امریکہ یوروپی ممالک کو قرض دینا بن کردیا' یوروپی ممالک بھی امریکہ کو قرض واپس کرنے کے موقف میں نہیں تھے۔ چنانچہ وہ امریکہ کو سونے کی شکل میں قرض واپس کرنے لگے۔ دنیا کا 60% سونا امریکہ اور فرانس کے بینکوں میں محفوظ ہوگیا۔ جس سے سونے کی قلت پیدا ہوگئی۔ کرنسی کی چھپوائی کے لئے ممالک سونے کے معیار کو ترک کردیئے۔ معاشی قوم پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے درآمدی تحدیدات عائد کردیئے گئے جس سے قوموں کے درمیان تجارت مسدود ہوگئی۔ ان حالات نے یوروپ میں سیاسی عدم استحکام پیدا کیا جس سے آمریت کو فروغ ہوا۔ عظیم معاشی کساد بازاری دراصل پہلی جنگ عظیم کا لازمی معاشی نتیجہ تھی۔

پیرس امن کانفرنس 1919ء

جنگ کے اختتام کے بعد پیرس کو امن کانفرنس کے لیے چنا گیا۔ حالانکہ یہ جنگ سے سب سے زیادہ تباہ شدہ شہر تھا۔ اگرچیکہ کانفرنس کا آغاز ڈسمبر 1918ء سے ہوا تھا لیکن باقاعدہ طور پر کانفرنس کا آغاز جنوری 1919ء سے ہوا۔ اس کانفرنس میں کئی ممالک اور قائدین شرکت کیے۔ اس کانفرنس کے اہم شرکاء و قائدین میں امریکی صدر وڈرو ولسن، برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج، فرانسیسی وزیر اعظم کلیمنکیو (Clemenceau) اور اٹلی کے وزیر اعظم Vittorio Orlando شامل تھے۔ اس کانفرنس کا اہم مقصد امن کے قیام کے لیے تجاویز طئے کرنا تھا۔ لیکن برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے درمیان اختلافات کی وجہ سے کچھ طئے نہیں ہوسکا اور بالآخر بہ

کانفرنس ناکام ہوئی۔ اس کانفرنس کا واحد حاصل امریکی صدر وڈرو ولسن کے چودہ نکات تھے۔ امن کانفرنس نے ان نکات کو مستقبل کے لیے امن کی بنیادوں کے طور پر قبول کرلیا۔

ولسن کے چودہ نکات

امریکی صدر وڈرو ولسن نے 8 جنوری 1918ء کو امریکی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے عالمی امن کی بنیادوں کے طور پر چودہ نکات کو پیش کئے' جو اس طرح تھے۔

1. معاہدات خفیہ نہ ہوں بلکہ امن کے لیے معاہدات کھلے اور آزادانہ ہوں۔
2. امن و جنگ کے دوران "سمندروں میں جہاز رانی کی مطلق آزادی ہو"۔
3. معاشی رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے تمام قوموں کے لیے یکساں تجارتی شرائط قائم کیے جائیں
4. قومی اسلحہ کو داخلی حفاظت کے لیے ضروری کم سے کم سطح تک گھٹا دیا جائے۔
5. آزادانہ کھلے اور منصفانہ طور پر نوآبادیاتی دعوؤں کو طئے کیا جائے۔
6. تمام روسی علاقوں سے تخلیہ کیا جائے۔
7. بلجیم کا تخلیہ کیا جائے اور اس کے اقتدار اعلی کو بحال کیا جائے۔
8. تمام فرانسیسی علاقوں کو آزاد کیا جائے اور السک لورین فرانس کو واپس کیا جائے۔
9. اٹلی کی سرحدات کا ازسرنو تعین کیا جائے۔
10. آسٹریا، ہنگری کے عوام کو اپنی سیاسی زندگی طئے کرنے کے لیے خود مختارانہ مواقع دیئے جائیں۔
11. رومانیہ، سربیا اور مانٹینگرو کا تخلیہ کیا جائے اور سربیا کے لیے سمندر تک رسائی کو آسان کیا جائے۔
12. سلطنت عثمانیہ کے ترکی علاقہ کے لیے اقتدار اعلی کی ضمانت دی جائے اور اس کی قومیتوں کو آزادانہ وخود مختارانہ طور پر اپنا مستقبل طئے کرنے کی آزادی دی جائے۔
13. ایک آزاد مملکت پولینڈ کا قیام عمل میں لایا جائے۔
14. ایک خصوصی میثاق (Covenant) کے ذریعہ قوموں کی ایک عام انجمن کا قیام عمل میں لایا جائے۔

معاہدہ ورسیلز Treaty of versailles

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد پانچ امن سمجھوتے کیے گئے 1. معاہدہ ورسیلز (28 جون

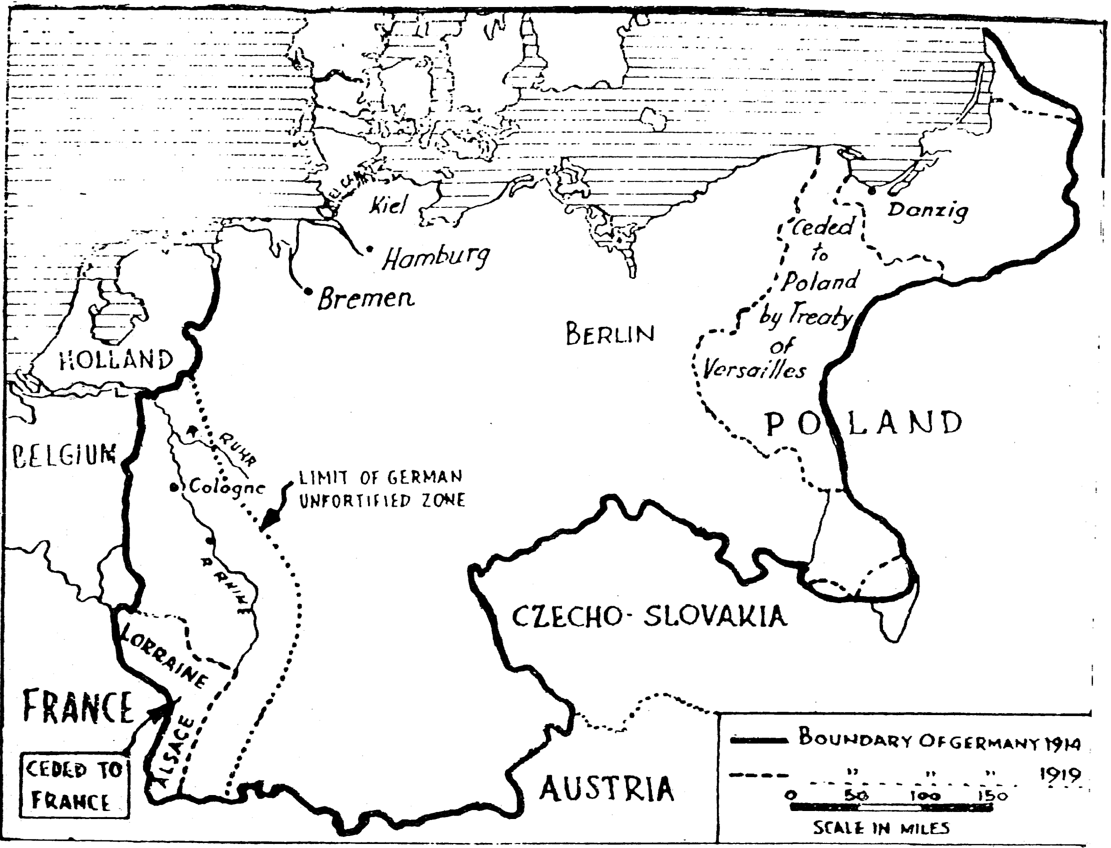
1919) جرمنی کے ساتھ ، 2. معاہدہ St.Germain(10 ستمبر 1919) آسٹریا کے ساتھ 3.معاہدہ Neuilly(27نومبر 1919) بلغاریہ کے ساتھ 4.معاہدہ Trianon (4جون1920) ہنگری کے ساتھ اور 5. معاہدہ سیوریس sevres (10 اگست 1920) ترکی کے ساتھ۔ ان تمام معاہدوں میں جرمنی کے ساتھ کیا گیا معاہدہ ورسیلز بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

7 مئی 1919ء کو اتحادیوں نے معاہدہ کا مسودہ تیار کرنے کے بعد جرمن نمائندوں کو پیرس کے مضافات وارسیلز کے محل میں طلب کیا اور انھیں اس معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا۔ بلکہ اس معاہدہ پر دستخط نہ کرنے کے سنگین عواقب و نتائج کی دھمکی بھی دی گئی۔ جرمن وفد کے ساتھ غیرانسانی ہتک آمیز اور قیدیوں جیسا سلوک کیا گیا۔ جرمنی کو معاہدہ کی تیاری کے کسی مرحلے میں بھی شامل نہیں کیا گیا۔ بالآخر وفد کے اصرار پر معاہدے پر غور کرنے اور دستخط کرنے کے لیے تین ہفتوں کا وقت دیا گیا۔ یہ معاہدہ 440 دفعات اور تقریباً 230 صفحات پر مشتمل تھا۔ جرمنی نے کوئی 443 صفحات پر مبنی اپنے اعتراضات پیش کیے لیکن کسی بھی اعتراض کو قبول نہیں کیا گیا۔ بالآخر 28 جون 1919ء کو جرمنی اس معاہدہ پر دستخط کردیا۔ اس معاہدے کے اہم نکات اس طرح تھے۔

1. جرمنی کے علاقائی نقصانات

معاہدہ کی رو سے جرمنی کو اپنے کئی ایک علاقوں سے دستبردار ہونا پڑا۔ السک لورین کا علاقہ فرانس کو دیا گیا۔ Malmady, Eupen اور Marsent کے علاقے بلجیم کو دیئے گئے۔ مغربی پروشیا ، Posen اور اوپری سلیسیہ (Silesia) کے علاقے پولینڈ کو دیئے گئے۔ ڈانزگ (Danzig) کو آزاد شہر قرار دے کر مجلس اقوام کی نگرانی میں دیا گیا۔ جرمنی شمالی Schleswig کے علاقے سے استصواب عامہ کے بعد ڈنمارک کے حق میں دستبردار ہوا۔ بندرگاہ Mamel لتھوانیا کو سونپ دی گئی۔ Saar کی وادی مجلس اقوام کی نگرانی میں دیدی گئی۔ اس کے علاوہ جرمنی کو اپنی تمام بیرونی نوآبادیات سے ہاتھ دھونا پڑا اور یہ علاقے مجلس اقوام کے تولیتی نظام (Mandatory System) کے تحت بڑی طاقتوں کو سونپے گئے۔ جاپان کو Kiachow اور Shantung کے علاقے دیئے گئے۔ نیوزی لینڈ کو Samoa کی جرمن نوآبادی حاصل ہوئی اور آسٹریلیا کو بحرالکاہل کے علاقے کی جرمن نوآبادیات دی گئیں۔ جرمنی کو چین ، تھائی لینڈ اور مشرق وسطی میں اپنی خصوصی مراعات سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس طرح جرمنی کو تقریباً نولاکھ مربع

یورپ معاہدہ ورسائی کے بعد 1919ء



Europe After The Peace Settlement of 1919

میل کے نوآبادیاتی علاقے اور تیرہ ملین آبادی سے دستبردار ہونا پڑا۔ جب کہ دو ہزار پانچ سو مربع میل ملکی زمین اور سات ملین آبادی اس سے چھین لی گئی۔

2. فوجی دفعات Military Provisions

جرمن افواج کی تعداد کو ایک لاکھ تک گھٹا دیا گیا۔ جرمنی کو فضائیہ کے حق سے محروم کر دیا گیا اور بحری فوج کی تعداد بھی پندرہ ہزار مقرر کی گئی۔ جرمن بحریہ کو صرف چھ جنگی جہازوں، چھ ہلکے کروزرس، بارہ Destroyers اور بارہ Torpedo Boats تک محدود کیا گیا۔ جرمنی میں اسلحہ کی تیاری کو محدود کیا گیا۔ فوج سے باہر کسی بھی قسم کی فوجی تربیت کو ممنوع قرار دیا گیا اور یہ شرائط عائد کی گئیں کہ فوج میں عہدہ دار صرف 25 سال تک اور عام سپاہی 12 سال تک ہی خدمات انجام دیں۔ جرمنی سے گذرنے والی دریائے Rhine کے دونوں کناروں کے پچاس کلومیٹر خطے کو غیر فوجی منطقہ قرار دیا گیا تاکہ اس علاقے میں جرمن فوج کی کوئی سرگرمی نہ ہو۔ جرمنی پر عائد ترک اسلحہ کی نگرانی کے لیے اتحادیوں نے ایک بین۔ اتحادی کنٹرول کمیشن مقرر کیا اور اس کمیشن کے اخراجات جرمنی کو ہی برداشت کرنے کے لیے کہا گیا۔

3. قانونی دفعات Legal provisions

معاہدہ کی دفعہ 231 کے مطابق جرمنی کو پہلی عالمی جنگ اور اس کی تباہ کاریوں کے لیے ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اسے جنگی مجرم قرار دیا گیا۔ سابق جرمن حکمران ولیم قیصر دوم کو اس ''گناہ عظیم'' کے لیے ذمہ دار قرار دیا گیا۔ لیکن چونکہ وہ نیدرلینڈ میں سیاسی پناہ حاصل کیا تھا اور نیدرلینڈ اسے اتحادیوں کے حوالے کرنے تیار نہیں ہوا، اس لئے اس پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جاسکا۔ اتحادیوں کی قائم کردہ جنگی عدالت میں تقریباً سو جرمن جنگی مجرمین پر مقدمہ چلایا گیا اور سزائیں دی گئیں۔

4. معاشی دفعات Economic Provisions

چونکہ جرمنی کو جنگی مجرم قرار دیا گیا تھا اور جنگی تباہ کاریوں کے لیے ذمہ دار تھا اس لیے جرمنی کو جنگی نقصانات کی بھرپور پابجائی کرنے کے لیے کہا گیا۔ چنانچہ دفعہ 232 کے مطابق جرمنی کو اتحادی طاقتوں کی شہری آبادی اور جائداد کے نقصانات کا معاوضہ ادا کرنے کہا گیا۔ نقصانات اور معاوضہ کے تعین کے لیے 1921ء میں ایک تاوان جنگ کمیشن (Reparation Commission) مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن نے تاوان جنگ کی جملہ رقم چھ ہزار چھ سو ملین پونڈ

مقرر کی جس کی ادائیگی جرمنی کے لیے ناممکن تھی۔ جنگ کے دوران بلجیم اتحادیوں سے قرض حاصل کیا تھا، جرمنی کو معہ پانچ فیصد سود اس قرض کی ادائیگی کے لیے ذمہ دار قرار دیا گیا۔ جرمنی سے کہا گیا کہ وہ دس سال تک اٹلی و فرانس کو 70 ملین ٹن اور بلجیم کو آٹھ ملین ٹن کوئلہ فراہم کرے۔ اسی طرح جنس کی شکل میں دوسری اشیاء بھی جرمنی سے حاصل کی گئیں۔

5. سیاسی و دوسری دفعات Political and other Provisions

معاہدہ ورسیلز نے پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کی آزادی کو تسلیم کرلیا اور جرمنی سے کہا گیا کہ وہ سویت یونین سے کیے گئے معاہدہ Brest-Litovsk کو رد کردے۔ نہر Niel کو تمام ممالک کے جہازوں کی آمد ورفت کے لیے "کھلی اور آزاد" قرار دیا گیا۔ اسی طرح دریائے Elbe, Oder, Niemam اور Danube کو بین الاقوامی موقف دیا گیا۔ ولسن کے نکات کے مطابق مجلس اقوام (League of Nations) کا قیام اس معاہدے کی اہم خصوصیت تھی۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی مزدور تنظیم (ILO) کا قیام بھی اسی معاہدہ کی رو سے عمل میں آیا۔ جرمنی سے حاصل کیے گئے علاقوں کے انتظام کے لیے تولیتی اختیارات (Mandatory Powers) مجلس اقوام کو اسی معاہدے کی رو سے حاصل ہوئے۔

تنقیدی جائزہ

معاہدہ ورسیلز اپنی نوعیت میں جبری اور غیر منصفانہ تھا۔ چونکہ اس معاہدے کی تیاری میں جرمنی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا اسلئے یہ یکطرفہ معاہدہ تھا۔ معاہدہ سے یوروپ میں جرمنی کے 25,000 مربع میل علاقہ اور تقریباً سات ملین آبادی کا نقصان ہوا۔ معدنی دولت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو جرمنی کو اپنے کوئلے کے ذخائر کے 2/5 حصے اور 2/3 خام لوہے وغیرہ کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ اسے بھاری تاوان جنگ ادا کرنے کے لیے بھی مجبور کیا گیا۔ گویا جرمنی کی حالت اس گائے کی مانند تھی جس سے اتحادی دودھ بھی لینا چاہتے تھے اور گوشت بھی۔ اس معاہدہ میں عمداً جرمنی کو تباہ کرنے کے لیے ہی سخت ترین قسم کے شرائط اور پابجائیاں رکھی تھیں۔ اس طرح یہ معاہدہ تحکمانہ تھا۔ جرمنی کے اعتراضات کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔ حالانکہ جرمنی نے اس معاہدہ پر 443 صفحات کے اعتراض کئے تھے جنھیں برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج نے "شکست خوردہ سور ماؤوں کے خون سے لکھے گئے شرائط" کہکر انکا مذاق اڑایا تھا۔ چنانچہ یہ مفتوح پر فاتح طاقتوں کا عائد کردہ جبری معاہدہ تھا۔

معاہدہ ورسیلز کے سبب جرمنی میں بے چینی پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں بالآخر جرمنی میں نازی ازم اور ہٹلر کا عروج ہوا۔ گویا اس معاہدے نے دوسری جنگ عظیم کے بیج بودیئے تھے اگرچیکہ معاہدے کی بنیاد ولسن کے چودہ نکات تھے، لیکن اس میں کہیں بھی ولسن کی عینیت (Idealism) نمایاں نہیں تھی۔ اس معاہدے نے یوروپ کی شکل ہی بدل دی جس کی وجہ سے ہر طرف سیاسی بے چینی پیدا ہوئی اور معاہدہ ورسیلز مستقل امن حاصل کرنے میں ناکام رہا۔



باب 9

یوروپ میں آمریت کا فروغ
Rise of Dictatorship in Europe

پہلی جنگ عظیم کے بعد اٹلی اور جرمنی میں فاشزم اور نازی ازم جیسے آمرانہ نظریات و تصورات کا فروغ ایک اہم ترین عالمی واقعہ تھا جس کے عالمی سیاست پر دور رس اثرات پڑے اور جس کی وجہ سے دنیا دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں سے دوچار ہوئی۔ 1922ء میں اٹلی میں مسولینی کی زیر قیادت فاشست اور 1933ء میں ہٹلر کی زیر قیادت نازی حکومتوں کے قیام کو پہلی جنگ عظیم کے بعد ابھرنے والے حالات خصوصاً معاہدہ ورسیلز کے پس منظر میں دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔

اٹلی میں فاشزم

اٹلی کا جغرافیائی محل وقوع اور فطری ماحول اٹلی کی داخلی و خارجی پالیسیوں پر اثر انداز رہا ہے۔ جغرافیائی طور پر یہ براعظم یوروپ کے جنوب میں واقع ایک جزیرہ نما ہے۔ اسی لیے اسے ''بحیرہ روم کا قیدی'' کہا جاتا ہے۔ اس کے تجارتی و سمندری مفادات بحیرہ روم سے وابستہ ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں اٹلی فاتح اتحادی گروپ سے تعلق رکھنے کے باوجود 1917ء میں اس کی افواج آسٹریا کی فوج سے شکست کھا چکی تھیں۔ چنانچہ وہ اپنی شکست خوردگی کے احساس کو کبھی نہیں بھلا پائے اور اسی وجہ سے فاتح اتحادی مابعد جنگ امن کی کوششوں میں اٹلی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیئے۔ پیرس امن کانفرنس میں اٹلی کے مطالبات ودعووں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ اتحادیوں نے اٹلی کو کئی ایک علاقے دینے کا وعدہ کیا تھا اور اپریل 1915ء میں اس غرض سے ایک معاہدہ بھی طئے پایا تھا، جس کے بعد ہی اٹلی جرمنی ومحوری طاقتوں سے علاحدہ ہوکر بڑی امیدوں کے ساتھ اتحادیوں کا ساتھ دیا تھا۔ اٹلی کے مطابق پہلی جنگ عظیم میں سب سے زیادہ قربانیاں اسی نے دی تھیں۔ اٹلی تقریباً چھ ملین افواج کو اس جنگ میں جھونک دیا تھا جن میں سے سات لاکھ سپاہی مارے گئے۔ اس جنگ میں اٹلی کو تقریباً 12 ملین ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ لیکن پیرس امن کانفرنس میں صدر ولسن کا دیا گیا اُصول خود اختیاری (Self-determination) اٹلی کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ امن معاہدہ میں اٹلی کو شمالی آفریقہ

میں لیبیاء اور صومالیہ سے جڑے کچھ علاقے ہی ملے۔ اٹلی سے جن علاقوں کا وعدہ کیا گیا تھا ان پر ترکی اور یونان کا قبضہ ہوگیا۔ اٹلی کی عوام یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ پیرس امن کانفرنس میں ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے اور پہلی جنگ عظیم کی ان کی قربانیاں رایئگاں گئی ہیں۔ان تمام باتوں کے لئے عوام حکومت کو ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔ عوام کا عام احساس یہی تھا کہ اٹلی جنگ جیت چکا تھا لیکن رہنما اپنی عدم صلاحیت کی وجہ سے جنگ ہار چکے ہیں۔ جنگ کے بعد سے افواج میں کمی کے نتیجہ میں بیروزگاری میں اضافہ ہوا۔ اٹلی کی معاشی حالت خراب تھی۔ Lira کی قیمت مسلسل گرتی جارہی تھی۔ چنانچہ 1914ء میں لرا کی قیمت 19.3 سینٹس تھی جو 1920ء میں گھٹ کر 5 سینٹس ہوگئی۔کارخانوں میں تالا بندی سے اشیائے صرف کی قلت پیدا ہوگئی اور قیمتوں میں تین تا چارسو فیصد کا اضافہ ہوا۔جس کے نتیجہ میں اٹلی میں کمیونسٹ نظریات کے قدم جمانے کے امکانات پیدا ہوگئے تھے۔ان حالات میں اٹلی میں فاشزم کی تحریک کا آغاز ہوا۔

نظریہ فاشزم جدید سیاسی فکر میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ لفظ فاشزم لاطینی زبان کے لفظ Fasces سے ماخوذ ہے جس کے معنی گٹھری (بنڈل) کے ہیں۔ قدیم روم میں کلہاڑی اور اس کے دستوں کی گٹھری کو اقتدار کی نشانی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ فاشزم کا بانی بینی ٹو مسولینی(Benito Mussolini 1883-1945) تھا۔ یہ ایک غریب ماں باپ کا بیٹا تھا۔ اسکا باپ لوہار تھا اور ماں ایک اسکول ٹیچر تھی۔ اس کے غریب گھریلو حالات کی وجہ سے ابتداء میں وہ اشتراکی نظریات سے متاثر تھا۔ وہ ایک اشتراکی اخبار ''اونتی'' کا ایڈیٹر بن گیا۔لیکن پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد وہ اشتراکی جماعت کو چھوڑ دیا۔ چونکہ وہ آسٹریا کے خلاف اٹلی کی جنگ کا حامی تھا،اس لیے فوج میں بھرتی ہوکر محاذ جنگ پر بھی گیا لیکن زخمی ہوکر واپس آیا۔ فوج سے نکال دیئے جانے کے بعد وہ اٹلی کے شہر Milan سے ایک انقلابی اخبار Peopolo d' Italia نکالنے لگا۔ اس اخبار میں وہ انقلابی و پرتشدد خیالات کی اشاعت کرنے لگا۔ مارچ 1919ء میں اس نے Fascio di Combattimento کے نام سے ایک جماعت قایم کی۔ جوکہ ایک انقلابی اقدام تھا۔ یہ تنظیم تشدد کے ذریعہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنے لگی۔ اگرچیکہ اب اٹلی میں کمیونسٹ حکومت کے قیام کا خطرہ ٹل گیا تھا، اس کے باوجود مسولینی اور اس کے حامی مسلح تیاری کے ذریعہ بحالیٔ امن کے ساتھ ساتھ اشتراکی تنظیموں کو توڑنے میں لگ گئے۔ اس معاملے میں خود حکومت بھی مسولینی کی مدد

کرنے لگی۔ یہ جماعت 1921ء میں National Fascit party میں تبدیلی ہوگئی۔ اس پارٹی کے وفادار کالے کرتے پہنتے اور رومی سلام دیا کرتے تھے۔ 1921ء میں مسولینی اپنے پرانے رویے کوترک کرتے ہوئے بادشاہ اور چرچ کو اپنی وفاداری کا تیقن دیا۔ نومبر 1921ء میں ہوئے انتخابات میں فاشست پارٹی کو مقنّنہ میں 35 نشستیں حاصل ہوئیں۔ مسولینی پہلے تو طاقت کے ذریعہ حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کیا لیکن بعد میں اس منصوبے کوترک کرتے ہوئے مشہور ''روم مارچ'' کا اعلان کیا۔ 18 اکٹوبر 1922ء سے اس مارچ کا آغاز ہوا۔ لوگ ہر طرف سے کھنچے کھنچے روم کی طرف آرہے تھے۔ اس حالت سے نمٹنے کے لیے حکومت مارشل لا کا نفاذ چاہتی تھی لیکن بادشاہ وکٹور ایمانول سوم نے اس حکمنامہ پر دستخط کرنے سے انکار کرتے ہوئے 29 اکٹوبر 1922ء کو مسولینی کو تشکیل حکومت کی دعوت دی۔ بہت جلد ہی مسولینی اپنے چہرے سے نقاب الٹا اور ظلم و جبر کی حکومت قائم کیا۔ پارلیمانی اداروں کو برخواست کیا اور مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ 1940ء میں مسولینی ہٹلر کے ساتھ دوسری جنگ عظیم میں شامل ہوا۔ لیکن اٹلی کو بھی جرمنی کے ساتھ شکست اُٹھانی پڑی۔ بالآخر 1943ء میں مسولینی کی فسطائی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

نظریہ فاشزم

فاشزم کسی نظریہ یا اُصول کا نام ہے اور نہ ہی فاشستوں کے ہاں کوئی واضح نظریہ یا پروگرام تھا' بلکہ یہ تشدد کے ذریعہ طاقت و اقتدار حاصل کرنے کا نام تھا۔ خود مسولینی کے الفاظ میں '' ہمارا پروگرام سادہ ہے ، ہم اٹلی پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ لوگ ہم سے پروگراموں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ جب کہ پروگرام پہلے سے بہت ہیں۔ اب اٹلی کی نجات کے لیے پروگراموں کی نہیں بلکہ افراد اور قوت ارادی کی ضرورت ہے۔ رسمی اُصول لوہے اور ٹن کی بیڑیاں ہیں''۔ اس طرح فاشستوں کا کوئی اُصول ، نظریہ یا پروگرام نہیں تھا۔ مسولینی نے کہا تھا کہ ''فاشست اٹلی کی سیاست کے خانہ بدوش ہیں جو کسی متعینہ اُصول سے بندھے نہیں ہیں وہ مسلسل ایک مقصد کی طرف آگے بڑھتے ہیں ، اور وہ مقصد ہے اٹلی کے عوام کا بہتر مستقبل' اسی طرح مسولینی اور اس کے پیرو مصالحت اور بات چیت میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ مسولینی نے کہا تھا ''میرا پروگرام عمل ہے بات چیت نہیں''۔

فاشست اپنے نظریات ، پروگرام اور خیالات کو وقت کی ضرورت کے لحاظ سے بدلتے جاتے ہیں۔ پہلے وہ اپنا کام کرتے ہیں اور بعد میں اس کے نتائج پر غور کرتے ہیں۔ ابتداء سے

ہی فاشست تشدد ، فوجی ڈسپلن اور عمل کی اسپرٹ رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے عمل میں اخلاقی اُصولوں اور روحانی قدروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ فاشستوں کے ہاں اپنے لیڈر کے احکامات کی بلاچوں و چرا اطاعت و پابندی تھی۔ فاشزم مملکت و سماج کی عضویاتی نوعیت (Organic Nature) میں یقین رکھتا ہے۔ اس کے مطابق ایک قوم مشترکہ زبان رسم و رواج اور ایک مذہب رکھنے والے افراد کا مجموعہ ہوتی ہے ،قوم افراد کی اعلیٰ نگہبان ہوتی ہے۔ لہٰذا عوام کا یہ فرض ہے کہ وہ مملکت کی خدمت کریں اور اپنے آپ کو قوم کی بھلائی کے لیے وقف کردیں۔ افراد کے خیالات ونظریات کی اس طرح تعمیر کی جائے کہ ان کے دماغوں میں قوم کی عظمت اجاگر ہو۔ فاشزم مملکت کے مطلق اقتدار اعلیٰ پر کامل یقین رکھتا ہے اور انفرادیت پر اجتماعیت کو ترجیح دیتا ہے۔ افراد کو مملکت پر انحصار کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ فاشست مملکت میں انفرادیت اور آزادی کے لیے کوئی مقام نہیں۔ مملکت انفرادیت سے نہیں بلکہ اجتماعیت سے مستحکم ہوتی ہے۔ مسولینی کے مطابق " ہر چیز مملکت میں ہے کوئی چیز مملکت کے خلاف نہیں اور کوئی چیز مملکت کے باہر نہیں"۔ اس طرح فاشست مملکت میں انفرادی آزادی کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا۔ فاشستوں کے مطابق آزادی ایک حق نہیں بلکہ ایک فریضہ ہے۔ انکا کہنا ہے کہ آزادی فطری نہیں بلکہ یہ تو محض مملکت کی عنایت اور رعایت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ فاشزم جمہوریت خصوصاً پارلیمانی جمہوریت کا بھی مخالف ہے۔ وہ جمہوریت کو بیہودہ ، راشی ، خیالی اور ناقابل عمل سمجھتے ہیں۔ مسولینی کے خیال میں عوام حکومت نہیں کرسکتے۔ ایک مملکت میں صرف چند افراد ہی ایسے ہوتے ہیں جو حکومت کے قابل ہوتے ہیں۔ فاشست بین الاقوامی امن کے مخالف ہیں۔ وہ امن کو قوم کی بزدلی سمجھتے ہیں اور حالت جنگ کو قوم کی برتری سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ مسولینی کے الفاظ میں " مرد کے لیے جنگ وہی ہے جو عورت کے لیے بچہ جنم دینا ہے"۔

اٹلی کی خارجہ پالیسی

اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اٹلی علاقائی توسیعت پسندی کی پالیسی اپنایا۔ اس کی صنعتی ترقی کے لیے خام مال کی مسلسل فراہمی کو یقینی بنانا بھی اس کے لیے ضروری تھا اور اس وجہ سے بھی اسے علاقائی توسیعت کی پالیسی کو اپنانا پڑا۔ اپنے اس مقصد کے لیے برطانیہ کو فرانس کے خلاف ، برطانیہ وفرانس کے جرمنی کے خلاف اور برطانیہ فرانس وجرمنی کو سویت یونین کے خلاف بنانے کی پالیسیاں اپنایا۔ چنانچہ یوروپ کی بڑی طاقتوں

کو آپس میں لڑا کر اور حملوں وفتوحات کے ذریعہ توسیعت پسندی کے اپنے مقاصد کو پورا کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے فوری بعد اٹلی کو جزائر Dodacanese یونان کو دینے پڑے تھے۔ لیکن 1923ء کے معاہدہ لوسان (Treaty of Lausanne) کے ذریعہ وہ ان جزائر پر دوبارہ قبضہ حاصل کرلیا۔ لیکن یونان میں اطالوی باشندوں کے مارے جانے کو بہانہ بنا کر اٹلی یونان کے جزیرہ کرفو (Corfu) پر حملہ کردیا اور قبضہ جمالیا۔ مجلس اقوام اٹلی کے اس قبضہ کو جائز قرار دے کر یونان کو خاموش کردی جس سے اٹلی کے عزائم میں مزید اضافہ ہوا۔

اٹلی اور فرانس کے درمیان پیرس امن کانفرنس کے وقت سے ہی خراب تعلقات کے دور کا آغاز ہوا تھا۔ اٹلی کو یہ شکایت تھی کہ اس کانفرنس میں فرانس کو غیر معمولی اہمیت و فوائد دیئے گئے اور اس کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کے علاوہ فرانس و اٹلی دو مختلف نظاموں کی نمائندگی کرتے تھے۔ فرانس میں آزاد جمہوری حکومت تھی جب کہ اٹلی میں ایک مطلق العنان جبری حکومت تھی۔ اس کے علاوہ اٹلی کو یہ شکایت بھی تھی کہ فرانس مخالف فاشزم عناصر کو پناہ دے رہا ہے۔ فرانس و اٹلی دونوں ہی بحیرہ روم پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ اٹلی کا فرانس کے علاقوں Corsica اور Nice پر دعویٰ تھا۔ اس کے علاوہ بندرگاہ ٹانگیر (Tangier Port) پر اٹلی کا دعویٰ تھا۔ فرانس اور برطانیہ کے درمیان اختلافات میں اٹلی برطانیہ کا حامی تھا۔ جب مجلس اقوام ابی سینا پر اٹلی کے حملہ کے خلاف اٹلی کو "جارح" قرار دی تو اٹلی کو یہ شکایت تھی کہ فرانس اس کی مخالفت نہیں کیا تھا۔ اٹلی اور جرمنی کے درمیان تعلقات کی استواری کے بعد فرانس کے ساتھ اس کے تعلقات مزید خراب ہوگئے۔ قیام یوگوسلاویہ سے ہی اٹلی کے ساتھ تعلقات میں کشیدگی تھی۔ یوگوسلاویہ کا علاقہ Fume اٹلی کے لئے ضروری تھا اور جسے وہ لمبے عرصے سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ فیوم پر قبضہ کرلیا اور 1924ء کے معاہدہ Rapallo میں اٹلی کے قبضہ کو تسلیم کرلیا گیا۔ اٹلی البانیہ کی ترقی میں مدد دیا تھا۔ البانیہ میں بغاوت کے نتیجے میں 1928ء میں اٹلی اور البانیہ کے درمیان ایک معاہدہ طئے پایا جسے معاہدہ Tirana کہتے ہیں۔ اس معاہدہ کی رو سے اٹلی کو البانیہ کے داخلی معاملات میں مداخلت کا اختیار حاصل ہوگیا۔ لیکن یہ معاہدہ یوگوسلاویہ کے لیے قابل قبول نہیں تھا چونکہ اس سے یوگوسلاویہ کے مفادات متاثر ہوتے تھے۔ 1932ء میں جب البانیہ میں مخالف اٹلی لہر شروع ہوئی تو 1939ء میں اٹلی البانیہ پر قبضہ کرلیا۔ ابی سینا پر فوج کشی اور اس پر قبضہ اٹلی کی توسیعت پسندانہ پالیسیوں کی ایک اہم مثال ہے۔ 1935ء میں جب اٹلی کی افواج

ایی سینا میں داخل ہوئیں اور 1936ء میں بالآخر اس پر قابض ہوگئیں تو مجلس اقوام اٹلی کے خلاف کچھ نہیں کرسکی۔

جرمنی میں نازی ازم

جرمنی کو یوروپ کی تاریخ میں ایک اہم و مرکزی اہمیت و موقف حاصل رہا ہے۔ اس کے قدرتی وسائل، خوشحال زراعت، صنعتی ترقی اور محنتی عوام کی وجہ جرمنی کو گذشتہ صدی میں یوروپ کی طاقت میں ایک اہم موقف حاصل ہوگیا تھا۔ 1871ء میں جرمنی اتحاد کے بعد یوروپ کی بڑی طاقتوں کی صف میں شامل ہوگیا۔ اس پس منظر کے حامل جرمنی اور عوام کے لیے پہلی جنگ عظیم کی شکست ایک المیہ و صدمہ سے کم نہ تھی۔ چنانچہ جرمنی میں نازی ازم کے عروج کو نومبر 1918ء میں جرمنی کی شکست، معاہدہ ورسیلز میں اس کی توہین اور اس کے بعد 1933ء تک کے حالات کے پس منظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے بعد معاہدہ ورسیلز میں جرمنی کی جو حالت بنائی گئی نازی ازم اس کا لازمی و منطقی نتیجہ تھا۔ اس معاہدے کے تحت جرمنی کو ملکی و نوآبادیاتی علاقوں سے دستبردار ہونا پڑا۔ پولینڈ کو سمندری راستہ فراہم کرنے کی غرض سے ڈانزگ (Danzig) کو بین الاقوامی آزاد شہر قرار دیا گیا۔ جرمن نوآبادیات کو مجلس اقوام کے انتدابی نظام (Mandatory system) کے تحت دیدیا گیا۔ جرمنی کی فوجی طاقت کو کچلنے کے لیے ہر ممکنہ اقدام کیا گیا تا کہ یہ دوبارہ نئی قوت کے ساتھ اُبھر نہ سکے۔ جرمن افواج کو ایک لاکھ تک گھٹا دیا گیا۔ فضائیہ کو ممنوع قرار دیا گیا اور بحری قوت کو بھی محدود کیا گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جرمنی کو پہلی جنگ عظیم کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اس پر 6,600 ملین پونڈ کا بھاری جرمانہ عائد کرتے ہوئے اس کی ادائیگی کے لئے مجبور کیا گیا' لیکن یہ اس کے بس سے باہر تھا۔

اس طرح 1919ء کا ناانصافی پر مبنی معاہدہ ورسیلز جرمن قوم کے لیے ناختم ہونے والے مصائب اور مشکلات کا باعث بنا۔ چنانچہ جرمن قوم اس معاہدے کو اپنے لیے باعث شرم و بے عزتی سمجھنے لگی۔ جس کی وجہ سے پوری قوم میں اپنی اس بے عزتی کا بدلہ لینے کا احساس پیدا ہوا۔ معاشی کساد بازاری سے جرمنی کی معیشت تباہ ہوچکی تھی۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں سے عوام بیزار تھے۔ صنعتی مزدوروں کی بے چینی نے صورتحال کو مزید ابتر بنادیا تھا۔ اگرچیکہ بعد میں 1932ء میں مراعات کے طور پر جنگی تاوان کو ملتوی کیا گیا، لیکن تب تک کافی دیر ہوچکی تھی اور جرمنی کی جمہوری حکومت کو بچانا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ یوروپی سیاست دانوں کا سوتیلا سلوک جرمنی میں

ہٹلر کے عروج کے لیے ذمہ دار تھا۔

جہاں تک نازی تحریک کا تعلق ہے اسے ایک قفل ساز Auton Drexler نے شروع کیا تھا۔ اس کے پاس کوئی واضح پروگرام نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے 1918ء میں جرمنی کی شکست کو ماننے سے انکار کردیا تھا۔ اس کے مطابق ایک ایسے وقت جب کہ جرمن فوج فتح کے قریب تھی اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا گیا تھا۔ اس کے 28 اراکین میں سے صرف چھ اراکین ہی سرگرم کارکن تھے۔ ہٹلر ساتویں سرگرم کارکن کی حیثیت سے اس میں داخل ہوا۔ وہ 1889ء میں پیدا ہوا تھا اور ایک آسٹرین جرمن تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی تلخیوں سے بھرپور تھی۔ وہ پہلی جنگ عظیم سے قبل جرمنی کو ہجرت کیا تھا۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے کر کئی تمغے بھی حاصل کئے تھے۔ وہ نہایت جوشیلا، جذباتی اور انقلابی تھا اور تمام پر اپنی رائے کو فوقیت دیتا تھا۔

ابتداء میں نازی تحریک ''جرمن ورکرس پارٹی'' کے نام سے جانی جاتی تھی۔ لیکن 1920ء میں اس کا نام بدل کر ''نیشنل سوشلسٹ ورکرس پارٹی'' رکھا گیا، لیکن بعد میں صرف ''نیشنل سوشلسٹ پارٹی'' کہلانے لگی۔ بہت جلد ہی متوسط طبقہ، طلبہ اور فوجی عملہ اسکا زبردست حامی ہوگیا۔ لیکن بڑے صنعت کار اور بالائی طبقے اپنے آپ کو اس سے علاحدہ رکھے۔ پارٹی کی بنیاد ہی نفرت اور بدلہ پر رکھی گئی تھی۔ چنانچہ پارٹی یہودیوں اور کمیونسٹوں سے نفرت کا عملی مظاہرہ کرنے لگی۔ نیشنل سوشلسٹ پارٹی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ 1923ء میں پہلی جنگ عظیم کے مشہور اور تجربہ کار جنرل Ludendorf اور ہٹلر میونخ بغاوت میں حصہ لئے تھے۔ بغاوت ناکام ہوئی اور ہٹلر گرفتار ہوا اور پانچ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ لیکن اس نے صرف آٹھ ماہ ہی قید میں گذارے اسی دوران اس نے اپنی مشہور کتاب (Mein Kampf) ''میری جدو جہد'' لکھی تھی۔ جو بعد میں نازی ازم اور اس کے حامیوں کے لیے بائبل سمجھی جانے لگی۔ اگرچہ میونخ بغاوت ناکام ہوگئی لیکن اس سے نیشنل سوشلسٹ پارٹی کے وقار میں بے حد اضافہ ہوا اور پارٹی لیڈر عوامی مزاج کے مطابق اپنے پروگرام بنانے لگے۔ ان کا پہلا مقصد عوام کے ذہنوں سے پارٹی کے متعلق پائے جانے والے خوف کو نکالنا تھا۔ اسی دوران پارٹی فوجی خطوط پر اپنے آپ کو منظم کرنے لگی۔ کارکنوں کے لیے فوجی یونیفارم اور فوجی پریڈ لازمی قرار دیئے گئے۔

مایوسی و ناامیدی کے اس دور میں جرمن نوجوانوں کو نیشنل سوشلسٹ پارٹی امید کی ایک

کرن دکھائی دینے لگی اور وہ ایک نئے جذبہ و حوصلہ کے ساتھ اس میں جوق در جوق بھرتی ہونے لگے۔ ہٹلر کی پر جوش و اشتعال انگیز تقاریر سے نوجوان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ صنعت کار و اعلی طبقے کے لوگ بھی نازی تحریک میں شامل ہونے لگے۔ 31-1929ء کی معاشی بدحالی کا اثر جرمن سیاست پر بھی پڑا۔ 1930ء کے انتخابات میں جرمن پارلیمنٹ Reichstag میں نازی پارٹی کو 107 نشتیں حاصل ہوئیں۔ لیکن کوئی بھی گروپ مستحکم حکومت نہیں بنا سکا۔ چنانچہ مئی 1932ء میں صدر ہنڈن برگ نے وزیراعظم Brunning کی حکومت کو برطرف کردیا۔ اور Vonpapen کو وزیراعظم مقرر کیا۔ جولائی 1932ء کے انتخابات میں نازی پارٹی نے 13 ملین ووٹ حاصل کرتے ہوئے 230 نشتوں پر قبضہ حاصل کرلیا۔ لیکن اسی سال نومبر میں منعقدہ انتخابات میں نازی پارٹی کو پہلے کے مقابلے میں 34 نشتیں کم ملیں۔ ہٹلر کے کسی مخلوط حکومت میں شامل ہونے سے انکار سے سیاسی تعطل پیدا ہوا اور Schleicher کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ لیکن یہ بھی بہت جلد مستعفی ہوگیا۔ بالآخر Vonpapen کے مشورے پر صدر ہنڈن برگ نے غیر مشروط طور پر ہٹلر کو جنوری 1933ء میں تشکیل حکومت کی دعوت دی جسے ہٹلر نے قبول کرلیا۔ مارچ 1933ء میں منعقدہ انتخابات میں نازی پارٹی نے 19 ملین ووٹ حاصل کرتے ہوئے 288 نشتوں پر قبضہ حاصل کیا۔ 1934ء میں صدر ہنڈن برگ کے انتقال پر ہٹلر دونوں عہدوں پر قبضہ جمالیا اور جرمنی کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ تمام اختیارات نازی پارٹی کو حاصل ہوگئے، اورسوائے نازی پارٹی کے تمام جماعتوں کوممنوع قرار دیا گیا۔

نازی فلسفہ

فاشزم کی طرح نازی ازم کے پاس بھی مملکت یا حکومت کے متعلق کوئی خاص نظریہ نہیں تھا۔ بلکہ نازی ازم بدلتے حالات اورضرورت کے مطابق بدلنے کا نام تھا۔ نازی ازم میں مملکت کو بہت زیادہ اہمیت و فوقیت حاصل تھی۔ ان کے مطابق مملکت ایک مافوق الفطری (Super natural) ہستی کا نام ہے اور اسی کو تمام باتوں کے طئے کرنے کا حق حاصل ہے۔ عام آدمی، مملکت کے معاملات کو حل نہیں کرسکتا۔ بلکہ ایک ذہین و دانا آمر ہی مملکت کے مسائل کوسلجھا سکتا ہے۔ اس طرح نازی ازم میں قائد (Fuhrer) کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور ہٹلر سے بڑھ کر کوئی اور قائد رہبر یا رہنما نہیں۔ چنانچہ نازی، ہٹلر کو ایک نیا اور طاقتور عیسٰی مسیح سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک وہی لوگوں کی زندگی کے ابدی قوانین کو سمجھنے کے قابل تھا۔ صرف اسی کی اطاعت

کے ذریعہ ہی لوگ اپنے مفادات کو آگے بڑھا سکتے تھے۔ اس لیے وہ پارلیمانی جمہوریت اور دیگر جمہوری اداروں کی مخالفت کرتے تھے۔ فاشزم کی طرح نازی ازم کا بھی تشدد اور طاقت میں اتفاق تھا۔ چنانچہ خود ہٹلر کے الفاظ میں ''ہر وہ شخص جسے زندہ رہنا ہو اسے لڑنا ہوگا اور ہر اس کو جو اس دنیا میں لڑنے کی خواہش نہیں رکھتا جینے کا حق نہیں''۔ جنگ فطرت اور انسانیت کی تاریخ میں ترقی کا آخری مرحلہ ہے۔ نازی جرمنی اپنے آپ کو دنیا کی بہترین قوم سمجھتے تھے اس لئے ان کا یہ قول تھا کہ انھیں سب پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس غرض کے لیے دوسرے اقوام کو فتح کیا جائے۔ جرمنوں کے وجود میں آنے کا یہی مقصد ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے قوم کو قوت کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس نسلی تعصب کے جذبے نے نازیوں کو ہوس ملک گیری کا خوگر بنادیا تھا۔

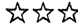
نازی خارجہ پالیسی

جرمنی کے لئے سب سے بڑا دشمن فرانس تھا۔ چنانچہ فرانس کو الگ تھلگ کردینے کے لیے ضروری تھا کہ برطانیہ واٹلی سے دوستی کی جائے۔ جرمن توسیعت پسندی کا مقصد اپنی آبادی کے لیے زیادہ علاقوں کو حاصل کرنا تھا اور یہ مقصد روس و سرحدی مملکتوں کی طرف سے ہی پورا ہوسکتا تھا۔ روس پر قبضہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ فرانس پر قبضہ کیا جائے۔ جرمنی کی خارجہ پالیسی کے تین بڑے مقاصد تھے۔ 1. ایک عظیم تر جرمن مملکت میں تمام جرمن باشندوں کو متحد کرنا 2. نئے علاقوں کو حاصل کرنا اور 3. معاہدہ ورسیلز اور دوسرے معاہدات کو ختم کرنا۔ جرمنی 1934ء سے ہی جنگ کی تیاریاں کرنا شروع کردیا۔ اس کے لیے مجلس اقوام ایک رکاوٹ تھی۔ چنانچہ 1933ء میں مجلس اقوام کی ترک اسلحہ کانفرنس کا بائیکاٹ کیا اور 1934ء میں مجلس اقوام کی رکنیت سے دستبردار ہوا۔ جرمنی اپنے دشمن ممالک کو مغالطہ میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ 1934ء میں پولینڈ کے ساتھ دس سالہ ناجنگ معاہدہ کیا۔ اس کے ذریعہ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کے کوئی جنگی عزائم نہیں ہیں۔ جب کہ اس کا اصل مقصد اپنے دشمنوں کو کسی جنگی تیاری سے باز رکھنا اور انھیں کمزور کرنا تھا۔ اس کے نتیجے میں پولینڈ فرانس کے اثر سے آزاد ہوکر جرمنی کے زیر اثر آگیا۔ 1935ء میں استصواب عامہ کے ذریعہ سار (Saar) کی وادی کو حاصل کرلیا۔

جرمنی آسٹریا کو اپنا ہی ایک حصہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ آسٹریا میں نازی حامیوں کو حکومت کے خلاف بغاوت کے لیے اُکسایا۔ لیکن فرانس، اٹلی اور برطانیہ آسٹریا کی آزادی کے حامی

تھے۔وہ پہلے اٹلی سے دوستی کرلیا اور 1938ء میں ہٹلر آسٹریا کے Anschlus پر قبضہ کرلیا اور اس کے بعد آسٹریا سے دوستی کا معاہدہ کیا۔لیکن آسٹریا نے نازی حکومت کے لیے ایسے مسائل پیدا کردیئے کہ اس کی بنیاد پر ہٹلر 1938ء میں آسٹریا میں مداخلت کیا اور ساری دنیا تماشائی بن کر دیکھتی رہی۔

معاہدہ ورسیلز میں دریائے Rhine کے دونوں جانب پچاس کلومیٹر کے علاقے کو غیرفوجی منطقہ قرار دیا گیا تھا۔لیکن 1936ء میں جرمن افواج اس پر قبضہ کرلئے۔ Rhine کے کناروں پر جرمنی کے قبضہ سے بلجیم اور فرانس کی سلامتی خطرے میں پڑگئی۔ 1925ء میں کیے گئے لوکارنو (Locarno) معاہدہ کو بھی جرمنی رد کردیا۔ حالانکہ اس معاہدہ کا مقصد یوروپی ممالک کو ایک دوسرے سے قریب کرنا تھا اور اس معاہدے پر جرمنی فرانس ، برطانیہ ، اٹلی ، چیکوسلواکیہ ، پولینڈ اور بلجیم نے دستخط کیے تھے۔ یہاں تک کہ جرمنی نے سپٹمبر 1938ء میں کیے میونخ معاہدہ کو بھی نظرانداز کرتے ہوئے مارچ 1939ء میں چیکوسلواکیہ پر قبضہ کیا اس طرح بنیادی طور پر جرمنی کی خارجہ پالیسی میں جارحیت اور توسیعت پسندی کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔



باب 10

دوسری جنگِ عظیم- وجوہات اور اثرات
The Second World War-Causes and Impact

جنگوں کی تاریخ میں ہولناکی اور تباہی کے اعتبار سے دوسری جنگ عظیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ پہلی عالمی جنگ کی طرح دوسری جنگ عظیم کی بھی کوئی ایک وجہ نہیں ہے بلکہ اسے پہلی جنگ عظیم کا تسلسل بھی کہا جاسکتا ہے جو پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے ٹھیک دو دہوں کے وقفہ کے بعد دوبارہ دہک اُٹھی ۔ Cyril Falls کے الفاظ میں دوسری جنگ عظیم بنیادی طور پر جرمنی کی شروع کردہ انتقامی جنگ تھی ۔ معاہدہ ورسیلز نے دوسری جنگ عظیم کے بیج بودیئے تھے ۔ اس معاہدہ میں جرمنی کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا اس سے جرمنی کے جذبہ انتقام کو ہوا ملی ۔ ورسیلز معاہدہ پر نہ صرف جرمنی سے جبراً دستخط لیے گئے تھے بلکہ اسے اس کے علاقوں اور نوآبادیات سے محروم کیا گیا تھا۔ اس کی فوجی طاقت کو محدود کیا گیا ، بھاری تاوان جنگ عائد کیا گیا۔معاہدہ ورسیلز کا مقصد دراصل جرمنی کو دوبارہ طاقتور بننے سے روکنا تھا ۔ 1923ء میں وادی رہر (Rhur valley) پر فرانس کا قبضہ گویا جرمنی کے زخموں پر نمک چھڑکنا تھا ۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر جرمنی میں نازی ازم اور ہٹلر کا عروج ہوا ۔ جنوری 1933ء میں اقتدار میں آنے کے بعد ہٹلر جرمنی کو مضبوط بنانے کے اقدامات کرنے لگااور معاہدہ ورسیلز کی کئی ایک شرائط کو ماننے سے انکار کردیا۔

جنگ کی وجوہات

1. مجلس اقوام اور اجتماعی سلامتی کی ناکامی

مجلس اقوام کا مقصد جنگوں کو روکنا تھا ۔ لیکن کئی ایک وجوہات کی بناء پر مجلس اقوام اس مقصد کو حاصل نہ کرسکی ۔ امریکہ مجلس اقوام کا رکن نہیں تھا اور جو رکن تھے وہ اجتماعی ذہن اور اجتماعی طاقت کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہے ۔ مجلس اقوام اور اس کی ہدایات کی بڑے پیمانے پر ان سنی کی گئی ۔ حملہ آوروں کے خلاف معاشی تحدیدات غیرموثر ثابت ہوئے ۔ بڑی طاقتوں نے مجلس اقوام کا بھرپور ساتھ نہیں دیا ۔ بلکہ ہرطاقت مجلس اقوام کو اپنے قومی مفادات

کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھنے لگی۔ مجلس اقوام کا اجتماعی سلامتی کا نظام عالمی امن کے قیام میں حملہ آور کے خلاف ایک ہتھیار ثابت نہیں ہوسکا۔ 1931ء میں منچوریا پر جاپان کے حملوں اور بعد میں 1935ء میں ایتھوپیا پر اٹلی کے حملوں کو مجلس اقوام محض خاموش تماشائی کی طرح دیکھتی رہی۔ اسی طرح آسٹریا و چیکوسلواکیہ اور بعد میں پولینڈ میں جرمنی کی فوجی پیشقدمی کو مجلس اقوام روک نہیں سکی۔ چنانچہ مجلس اقوام اور اس کا پورا نظام اپنی عدم کارکردگی کی وجہ سے عالمی امن کے قیام میں ناکام رہا۔ منچوریا اور چین پر جاپان کے حملوں پر مجلس اقوام کی ناکامی کو دیکھتے ہوئے چینی سفیر نے مجلس اقوام کے متعلق یہ ریمارک کیا تھا کہ "مجلس اقوام اس ممی کی مانند ہے جسے زیورات کے حسن سے سجایا تو جاسکتا ہے، لیکن زندگی نہیں دی جاسکتی"

2. جاپانی سامراجیت Japan's Imperialism

دوسری عالمی جنگ کی ایک اور اہم وجہ جاپانی سامراجیت تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران ہی جاپان کے عزائم بڑھ چکے تھے۔ اگرچیکہ پہلی عالمی جنگ کے دوران جاپان اور چین اتحادیوں کی طرف سے جرمنی کے خلاف لڑے تھے لیکن جنگ کے بعد چین کی قیمت پر جاپان کو کئی مراعات اور سہولتیں دی گئیں۔ جنگ کے بعد جاپان اپنی بحری طاقت میں اضافے کرنے لگا۔ جاپانی نوجوانوں میں انتہا پسندی عام ہوگئی۔ 1930ء تک جاپانی طاقت میں بے انتہا اضافہ ہوگیا۔ 1931ء میں جاپان منچوریا میں مداخلت کیا۔ مجلس اقوام کے اقدامات کے باوجود منچوریا کو فتح کرلیا اور اس پر اپنا قبضہ جمالیا۔ اس سے بھی جاپانی ہوس ختم نہیں ہوئی تو وہ 1937ء میں اعلان جنگ کیے بغیر ہی چین پر حملہ کیا اور اس کے بعد دیگر چینی شہروں اور صدر مقام پیکنگ پر بھی قبضہ کرلیا۔ یہاں تک کہ یہ جنگ دوسری عالمی جنگ کا ایک حصہ بن گئی۔ جاپان 1941ء میں امریکہ کے پیرل ہاربر (Pearl Harbour) پر بمباری کرتے ہوئے دوسری عالمی جنگ میں شامل ہوگیا۔ جاپانی توسیعت پسندی کے منصوبوں اور فتوحات سے جنگ لازمی تھی اور امن کا قیام ناممکن تھا۔

3. یوروپ میں ڈکٹیٹر شپ Dictatorship in Europe

دوسری جنگ عظیم کی ایک اور وجہ یوروپ میں ڈکٹیٹر شپ کا عروج تھا۔ معاہدہ ورسیلز میں جرمنی سے کی گئی ناانصافیوں کے نتیجے میں جرمنی نازی پارٹی کو عروج حاصل ہوا۔ اسی طرح پہلی جنگ عظیم کے بعد اٹلی کے عوام کی مایوسی اور معاشی مسائل کے نتیجہ میں اٹلی میں بنیٹو مسولینی

کی قیادت میں فاشست پارٹی اقتدار میں آئی ۔ جرمنی میں اڈولف ہٹلر اقتدار میں آنے کے بعد دنیا کو امن کا یقین دلاتا رہا لیکن اندرونی طور پر جنگ کی تیاریاں کرتا رہا۔ اسی طرح مسولینی بھی 1922ء میں اقتدار میں آنے کے بعد رفتہ رفتہ اپنی ڈکٹیٹرشپ کو قایم کیا ۔ اٹلی اپنے چھپے فوجی عزایم کو پورا کرنے کے لیے ابی سینیا پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا۔ 1937ء میں جرمنی اٹلی اور جاپان ایک اتحاد کو قایم کیے جسے برلن ، روم ، ٹوکیو محور کہا جاتا ہے ۔ مئی 1939ء میں اٹلی جرمنی کے ساتھ ایک دس سالہ معاہدہ کیا ۔ یہ جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کا معاہدہ تھا۔ جرمنی اٹلی اور جاپان کی جارحانہ پالیسیوں کے نتیجے میں امن کا قیام ناممکن تھا۔

4. نظریات کا ٹکراؤ Clash of Ideologies

یوروپ میں آمریت اور جمہوریت کے درمیان ٹکراؤ تھا ۔ جرمنی اٹلی اور جاپان آمریت کی نمائندگی کرتے تھے۔جب کہ فرانس برطانیہ اور امریکہ جمہوریت کی نمائندگی کرتے تھے ۔ چنانچہ مسولینی نے دوسری جنگ عظیم کو دراصل دو نظریات کے درمیان ٹکراؤ قرار دیا تھا ۔ تیسرا نظریہ جو یوروپ میں فروغ پا رہا تھا وہ کمیونزم تھا ۔کمیونزم کے خوف سے یوروپ میں آمریت فروغ پائی ۔ جمہوریت میں فرد کو آزادی اور اہمیت حاصل تھی اور اسے تمام مملکتی سرگرمیوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ آمرانہ نظام حکومت میں فرد کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی مملکت برتر تھی اور فرد محض اس کے تابع مشین کے ایک معمولی کل پرزے کی طرح تھا۔فرد کو مملکت کی اطاعت بلا چوں و چرا کرنا تھا ۔ اس طرح فرد کو کوئی آزادی حاصل نہیں تھی ۔ جمہوریت و آمریت کے نظریات روحانی علاقائی اور معاشی معاملات میں بھی ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ جمہوری مملکتیں سیاسی و علاقائی معاملات میں ''جوں کی توں'' حالت کی برقراری کی حامی تھیں ۔ اس طرح ان کے کوئی توسیع پسندانہ عزایم نہیں تھے۔ جب کہ آمرانہ مملکتیں علاقائی توسیع پسندی کے عزایم رکھتی تھیں۔ جرمنی مشرق بعید (Far East) میں اپنی برتری قایم کرنا چاہتا تھا اور وہ کسی بھی مصالحت کے لیے تیار نہیں تھا ۔ یہی حال جرمنی اور اٹلی کا تھا۔ جرمنی کا آسٹریا اور پولینڈ پر حملہ اور اٹلی کا ابی سینیا پر حملہ ان کے توسیع پسندانہ عزایم کو ظاہر کرتا ہے۔ یوروپ میں متضاد نظریات کی اس کیفیت نے سماج میں ذہنی انتشار پیدا کردیا تھا۔

5. خوشامدی کی پالیسی The Policy of Appeasement

پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس جرمن نازی ازم کے انجانے خوف کی وجہ سے

جرمنی کے ساتھ ساتھ اٹلی کی خوشامدی کرنے لگے ۔ وہ ہٹلر اور مسولینی کو خوش کرتے ہوئے یوروپ میں امن کو درہم برہم ہونے سے بچانا چاہتے تھے ۔ وہ دراصل جرمنی اور اٹلی کے جارحانہ عزائم کا اندازہ نہیں لگا سکے ۔ بلکہ وہ یہی سمجھتے رہے کہ ان دونوں ممالک کے چھوٹے موٹے مطالبات کو پورا کرتے ہوئے انھیں خوش کیا جاسکتا ہے اور یوروپ میں امن کو متاثر ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔ جاپان کے ساتھ بھی برطانیہ وفرانس کا یہی معاملہ رہا۔ برطانیہ منچوریا پر جاپانی حملے کے خلاف ٹھوس اقدامات کرتے ہوئے ایشیاء میں اپنی نوآبادیات کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی طرح فرانس ابی سینیا میں اٹلی کے حملوں کے خلاف اقدامات کرتے ہوئے اپنی سلامتی کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا ۔ اس کے علاوہ برطانیہ اور فرانس روس میں کمیونسٹ انقلاب کو یوروپ میں امن کے لیے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ ہٹلر اور مسولینی کو خوش کرتے ہوئے ان دونوں کو کمیونزم کے خلاف اقدامات پر توجہ دینے کی کوشش کرنے لگے ۔ چنانچہ جرمنی کو پھر سے ایکبار مسلح ہونے اور **Rhine land** کو فوجی منطقے میں بدلنے کی اجازت دی گئی جو کہ معاہدہ ورسیلز کے بنیادی اُصولوں کے خلاف تھا ۔ اس کے علاوہ آسٹریا اور چیکوسلواکیہ میں جرمنی کے حملوں پر چپ سادھے بیٹھے رہے ۔ دوسری جنگ عظیم کے شعلے بھڑک اُٹھنے تک برطانیہ وفرانس آپسی اتحاد میں نہیں آئے ۔

6. عظیم معاشی کساد بازاری Great Economic Depression

1930 کے دہے میں شروع ہوئی عالمی کساد بازاری کو بھی دوسری جنگ عظیم کی ایک وجہ سمجھا جاتا ہے ۔کساد بازاری کے دوران ترقی یافتہ ممالک میں زرعی و صنعتی شعبہ میں پیداوار میں بے حد اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں اشیاء کی قیمتیں گر گئیں ۔ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے کسانوں اور صنعت کاروں کو بیرونی مسابقت سے تحفظ دینے کے لیے حکومتوں نے بیرونی اشیاء پر ٹیرف عائد کرنا شروع کیا۔ اس سے عالمی منڈی محدود ہوگئی ، بیروزگاری میں اضافہ ہوا اور لوگوں کی قوت خرید میں کمی آ گئی ۔ اس طرح کساد بازاری کا دور شروع ہوا اس سے دنیا کے تمام ممالک متاثر ہوئے ۔لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر آمرانہ حکومتوں پر پڑا ۔ جاپان کی ریشم کی تجارت متاثر ہوگئی اور پہلے سے تباہ صورتِ حال مزید ابتر ہو گئی ۔ جس سے زراعت سے وابستہ نوجوان فوج کی طرف رخ کرنے لگے ۔ چنانچہ اکثر جونیئر فوجی عہدداروں کا تعلق زراعت سے تھا ۔ جرمنی میں بیروزگاری میں اضافہ ہوا ۔ سپٹمبر **1929**ء میں بیروزگاروں کی تعداد

1,320,000 تھی جو فبروری 1933ء میں بڑھ کر 6,000,000 ہوگئی ۔ اٹلی میں لرا کی قوت خرید گھٹ گئی اور بیروزگاری میں اضافہ ہوا۔ آمر حکمرانوں کے نزدیک ان معاشی مسائل کا حل فوجی توسیعت پسندی میں تھا ۔

7. اقلیتوں کا عدم اطمینان Dissatisfaction of Minorities

دوسری جنگ عظیم کی ایک اور وجہ قومی اقلیتوں کا عدم اطمینان تھا ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد معاہدہ ورسیلز اور ولسن کے چودہ نکات کی وجہ سے قومیت اور نسلی بنیادوں پر خود اختیاری کے اصولوں کے تحت کئی ایک قومی مملکتیں وجود میں آ گئی تھیں ۔ لیکن اس اُصول کا اطلاق عملاً نہیں کے برابر تھا ۔ وسطی یوروپ میں اس اُصول کا اطلاق ممکن نہیں تھا چونکہ قومی اقلیتیں اس طرح سے مشترکہ طور پر ملی ہوئی تھیں کہ انھیں علاحدہ کرنا اور علاقے کی نئی حد بندی کرنا ممکن نہیں تھا ۔ مختلف مملکتوں میں بکھری ہوئی قومی اقلیتیں عدم اطمینان کا باعث بنیں ۔ایک ملک میں رہنے والے اکثریتی عوام دوسرے ملک میں اقلیتی موقف کے حامل اپنے لوگوں کو بغاوتوں یا تبدیلی کے لیے اُکسانے لگے ۔ پولینڈ ، یوگوسلاویہ ، آسٹریا اور چیکوسلواکیہ میں بکھری جرمن اقلیت کو ہٹلر کی تائید وحمایت حاصل تھی اور وہ انھیں آزاد کرکے اپنے قومی دھارا میں شامل کرنا چاہتا تھا ۔

8. ترک اسلحہ کی ناکامی Failure of Disarmament

ترک اسلحہ کی ناکامی کو دوسری جنگ عظیم کی ایک وجہ سمجھا جاتا ہے ۔ پیرس سمجھوتہ اور معاہدہ ورسیلز میں جرمنی کو مکمل طور پر غیر مسلح کیا گیا تھا اور اتحادی بھی عمومی طور پر اسلحہ میں کمی کے لیے آپسی رضا مندی کا اظہار کیے تھے ۔ چنانچہ ترک اسلحہ کے لیے مجلس اقوام کے اندر اور باہر کئی کانفرنسیں ہوئیں لیکن ان سے حاصل کچھ نہیں ہوا ۔ جرمنی اتحادیوں سے بھی ترک اسلحہ کا مطالبہ کرنے لگا۔لیکن فرانس کے نزدیک ترک اسلحہ سے اہم سلامتی کا مسئلہ تھا ۔ چنانچہ 1939ء تک جرمن فوج کی تعداد دوملین سے زیادہ تھی اور وہ فضائیہ (Air Force) کو بھی تیار کرچکا تھا۔ ترک اسلحہ کے لیے مجلس اقوام کی خواہش کا کسی نے بھی احترام نہیں کیا۔

9. فرانس برطانیہ اختلافات France Britain Discord

پہلی جنگ عظیم کے بعد پیرس امن کانفرنس میں برطانیہ و فرانس کے درمیان نقطہ نظر و مفادات کے اختلافات اُبھر کر سامنے آئے ۔ چنانچہ تاوان جنگ ، جرمنی کے مستقبل ، مجلس اقوام، اجتماعی سلامتی یا ترک اسلحہ کے مسئلہ پر ان کے درمیان اختلافات تھے ۔ برطانیہ یوروپ

میں توازن طاقت کے حق میں تھا لیکن پیرس امن کانفرنس کی وجہ سے یہ توازن درہم برہم ہوگیا۔ جنگ کے بعد برطانیہ کی پالیسی جرمنی کو طاقتور بنانے کی تھی تاکہ فرانس کمزور ہوسکے اور اس کا موقف یہ تھا کہ ایک طاقتور جرمنی ہی مشرقی یوروپ میں کمیونزم کے پھیلاؤ کو روک سکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ برطانیہ جرمنی کی جانب سے آسٹریا پر حملہ اور قبضہ کو خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہا۔ میونخ معاہدہ کی وجہ بھی یہی تھی۔

10. اسپین کی خانہ جنگی Spanish Civil War

1936ء میں شروع ہوئی اسپین کی خانہ جنگی کو ''چھوٹی عالمی جنگ'' کہا گیا ہے۔ چونکہ اس میں دوسری تمام طاقتیں شامل ہوگئی تھیں۔ اس طرح یہ دوسری جنگ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اٹلی اور جرمنی اجتماعی سلامتی کے اُصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسپین میں جمہوری حکومت کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئے اور اسپین میں فاشسٹ حکومت قایم ہوگئی۔ اپریل 1931ء میں اسپین کا شہنشاہ الفانسو تیرہ (Alfonso XIII) شہنشاہیت کے خلاف جاری نفرت انگیز مہم کے نتیجہ میں اسپین چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے بعد فوری طور پر صدر Zamora نے اسپین کے جمہوریہ (Republic) ہونے کا اعلان کیا۔ جون 1931ء میں دستور ساز اسمبلی کے لیے ہوئے انتخابات میں جمہوریہ کے حامیوں کو واضح اکثریت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ اسپین کی پارلیمنٹ Cortes میں وہ 117 نشستیں حاصل کرکے سب سے بڑا گروپ بن گئے۔ کئی ایک انقلابی اصلاحی اقدامات وزیراعظم Manual Azana کی حکومت نے کیے۔ 1933ء کے انتخابات میں Azana کی حکومت گر گئی اور اعتدال پسند مخلوط حکومت سابقہ انقلابی اصلاحی اقدامات کو جاری نہیں رکھ سکی۔ بلکہ وزیراعظم Lerroux نے ایک موافق فاشزم حکومت قایم کرتے ہوئے انقلابی اپوزیشن کو کچلنے کی کوشش کی۔ صدر زمورا نے پارلیمنٹ کو تحلیل کرکے نئے انتخابات کا اعلان کیا۔ فبروری 1936ء میں ہوئے انتخابات میں عوامی محاذ کی جماعتیں جو سوشلسٹوں، کمیونسٹوں اور ریپبلکن پر مشتمل تھیں 258 نشستیں حاصل کیں۔ جب کہ دائیں بازو کی جماعتوں کو 215 نشستیں ملیں۔ Manual Azana صدر اور Santiago Casares Quiroga وزیراعظم بنے۔ لیکن 18 جولائی کو فاشستوں کی پشت پناہی سے فوج نے بغاوت کردی۔ جلاوطن جنرل Francisco Franco باغی فوج کی قیادت کررہا تھا۔ جنرل فرانکو کو کئی ایک طبقات کے ساتھ ساتھ جرمنی اور اٹلی کی حمایت حاصل تھی۔ اٹلی اور جرمنی کے تربیت یافتہ رضا کار اس

داخلی جنگ میں فرانکو کا ساتھ دے رہے تھے۔ تقریباً ساٹھ تا ستر ہزار اطالوی فوج جنرل فرانکو کا ساتھ دے رہی تھی۔ جب کہ جرمنی تقریباً آدھا ملین مارک اس مہم پر صرف کیا۔ اسی طرح برطانیہ، امریکہ اور سویت یونین کے ہزاروں رضاکار جنرل فرانکو کے خلاف رپبلکنس کا ساتھ دے رہے تھے۔ بالآخر ریپبلکن حکومت اپنا صدر مقام اکٹوبر 1937ء میں بارسلونا کو منتقل کی۔ مئی 1936ء میں مجلس اقوام کی کونسل نے دوسرے ممالک سے اسپین کی خانہ جنگی میں ملوث نہ ہونے کی اپیل کی۔ یہ خانہ جنگی 1936ء سے 1939ء تک چلی۔ 1939ء میں جنرل فرانکو نے اسپین کے صدر مقام میڈرڈ پر قبضہ جمالیا۔

جنگ کا آغاز

1935ء میں جرمنی معاہدہ ورسیلز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فضائیہ کے قیام کا اعلان کیا اور فوج کی تعداد کو ایک لاکھ سے بڑھا کر پانچ لاکھ کردیا جو 1938ء میں بڑھ کر دو ملین سے زیادہ ہوگئی۔ نومبر 1936ء میں جرمنی و جاپان سویت یونین کے خلاف ایک معاہدہ کیے جس میں اٹلی ایک سال بعد نومبر 1937ء میں شامل ہوا۔ مارچ 1938ء میں ہٹلر یہ کہتے ہوئے کہ آسٹریا جرمنی ہی کا حصہ تھا قبضہ کرلیا۔ سپٹمبر 1938ء میں ہٹلر چیکوسلواکیہ سے Sudetenland کا مطالبہ کیا چونکہ اس میں جرمن آبادی بھی رہتی تھی۔ برطانیہ کے وزیراعظم چمبرلین اور فرانس کے وزیرآعظم Deladier کسی قیمت پر بھی جرمنی سے جنگ نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے 29 سپٹمبر 1938ء کو ہٹلر کے ساتھ میونخ معاہدہ کیے جس کی رو سے چیکوسلواکیہ کا سوڈیٹن کا علاقہ جرمنی کے حوالے کیا گیا۔ اس کے باوجود ہٹلر کے عزائم کو دیکھتے ہوئے 24 اگست 1939ء کو سویت یونین جرمنی کے ساتھ ناجنگ معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ سے جرمنی کا مقصد دراصل دو محاذوں پر جنگ سے گریز کرنا تھا۔ چیکوسلواکیہ پر جرمنی کے قبضہ کو دیکھتے ہوئے 31 مارچ 1939ء کو برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ کے تحفظ کی ضمانت دی تھی اور جب یکم سپٹمبر 1939ء کو ہٹلر پولینڈ پر حملہ کیا تو اس کے دو دن بعد یعنی 3 سپٹمبر 1939ء کو برطانیہ و فرانس نے جرمنی کے خلاف باضابطہ اعلان جنگ کیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوگیا۔ اٹلی جرمنی جاپان اور ان کے حامی ممالک محوری طاقتیں کہلائیں جب کہ برطانیہ و فرانس اور ان کے ساتھ لڑنے والے دیگر ممالک کا گروپ اتحادی طاقتیں کہلایا۔

27 سپٹمبر کو پولینڈ کے صدر مقام وارسا پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا۔ اپریل 1940ء میں

ڈنمارک اور ناروے اور مئی 1940ء میں بلجیم اور ہالینڈ جرمنی کے قبضے میں چلے گئے۔ ناروے ہالینڈ اور بلجیم کی حکومتوں کے لیڈر اپنے ملک سے فرار ہوکر لندن میں جلاوطن حکومتیں قایم کیے۔ 14 جون 1940ء کو پیرس پر جرمن افواج کا قبضہ ہوگیا اور فرانس کے نئے وزیرآعظم مارشل پیٹین (Marshal Petain) نے 22 جون 1940ء کو جرمنی کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کیا۔ لیکن فرانس نے قوم پرستوں کو یہ معاہدہ قبول نہیں تھا چنانچہ ان کے رہنما جنرل ڈیگال نے مسلسل لڑتے رہنے کے فرانس کے عزم کا اعلان کیا۔

اسی دوران برطانیہ میں قیادت میں تبدیلی آئی اور وزیراعظم چمبرلین کی جگہ سر ونسٹن چرچل (Sir Winston Churchill) نے لی۔ ان کی قیادت میں برطانیہ کی تین بڑی جماعتوں پر مشتمل ایک قومی حکومت 10 مئی 1940ء کو قایم ہوئی۔ اگرچیکہ جنگ میں برطانیہ اب اکیلا رہ گیا تھا لیکن وہ بڑی ہمت و بہادری سے جرمن آپریشن سی لائن (Operation Sea-Lion) کا مقابلہ کرتا رہا یہاں تک کہ جرمنی کو خود ہی برطانیہ کے خلاف اس آپریشن کو روک دینا پڑا۔

ادھر امریکہ اس جنگ میں اپنی علیحدگی کی روایتی خارجہ پالیسی کی وجہ سے غیر جانبدار یا الگ تھلگ ہی رہا، اگرچیکہ اس کی اخلاقی و مادی تائید وحمایت اتحادیوں کو حاصل تھی۔ چنانچہ سپٹمبر 1940ء میں امریکہ برطانیہ کو پچاس Destroyers روانہ کیا۔ مارچ 1941ء میں منظورہ ایک خصوصی قانون کے ذریعہ امریکہ اتحادیوں کو جنگی ساز وسامان فراہم کررہا تھا۔ 22 جون 1941ء کو ہٹلر سویت یونین کے ساتھ کیے گئے ناجنگ معاہدہ کونظر انداز کرتے ہوئے اس پر حملہ کردیا جو آپریشن بارباروسا (Operation Barbarossa) کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ جنگی تاریخ کا ایک انتہائی خوفناک حملہ تھا۔ چنانچہ اس حملہ میں تقریباً 3.2 ملین افراد، 2,000 طیارے اور 3,500 ٹینکس حصہ لیے۔ اس حملہ کے متعلق خود ہٹلر نے کہا تھا کہ'' جب آپریشن بارباروسا شروع ہوگا تو دنیا اپنی سانسیں روک لے گی''۔ جرمنی کے اس حملے میں رومانیہ، فن لینڈ، ہنگری اور اٹلی بھی جرمنی کے ساتھ تھے۔ ابتداء میں نازی افواج نے زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔ ڈسمبر 1941ء تک جرمنی دوملین روسیوں کو قیدی بنا چکا تھا اور یوکرین وکریمیا پر فتح حاصل کرچکا تھا لیننن گراڈ جرمن افواج کے محاصرہ میں تھا اور اب وہ ماسکو کی طرف آگے بڑھنے والا تھا۔ لیکن سویت یونین کی سرخ افواج نے اپنے دباؤ کو بڑھانا شروع کیا اور لیننن گراڈ جرمن افواج کے قبرستان میں تبدیل ہوگیا۔ اس جنگ میں یہ پہلی ناکامی تھی جو نازی جرمن افواج کو بھگتنی پڑی تھی۔ اسی طرح

اکتوبر 1942ء تک جرمن افواج اسٹالن گراڈ پر قبضہ کر چکی تھیں۔ مارشل زکوف (Marshal Zhukov) کی قیادت میں سویت افواج نے جرمن افواج کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا چنانچہ فبروری 1943ء تک جرمنی کی چھٹی فوج (Sixth Army) ہتھیار ڈال دی اور نود ہزار فوجیوں کو قیدی بنالیا گیا۔ 1944ء کی گرمیوں تک سرخ افواج نے نازیوں کے مقبوضہ بڑے حصے کو آزاد کرالیا۔ رومانیہ، فن لینڈ اور بلغاریہ کو نازی کنٹرول سے آزاد کرایا گیا۔ مارشل ٹیٹو کی قیادت میں یوگوسلاویہ آزاد ہوا۔ جنوری 1945ء میں سویت افواج نے پولینڈ کے شہر وارسا کو آزاد کرالیا۔

ادھر اٹلی اپریل 1939ء میں البانیہ پر قبضہ جمالیا۔ اس کے علاوہ مسولینی فرانس اور سویت یونین کے خلاف جرمن حملوں میں ہٹلر کا ساتھ دیا۔ آفریقہ میں ایتھوپیا کے اطالوی وائسرائے نے اگست 1940ء میں برطانوی صومالیہ پر حملہ کردیا۔ لیبیاء میں موجود زبردست اطالوی فوج مصر کی طرف کوچ کی جہاں پہلے سے ایک طاقتور برطانوی فوج تھی۔ یہاں لڑائی میں برطانوی افواج نے اٹلی کی فوج کو نہ صرف پیچھے ڈھکیل دیا بلکہ ان کا تریپولی تک پیچھا کیا اور 139,000 افواج کو قیدی بنالیا گیا۔ اٹلی کی مدد کے لیے جرمن افواج نے آفریقہ کا رخ کیا اور برطانوی افواج کو مئی 1941ء میں مصر میں واپس ڈھکیل دیا۔ تقریباً دو برسوں تک محوری افواج یوں ہی آگے بڑھتی اور پیچھے ہٹتی رہیں۔ بالآخر اکتوبر 1942ء میں Field Marshal Montgomery نے محوری افواج کو شکست فاش دے دی۔ 1942ء میں جنرل آئیزن ہوور (General Eisenhower) نے برطانوی وامریکی افواج کو شمالی آفریقہ میں اُتار دیا۔ چنانچہ مونٹگو میری اور آئیزن ہوور کے دباؤ کے نتیجے میں مئی 1943ء میں محوری افواج نے ہتھیار ڈالدیئے اور کوئی 250,000 کو قیدی بنالیا گیا۔ اس کے بعد اتحادی افواج اپنی توجہ جنوبی یوروپ پر مرکوز کرنے لگیں۔ 10 جولائی 1943ء کو اتحادی سسلی پر حملہ کیے جس کے نتیجے میں اٹلی میں مسولینی کی فاشست حکومت گرگئی اور 25 جولائی 1943ء کو وہ گرفتار ہوا۔ اٹلی کے نئے وزیرآعظم مارشل باڈوگ لیو (Marshal Badoglio) نے 3 سپٹمبر 1943ء کو جنگ بندی کا معاہدہ کیا۔ جس کی وجہ سے ہٹلر اٹلی پر حملے کیا۔ یہاں تک کہ اس کی افواج نے روم پر فتح پائی اور مسولینی کو آزاد کرالیا۔ لیکن اٹلی کی نئی حکومت جرمنی کے خلاف جنگ کی۔ جنوب کی طرف سے اٹلی پر اتحادیوں کے بڑھتے دباؤ کے نتیجے میں جون 1944ء میں روم پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگیا اور بالآخر 28 اپریل 1945ء کو جرمن افواج اٹلی میں ہتھیار ڈال دیں اور مسولینی سوئیزرلینڈ فرار ہونے کی کوششوں میں مارا گیا۔

ادھر بحرالکاہل کے علاقے میں جاپانی سامراجیت کے نتیجے میں منچوریا پر اس کا قبضہ پہلے سے ہی تھا۔ ستمبر 1940ء میں وہ سارے ہند۔چین پر قابض ہوگیا۔ جاپان بھی جرمنی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپریل 1914ء میں سویت یونین سے ناجنگ معاہدہ کیا تاکہ دو محاذوں پر جنگ کو روکا جاسکے۔ یہاں جاپان کی طاقت کے مقابلے میں امریکہ مزاحمتی طاقت تھا۔ امریکہ نے جاپان سے ہند چین کا علاقہ خالی کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے جاپان سے تمام تجارتی تعلقات منقطع کرلیے۔ لیکن اکتوبر 1941ء میں جنرل ٹوجو کے اقتدار میں آنے کے بعد جاپان امریکہ سے تجارتی تعلقات کو بحال کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن امریکہ کا مطالبہ یہ تھا کہ جاپان پہلے ہند۔چین کے علاقے سے دستبردار ہوجائے۔ اس کے جواب میں جاپان نے 7 ڈسمبر 1941ء کو جزائر ہوائی میں پیرل ہاربر (Pearl Harbour) پر بمباری کیا جس میں کوئی دو ہزار امریکی مارے گئے۔ اس کے جواب میں امریکہ راست طور پر دوسری جنگ عظیم میں شامل ہوگیا۔ جاپان ڈسمبر 1941ء میں ہانگ کانگ، جنوری 1942ء میں فلپائین، فبروری 1942ء میں سنگاپور اور ملائیشیاء، مارچ 1942ء میں انڈونیشیاء اور مئی 1942ء میں برما کو فتح کرلیا۔ لیکن امریکہ کے جنگ میں شامل ہونے کے بعد جون 1942ء سے صورت حال یکسر بدلنے لگی۔ 1944ء کے گرما سے امریکہ کے دور تک وار کرنے والے بم جاپان پر حملے کرنے لگے اکتوبر 1944ء میں امریکی جنرل میک آرتھر نے فلپائین کو آزاد کرالیا۔

مغربی محاذ پر اتحادی افواج نے اگست 1944ء میں پیرس کو نازی کنٹرول سے آزاد کرالیا۔ ستمبر 1944ء میں بروسلز آزاد ہوا اور ستمبر 1944ء تک امریکی و برطانوی افواج جرمن سرحدات پر تھیں۔ فبروری 1945ء میں اتحادی افواج دریائے Rhine کے مشرقی کنارے تک پہنچ گئیں۔ 29 اپریل 1945ء کو ہٹلر خودکشی کرلیا اور 2 مئی 1945ء کو جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے۔

جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد بھی مشرق بعید میں جنگ جاری رہی۔ امریکہ جو 16 جولائی 1945ء کو المو گارڈو میں دنیا کا پہلا نیوکلیر تجربہ کیا تھا' 6 اگست اور 8 اگست 1945ء کو ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بم برسائے جس کے نتیجے میں جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے حالات پیدا ہوئے۔ چنانچہ 10 اگست 1945ء کو جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کے ساتھ ہی دوسری جنگ عظیم اپنی تمام تر ہولناکیوں کے ساتھ ختم ہوگئی۔

دوسری جنگ عظیم کی اہم کانفرنسیں

دوسری جنگ عظیم کے دوران جنگی حکمت عملی کو طئے کرنے اور مابعد جنگ کی صورتحال پر غور کرنے کے لیے اتحادی طاقتوں کی کئی ایک کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں سے اہم یہ ہیں ۔

1. منشور بحیرہ اوقیانوس Atlantic Charter

اگست 1941ء میں امریکی صدر فرانکلن ڈی روزولٹ اور برطانوی وزیر اعظم چرچل بحیرہ اوقیانوس میں ایک جہاز پر ملاقات کیے ۔ اس ملاقات کے بعد جو مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا وہ منشور بحیرہ اوقیانوس کہلاتا ہے ۔ اس اعلامیہ کے آٹھ بنیادی اُصول تھے ۔

1. علاقائی توسیعت پسندی نہیں۔
2. متعلقہ آبادی کی مرضی کے بغیر علاقائی تبدیلیاں نہ کی جائیں ۔
3. تمام اقوام کے لیے حکومت خود اختیاری،یعنی اپنی حکومت خود منتخب کرنے کا حق ۔
4. تجارت اور خام مال کے معاملے میں تمام مملکتوں کے حق کو تسلیم کرنا۔
5. تمام اقوام کے لیے معاشی ترقی اور سماجی تحفظ کو یقینی بنانا اور قوموں کے درمیان معاشی تعاون کو فروغ دینا۔
6. جرمن بربریت کے خاتمہ کے بعد عالم گیر امن کو قایم کرنا۔
7. تمام اقوام کے لیے سمندروں میں جہاز رانی کی آزادی۔
8. طاقت کے استعمال کو ترک کرتے ہوئے امن کے لیے ترک اسلحہ کو قبول کرنا ۔

یکم جنوری 1942ء کو برطانیہ، امریکہ سویت یونین اور چین نے ایک اعلامیہ پر دستخط کے ذریعہ اس منشور کی توثیق کیے۔اس کے علاوہ 22 دیگر ممالک بھی اس منشور کو تسلیم کرلیے ۔ اس کے بعد سے اسے اقوام متحدہ کا اعلان نامہ کہا جانے لگا ۔

2. ڈمبارٹن اوکس کانفرنس Dumbarton Oaks Conference

اگست 1944ء میں برطانیہ،سویت یونین ، چین اور امریکہ کے نمائندے ڈمبارٹن اوکس میں ملاقات کیے ۔ اس کانفرنس میں دوسری جنگ عظیم کے بعد قایم کی جانے والی بین الاقوامی تنظیم کے متعلق اہم فیصلے کیے گئے ۔ اس کانفرنس میں یہ طئے کیا گیا کہ اس کانفرنس میں شریک چار ممالک کے نمائندوں (اور اگر ممکن ہو تو فرانس) کو نئے بین الاقوامی ادارے کی سلامتی کونسل میں حق تنسیخ ، یا ویٹو پاور حاصل ہوگا ۔ اس کانفرنس کو اقوام متحدہ کے سلسلے میں ہونے والی اہم

کانفرنس سمجھا جاتا ہے۔

3. یالٹا کانفرنس فبروری Yalta Conference 1945

دوسری جنگ عظیم کے دوران ہوئی کانفرنسوں میں سب سے اہم یالٹا کانفرنس ہے۔ فبروری 1945ء میں امریکی صدر یف۔ڈی روز ولٹ ، برطانوی وزیرآعظم چرچل اور سویت حکمران جوزف اسٹالن جزائر کریمیاء کے شہر یالٹا میں ملاقات کیے ۔اس کانفرنس کی روئیداد کا افشاء صرف 1955ء میں کیا گیا۔اس کانفرنس میں طئے کیے گئے اہم نکات اس طرح تھے ۔

1. مجلس اقوام کی جگہ ایک نئے بین الاقوامی ادارہ کو قایم کیا جائے ۔اس کی سلامتی کونسل میں بڑی طاقتوں کو ویٹو کا حق حاصل ہو ۔ اس غرض کے لیے اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس 25اپریل 1945ء کو سان فرانسکو میں طلب کی جائے تاکہ اس کے منشور کو قطعیت دی جاسکے۔
2. جرمنی سے نازی ازم کا خاتمہ کیا جائے۔
3. جرمنی کو غیرمسلح کیا جائے اور 20 ملین ڈالرتاوان جنگ وصول کیا جائے' جس کی آدھی رقم کا حق دار سویت یونین ہوگا اور جنگی مجرمین کو سزادی جائے ۔
4. جرمنی کو چار مقبوضہ منطقوں میں تقسیم کیا جائے ۔امریکہ، برطانیہ،فرانس اور روس کو ایک ایک منطقہ دیا جائے ۔
5. اٹلی اور جرمنی کی نوآبادیات کو آزادی دی جائے ۔
6. پولینڈ میں ایک آزاد حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے ۔
7. یوگوسلاویہ میں مارشل ٹیٹو کی قیادت میں ایک نئی حکومت قایم کی جائے۔
8. جرمنی میں نازی ازم کے زوال کے ساتھ ہی سویت یونین جاپان کے خلاف اعلان جنگ کے لیے راضی ہوا ۔
9. ساری دنیا میں امن اور جمہوری حکومتوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔

Potsdam Conference July-Aug 1945

دوران جنگ کی کانفرنسوں کی آخری کڑی پوٹسڈام کانفرنس تھی ۔ اس کانفرنس میں نئے امریکی صدر ہنری ٹرومن نئے برطانوی وزیرِاعظم کلیمنٹ اٹلی (Clement Attlee) 'سویت یونین کے جوزف اسٹالن اور چینی حکمران چیانگ کائی شیک نے حصہ لیا ۔ اس کانفرنس کے اہم نکات

اس طرح تھے۔

1. جرمنی کو چار فوجی مقبوضہ منطقوں میں تقسیم کیا جائے اور امریکہ، برطانیہ، سویت یونین اور فرانس کے قبضہ میں ایک ایک منطقہ دیا جائے۔انتظامی مقصد کے لیے ایک اتحادی کنٹرول کونسل ہوگی۔ پورے جرمنی کو ایک ہی معاشی اکائی تصور کیا جائے گا۔
2. جرمنی کو غیر مسلح کیا جائے اور جمہوریت و بنیادی آزادیوں کو بحال کیا جائے۔
3. جرمن معیشت کو غیر مرکوز کیا جائے اور جرمنی کو واجبی تاوان دینے کے لیے مجبور کیا جائے۔
4. بین الاقوامی عدالت میں جرمن جنگی مجرمین پر مقدمہ چلایا جائے۔
5. اتحادی ایران سے اپنی افواج کو ہٹالینے پر راضی ہوگئے۔
6. آسٹریا کو تاوان کی ادائیگی سے مستثنیٰ رکھا جائے۔
7. جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے شرائط کو طئے کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے اثرات

کہا جاتا ہے کہ کسی بھی جنگ کے بعد حالات پہلے کے سے کبھی نہیں رہتے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم نے بین الاقوامی سیاست اور تعلقات کی ہیئت اور نوعیت کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں پہلی مرتبہ فضائیہ، آبدوز ٹینک اور بھاری بارودی اسلحہ کا استعمال ہوا تھا۔لیکن دوسری جنگ عظیم میں ان سب کی اعلیٰ قسموں کے ساتھ ساتھ پہلی مرتبہ ایٹمی اسلحہ کا استعمال بھی ہوا۔ یہ جنگ چھ برسوں تک جاری رہی اور برآعظم ایشیاء، آفریقہ اور یوروپ کے کوئی چالیس ممالک میں لڑی گئی۔ 1939ء سے 1945ء تک جنگ کی شریک اقوام نے 10 ملین افراد کو جنگ میں جھونک دیا۔ 360,000 سے زیادہ اسلحہ اور مورٹار کا استعمال ہوا۔ 50,000 سے زائد ٹینکس اور دوسرے خودکار بندوق وغیرہ استعمال ہوئے۔ 120,000 طیارے اس جنگ میں شامل تھے اور جنگ نے تقریباً 50 ملین افراد کو لقمۂ اجل بنادیا جب کہ کئی شہر اور دیہات جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ جنگ کی تباہی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف سویت یونین میں ہی 20 ملین لوگ مارے گئے۔ چھ ملین یہودیوں کو ہٹلر نے گیس چیمبر کے حوالے کیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سابقہ توازنِ طاقت بدل گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس دو بڑی طاقتیں تھیں۔لیکن دوسری جنگ عظیم کے نتیجہ میں بین الاقوامی سیاست میں عظیم طاقتوں کا ایک نیا تصور ابھرا۔ چنانچہ امریکہ اور سویت یونین دونوں اپنے برتر اسلحہ اور عالمی

سیاست میں زبردست اثر و رسوخ کی وجہ سے عظیم طاقتیں کہلانے لگے اور عالمی سیاست ان کے اردگرد گھومنے لگی ۔ یہ دونوں ممالک نظریاتی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔سویت یونین اشتراکی نظام کا تو امریکہ سرمایہ دارانہ نظام کا حامل تھا۔جس کی وجہ سے عالمی سیاست میں پہلی مرتبہ نظریات (Ideology) کا ایک نیا عنصر غالب آ گیا اور دنیا نظریاتی طور پر دو مخالف خیموں میں تقسیم ہوگئی اس عمل کو دو قطبی نظام (Bi-polarity) کہتے ہیں ۔ ان دونوں کے درمیان مستقلاً تناؤ وکشیدگی سے عالمی امن وسلامتی کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ان دو ممالک کے درمیان تناؤ وکشیدگی کے تعلقات کو سرد جنگ کا نام دیا گیا (تفصیل اگلے اسباق میں دیکھئے)

دوسری جنگ عظیم مجلس اقوام کی ناکامیوں کا نتیجہ تھی ۔ چنانچہ عالمی قائدین نے اس کی جگہ ایک نئے بین الاقوامی ادارہ کے قیام کا فیصلہ کیا ۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہوئی کانفرنسیں ایک عالمی صورت گری کے لیے تھیں جن میں اقوام متحدہ کا قیام مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔مجلس اقوام کی ناکامی کے تجربے نے دنیا کو زیادہ وسیع بنیادوں پر ایک نئے عالمی ادارہ کے قیام کی راہ ہموار کی ۔ بالآخر اقوام متحدہ کا قیام 24 اکٹوبر 1945ء کو عمل میں آیا۔

دوسری جنگ عظیم کا مثبت فائدہ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے نوآبادیت کے تانے بانے ٹوٹنے لگے اور ساری دنیا میں نوآبادیت او رغلامی کے خلاف آواز زور پکڑنے لگی ۔ ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی زیر قیادت جاری جد و جہد آزادی کے نتیجہ میں ہندوستان کو 1947ء میں آزادی ملی ۔اسی طرح ایشیاء آفریقہ و لاطینی امریکہ کے ممالک میں نوآزاد مملکتیں وجود میں آنے لگیں ۔ بالآخر 1960ء کے دہے کے وسط تک دنیا سے نوآبادیت کا خاتمہ ہوا ۔ نوآبادیاتی ممالک اپنی نوآبادیت کو چھوڑنے کے لیے مجبور ہوئے ۔ اقوام متحدہ میں نوآزاد ممالک کی اکثریت سے عالمی طاقت کے توازن میں تبدیلیاں آنے لگیں۔نوآزاد ممالک کا مجموعہ اقوام متحدہ میں تیسری دنیا کہلانے لگا ۔ اس کے اپنے مشترکہ سیاسی ، سماجی و معاشی مسائل تھے ۔ ان کا نوآبادیاتی ورثہ ان کو متحدہ وحدت میں پرودیا ۔ جس کے نتیجہ میں سرد جنگ کے ماحول میں غیرجانبدار تصور کو فروغ حاصل ہوا اور غیر جانبدار تحریک ایک اہم قوت کے طور پر استحصال اور نوآبادیت کے خلاف ہراول دستہ بن کر سامنے آئی ۔

☆☆☆

حصہ سوم
بین الاقوامی ادارے
International Organizations

باب 11

مجلس اقوام

The League of Nations

پہلی جنگ عظیم کے بعد پیرس امن کانفرنس میں امریکی صدر وڈرو ولسن نے جو چودہ نکات عالمی امن کی بنیادوں کے طور پر پیش کیے تھے اس کا آخری نکتہ یہی تھا کہ قوموں کے درمیان سوجھ بوجھ کے لیے قوموں کی ایک انجمن کا قیام عمل میں لایا جائے۔اس طرح ولسن کے چودہ نکات مجلس اقوام کے قیام کی بنیاد بنے۔

پیرس امن کانفرنس نے 25 جنوری 1919ء کو مجلس اقوام کے میثاق (Covenant) کی تیاری کے لیے صدر ولسن کی صدارت میں ایک 19 رکنی کمیٹی قایم کی۔برطانوی وفد کے قانونی مشیر Sir Cecil Hurst اور امریکی وفد کے رکن David Hunter Miller نے مجلس اقوام کا میثاق تیار کیا اور کافی غور وخوض اور مباحثہ کے بعد 28 اپریل 1919ء کو اسے کانفرنس نے منظور کرلیا۔ 10 جنوری 1920ء کو مجلس اقوام کا قیام عمل میں آیا۔دراصل معاہدہ ورسیلز کے ابتدائی 26 دفعات ہی مجلس اقوام کا میثاق بنے۔میثاق کی تمہید کے مطابق مجلس اقوام کے دو اہم مقاصد تھے۔ 1. بین الاقوامی امن وسلامتی کو حاصل کرنا اور 2. بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینا۔تمہید میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ بین الاقوامی امن و سلامتی کو حاصل کرنے کے لیے ممالک جنگ سے گریز کریں گے اور قوموں کے درمیان کھلے، منصفانہ اور باوقار تعلقات کے قیام کے لیے اقوام عالم بین الاقوامی قانون کو قبول کرتے ہوئے معاہدہ ذمہ داریوں کو پورا کریں گے۔

مجلس اقوام کی ساخت

اسمبلی ، کونسل ، مستقل سکریٹریٹ ، بین الاقوامی مزدور تنظیم اور مستقل عدالت انصاف مجلس اقوام کے اہم ادارے تھے۔

1. اسمبلی

میثاق کی دفعہ 1 کے مطابق مجلس اقوام کے ابتدائی اراکین وہ تھے جو اس پر دستخط کیے تھے یا پھر اس کے قیام کے وقت سے اس کے رکن بنے تھے۔اس کے ابتدائی ارکین کی تعداد 43 تھی۔اسمبلی کو درخواست دے کر رکنیت حاصل کرنے والے ممالک غیر ابتدائی اراکین کہلاتے

تھے۔ ہر رکن ملک کے اجلاسوں میں تین رکنی وفد کو بھیج سکتا تھا، لیکن ووٹ کا حق ایک ہی تھا۔ اس کے اجلاس وقفہ وقفہ سے ہوا کرتے تھے۔ اسمبلی ایک صدر اور آٹھ نائب صدور کا انتخاب کرتی تھی۔ مجلس اقوام کا صدر مقام سوئیزرلینڈ کا شہر جنیوا تھا۔

اسمبلی اپنی نوعیت میں عالمی بحث و مباحثہ کا ادارہ یا عالمی پارلیمنٹ کی طرح تھی۔ اس کے فیصلے یا قانونی اختیارات صرف داخلی معاملات کی حد تک ہی محدود تھے۔ سیاسی معاملات میں اس کا اختیار صرف سفارشی نوعیت کا تھا۔ اسمبلی کونسل کے مستقل اور غیر مستقل اراکین کا انتخاب کرتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ سکریٹری جنرل اور بین الاقوامی عدالت انصاف کے اراکین کے انتخاب کے لیے بھی ذمہ دار تھی۔ یہ کونسل کے اراکین کی تعداد کا تعین بھی کرتی تھی۔ اس کے مباحث عالمی رائے عامہ کے مظہر تھے۔ مباحثہ کے ادارہ کی حیثیت میں یہ عالمی امن و سلامتی کی برقراری سے متعلق اور عالمی تعاون کو فروغ دینے کے امور پر بحث کرتی تھی۔ مجلس اقوام کے بجٹ پر غور و منظور کرنے کا اختیار اسمبلی کو تھا۔

2. کونسل

کونسل کی نوعیت لیگ کی کابینہ یا اسمبلی کی عاملانہ کمیٹی کی طرح تھی اور یہ بڑی طاقتوں کی نمائندگی کرتی تھی۔ ابتداء میں اس کی رکنیت صرف پانچ بڑی طاقتوں، برطانیہ، فرانس، امریکہ، اٹلی اور جاپان تک محدود تھی لیکن چھوٹی طاقتوں کے اعتراض پر اس خیال کو ترک کیا گیا اور ان پانچ بڑی طاقتوں کو مستقل رکنیت دیتے ہوئے اسمبلی کے منتخبہ چار اراکین کو بھی عارضی رکنیت دی گئی جن کی میعاد تین سالہ تھی۔ امریکہ رکن نہ بننے کی وجہ سے صرف چار بڑی طاقتیں ہی مستقل رکنیت کی حامل تھیں۔ 1922ء میں غیر مستقل اراکین کی تعداد کو بڑھا کر چھ کردیا گیا اور 1926ء میں جرمنی کو مستقل رکن کی حیثیت دی گئی۔ 1934ء میں سویت یونین مجلس اقوام کی رکنیت حاصل کیا تو اسے کونسل کی مستقل رکنیت دی گئی لیکن تب تک جاپان اور جرمنی مجلس اقوام کی رکنیت چھوڑ چکے تھے۔ 1939ء تک صرف برطانیہ فرانس اور سویت یونین ہی مستقل رکن کے طور پر باقی تھے جب کہ عارضی اراکین کی تعداد بڑھ کر گیارہ ہوگئی تھی۔ 1940ء میں سویت یونین کے اخراج کے بعد کونسل میں عملاً صرف دو بڑی طاقتیں برطانیہ و فرانس ہی رہ گئے۔

کونسل کے ہر رکن کا ایک ووٹ تھا اور ہر ملک ایک نمائندہ کو روانہ کرتا تھا۔ اس کے ہر اجلاس کے لیے ایک صدر کا انتخاب انگریزی حروف تہجی کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ جب ضروری ہو

کونسل کا اجلاس ہوسکتا تھا، لیکن سال میں کم از کم ایک اجلاس لازمی تھا۔

کونسل مجلس کی عاملہ تھی۔ چنانچہ یہ ڈانزگ اور سار کی وادی کا انتظام سنبھالتی تھی۔ دفعہ 22 کے مطابق انتدابی کمیشن (Mandate Commission) کی مدد سے کونسل انتدابی علاقوں کے انتظام کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ عالمی امن سے متعلق کسی بھی مسئلہ سے نمٹنا کونسل کی ذمہ داری تھی۔ بین الاقوامی تنازعات کو پرامن طور پر حل کرنا کونسل کی سب سے اولین ذمہ داری تھی۔ دفعہ 6 کے مطابق کونسل اسمبلی کی منظوری سے سکریٹری جنرل کا تقرر کرتی تھی۔ دفعہ 5 کے مطابق کونسل کے فیصلوں کے لیے اجلاس میں موجود تمام اراکین کی منظوری لازمی تھی۔ اسی طرح اجلاس میں موجود ہر رکن کو حق تنسیخ (Veto Power) حاصل تھا۔ دفعہ 8 کے مطابق کونسل اسلحہ میں کمی کرنے کے لیے منصوبے بناسکتی تھی۔

3. سکریٹریٹ

دفعہ 6 کے مطابق سکریٹریٹ ایک سکریٹری جنرل اور دیگر ضروری اسٹاف پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ اس کے پہلے سکریٹری جنرل Sir Eric Drummond تھے۔ لیگ کے تمام اداروں میں سکریٹریٹ سب سے کار آمد ادارہ تھا۔ سکریٹری جنرل کی مدد کے لیے دو ڈپٹی سکریٹری جنرل اور دو اسسٹنٹ انڈر سکریٹریز کے علاوہ 600 سے زائد ماہرین عہدہ داروں اور ماتحتین کا عملہ ہوا کرتا تھا۔ سکریٹریٹ کا کام اسمبلی اور کونسل کے اجلاس کو کامیابی سے منعقد کرنا تھا۔ سکریٹریٹ کسی بھی مسئلہ سے متعلق اطلاعات اور مواد اکٹھا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ لیگ کے مختلف اداروں کے درمیان تعاون و ہم آہنگی پیدا کرنا سکریٹریٹ کا اہم کام تھا۔ 1932ء میں Joseph Avenol دوسرے سکریٹری جنرل بنے۔ اس کے آخری سکریٹری جنرل Stean Lester 1940ء میں منتخب ہوئے تھے۔ سکریٹریٹ کے اسٹاف کو مختلف ممالک سے لیا جاتا تھا، بلکہ مہارت کی بنیاد پر غیر ممبر ممالک سے بھی لیا جاتا تھا۔

4. بین الاقوامی مزدور تنظیم International labour Organization

مجلس اقوام کے اراکین خود بخود بین الاقوامی مزدور تنظیم کے ممبر ہوا کرتے تھے، تاہم تکنیکی طور پر یہ تنظیم مجلس اقوام کا ایک حصہ نہیں تھی۔ یہ معاہدہ ورسیلز کی تخلیق تھی۔ اس کے تیرہویں حصے میں دفعات 387 تا 427 اس کا تذکرہ تھا اور دفعہ 392 میں یہ کہا گیا تھا کہ I.L.O کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں ہوگا اور یہ مجلس اقوام کا ایک حصہ ہوگی۔ مجلس اقوام کے غیر رکن اراکین بھی

اس کے رکن بن سکتے تھے۔ چنانچہ امریکہ جو مجلس اقوام کا کبھی رکن نہیں بنا بین الاقوامی مزدور تنظیم کا رکن تھا۔ مجلس اقوام کی میثاق کی دفعہ 23 میں واضح طور پر یہ کہا گیا تھا کہ لیگ کے اراکین "اپنے ممالک میں اور دوسرے تمام ممالک میں جن سے ان کے تجارتی و صنعتی تعلقات ہوں مرد، عورتوں اور بچوں کے لیے محنت کے منصفانہ اور انسانی حالات کو برقرار رکھیں گے اور حاصل کریں گے اور اس مقصد کے لیے وہ ضروری بین الاقوامی تنظیم کو قایم کریں گے"۔ چنانچہ I.L.O کا مقصد مزدوروں کی حالت کو سدھارنا، کام کے اوقات کا تعین کرنا، بیماریوں کی روک تھام کرنا اور بیماری میں علاج فراہم کرنا، مناسب اجرت فراہم کرنا، بچوں و عورتوں کا تحفظ کرنا اور انجمن بنانے کے حق کو قایم کرنا تھا۔ مزدوروں اور ان کے خاندانوں کے لیے فلاحی خدمات فراہم کرنا اس کے مقاصد میں سے ایک تھا۔

I.L.O 'بین الاقوامی لیبر کانفرنس، مجلس عاملہ (Governing Body) اور ایک International Labour Office کے ذریعہ کام کرتی تھی۔ بین الاقوامی لیبر کانفرنس لیگ کی اسمبلی کی طرح تھی۔ اس کے سالانہ کانفرنسوں میں رکن ممالک چار نمائندوں کو روانہ کرسکتے تھے جن میں سے ایک نمائندہ مزدور برادری، ایک ملازم اور باقی دو حکومت کی نمائندگی کرتے تھے۔ مجلس عاملہ 32 اراکین پر مشتمل ہوا کرتی تھی جو لیبر کانفرنس کی جانب سے منتخب کیے جاتے تھے۔ جس میں سے 16 حکومتی نمائندے ہوا کرتے تھے۔ اس کے ایجنڈے کا تعین مجلس عاملہ کرتی تھی۔ لیبر کانفرنس I.L.O کا اہم پالیسی ساز ادارہ تھی جس کا کام سالانہ بجٹ کو منظوری دینا تھا۔

بین الاقوامی مزدور دفتر (International Labour Office) کا صدر دفتر جنیوا میں تھا۔ اس کے ڈائرکٹر کا تقرر مجلس عاملہ کیا کرتی تھی۔ جس کا کام مجلس عاملہ کے تمام اجلاسوں میں شرکت کرنا تھا۔ بین الاقوامی مزدور دفتر کا کام بین الاقوامی سطح پر مزدوروں کی زندگی، حالات اور مسائل کے متعلق مواد اکٹھا کرنا اور ضروری تحقیقات کو روبعمل لانا اور دفتری امور کو چلانا تھا۔

I.L.O لیبر قوانین پر مباحث کے لیے بین الاقوامی فورم کا کام انجام دیتی تھی۔ 1921ء سے 1939ء تک اس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں تھا جسے 1940ء میں مانٹریال منتقل کیا گیا۔ 1939ء تک بین الاقوامی لیبر کانفرنس بچہ مزدوری، خواتین کی حالت، راحت کا کام بیروزگاری، کام کے اوقات، کم سے کم اُجرت، بیماری اور فنڈنس وغیرہ سے متعلق کوئی 73 سفارشات پیش کی اور 67 کنونشنس منعقد کی۔

5. مستقل بین الاقوامی عدالت انصاف

مجلس اقوام کے معاہدہ میثاق کی دفعہ 14 کے مطابق مستقل بین الاقوامی عدالت انصاف کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔اس کا قیام یکم ستمبر 1921ء کو اس وقت عمل میں آیا جب کہ لیگ کے اراکین کی اکثریت اس کے قیام کی منظوری دی۔ یہ مجلس کے تحت ایک آزادانہ ادارہ تھا اس کا اپنا دستور تھا جس کی 64 دفعات تھیں۔عدالت کو اس سے رجوع کیے جانے والے کسی بھی تنازعہ کو سننے اور فیصلہ دینے کا اختیار تھا۔اسمبلی یا کونسل کو جانب سے رجوع کیے جانے والے کسی بھی مسئلہ پر مشورہ دینا بھی عدالت کے فرائض میں شامل تھا۔ابتداء میں یہ عدالت گیارہ ججس اور چار ڈپٹی ججس پر مشتمل تھی۔1931ء میں ججس کی تعداد کو بڑھا کر پندرہ کردیا گیا ججس کا انتخاب اسمبلی اور کونسل آزادانہ رائے دہی کے ذریعہ کرتی تھی۔ججس خود اپنے صدر اور نائب صدر کا انتخاب کرتے تھے۔ججس کی میعاد نو سال تھی جن کا دوبارہ انتخاب بھی ہوسکتا تھا۔عدالت کا اجلاس ہر سال 15 جون کو یا پھر جب صدر طلب کرے منعقد ہوا کرتا تھا۔عدالت کا صدر مقام ہیگ (Hague) میں تھا۔تمام ججس کے فیصلے سے ہی کسی جج کو ہٹایا جاسکتا تھا۔انصاف کی عدالت کے طور پر اس عدالت نے بڑا نام کمایا اور مجلس اقوام کے خاتمہ تک اس عدالت نے کوئی دو سو احکامات اور 32 فیصلے جاری کیے تھے۔کوئی 65 مقدمات کی شنوائی کی اور 27 مشاورتی رائے دی تھی۔ان میں سے اکثر احکامات اور فیصلوں کو اس کی غیر جانبداریت کی وجہ سے فریقین نے خوش دلی سے قبول کیا تھا۔

مجلس اقوام کے فرائض

مجلس اقوام کا اہم فریضہ عالمی امن و سلامتی کی برقراری اور بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینا تھا۔میثاق کی دفعہ 10 کے مطابق کسی بھی حملے کے خلاف اجتماعی سلامتی کا تصور دیا گیا تھا۔لیگ کے اراکین بیرونی حملے کے خلاف علاقائی یکجہتی اور اراکین کی موجودہ سیاسی آزادی کے تحفظ کے لیے ذمہ دار تھے۔ایسے کسی بیرونی حملے یا ایسے کسی حملے کے خطرات کی صورت میں کونسل اس صورتحال سے نمٹنے کے طریقوں کو طئے کرنے کے لیے ذمہ دار تھی۔دفعہ 18 کے مطابق لیگ کا کوئی رکن کوئی معاہدہ کرے یا کسی معاہدے میں شامل ہوتو اسے لیگ کے سکریٹریٹ میں درج کروانا ضروری تھا۔غیر مندرجہ معاہدوں کے لیے لیگ پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔دفعہ 11 کے مطابق لیگ کے کسی بھی رکن پر حملہ لیگ پر حملہ سمجھا گیا تھا۔عالمی امن کو متاثر

کرنے والے امور کو لیگ سے رجوع کرنے کی اراکین سے خواہش کی گئی تھی اور اراکین سے کہا گیا تھا کہ وہ جنگ سے گریز کرتے ہوئے مسائل کے حل کے لیے مستقل بین الاقوامی عدالت انصاف کی عملداری کو قبول کریں۔ دفعہ 16 کے مطابق میثاق کو توڑنے والے اراکین کے خلاف معاشی وفوجی تحدیدات عائد کرنے کا اختیار لیگ کو حاصل تھا۔ دفعہ 8 میں ترک اسلحہ پر زور دیا گیا تھا۔

1. نظامِ انتداب Mandate System

میثاق کی دفعہ 22 انتداب سے متعلق تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں شکست خوردہ ممالک خصوصاً جرمنی اور اٹلی کے علاقوں کو حاصل کرنے اور ان پر متبادل نظامِ حکومت کے لیے اتحادیوں کا تیار کردہ طریقہ تھا۔ چنانچہ اتحادیوں نے جرمنی و ترکی کی مفتوحہ نوآبادیوں کے علاقوں کو مجلس اقوام کی نگرانی میں دے دیا اور مجلس اقوام نے ان علاقوں کے انتظام کی ذمہ داری چند دوسری طاقتوں کو دی۔ اس طریقے کو انتدابی نظام (Mandatory System) کہا جاتا ہے۔ ان مفتوحہ انتدابی علاقوں کو مجلس اقوام نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

1. 'A' درجہ کے انتدابی علاقے سلطنت ترکی کی سابقہ نوآبادیات تھیں جہاں سیاسی ترقی قابل لحاظ تھی جنہیں فوری یا جلد آزادی دی جاسکتی تھی۔ عراق اور فلسطین کو برطانیہ کی نگرانی میں دیا گیا۔ 1932ء میں عراقی انتداب ختم ہوا اور عراق کو مجلس اقوام کا رکن بنایا گیا۔ شام اور لبنان کو فرانس کی نگرانی میں دیا گیا۔ بعد میں فرانس نے چند شرائط پر ان کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔
2. 'B' درجہ کے انتدابی علاقے وہ تھے جہاں سیاسی ترقی قابل لحاظ نہیں تھی اور جنہیں جلد آزادی نہیں دی جاسکتی تھی۔ آفریقہ کی چھ جرمن نوآبادیات اس میں شامل تھیں۔ برطانوی کیمرون، برطانوی ٹوگولینڈ اور ٹانگانیکا کو برطانیہ کی نگرانی میں دیا گیا۔ فرنچ کیمرون اور فرنچ ٹوگولینڈ کو فرانس کے قبضے میں اور روانڈا اورونڈی (Ruanda Urundi) کو بلجیم کی نگرانی میں دیا گیا۔
3. 'C' درجہ کے انتدابی علاقے وہ تھے جنہیں آزادی دینا ممکن ہی نہیں تھا۔ ان میں جرمنی کے جنوب مغربی افریقہ کی نوآبادیات اور بحرالکاہل کے جزائر شامل تھے۔ چونکہ یہ علاقے، رقبے و آبادی کے لحاظ سے چھوٹے اور دوردراز کے علاقے تھے چنانچہ جنوب مغربی آفریقہ کو جنوبی آفریقہ، Samoa کو نیوزی لینڈ، Nauru کو برطانیہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے قبضے میں دیا گیا۔ اسی طرح خط استواء کے شمال کے بحرالکاہل کے جزائر جاپان کو اور جنوب کے جزائر کو آسٹریلیا کی نگرانی میں دیا گیا۔

انتدابی طاقتوں (Mandatory Powers) کے لیے ضروری تھا کہ وہ انتدابی علاقوں (Mandatory Territory) کا انتظام اس طرح کریں کہ اس سے اس علاقے کی سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی ہو۔اس علاقے سے متعلق سالانہ رپورٹ پیش کرنا ہر انتدابی طاقت کے لیے ضروری تھا۔مجلس اقوام خودصورت حال کا جائزہ لینے کے لیے اپنے نمائندے کو بھیج سکتی تھی انتدابی امور کی نگرانی کے لیے ایک انتدابی کمیشن (Mandatory Commision) بھی قایم کیا گیا تھا۔یہ انتدابی نظام 1946ء تک جاری رہا بعد میں اس کی جگہ اقوام متحدہ کی تولیتی کونسل (Trusteeship Council) نے لے لی۔

2.اقلیتوں کا تحفظ Protection of Minorities

پہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں قومیت کی بنیادوں پر کئی آزاد مملکتیں وجود میں آئی تھیں۔ ان مملکتوں میں رہنے والی اقلیتوں کا مسئلہ یوروپ کا ایک اہم سیاسی وسماجی مسئلہ بن گیا۔بعض معاملات میں اقلیتوں کو حق خود اختیاری دیتے ہوئے انہیں نئی مملکتوں میں شامل کیا گیا' جس کے نتیجے میں یوروپ میں اقلیتوں کی تعداد 54 ملین سے گھٹ کر صرف 17 ملین رہ گئی تھی۔اس کے باوجود 7.1/2 ملین جرمن ، 3ملین مگیار Magyar آدھا ملین یوگوسلاویہ ، 1,350,000 بلغاریائی اور 4.1/2 ملین Ruthenians رتھینی ، یوکرینی ، فرانس ، اٹلی ، یونان ، پولینڈ ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ میں رہ رہے تھے۔اکثریتی گروہوں نے جب ان اقلیتی گروہوں کو اپنے میں ضم کرنے کی کوششیں کیں تو اس سے بین الاقوامی تناؤ پیدا ہوگیا۔پیرس امن کانفرنس نے اقلیتوں کے تحفظ ، ان کے حقوق اور آزادیوں کے لیے چند ایک اقدامات کیے تھے ، بعد میں اس کی ذمہ داری مجلس اقوام کو سونپی گئی۔چنانچہ اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے مجلس اقوام نے کئی ایک قوموں سے خصوصی معاہدات کیے۔اقلیتوں کو بھی اپنے حقوق کی خلاف ورزی کی شکایت مجلس اقوام سے کرنے کا حق دیا گیا تھا۔

3.انتظامی فرائض Administrative Functions

معاہدہ ورسیلز نے Saar کی وادی اور ڈانزگ شہر سے متعلق کچھ انتظامی ذمہ داریاں بھی مجلس اقوام کو دی تھیں۔'سار' کی وادی جرمنی کے مغرب میں اور ڈانزگ جرمنی کے مشرق میں واقع ہے۔سار کی وادی ایک صنعتی علاقہ تھی اس کا رقبہ کوئی دوہزار مربع میل تھا۔جس میں اسی لاکھ جرمن آبادی رہتی تھی۔پیرس کانفرنس کے دوران فرانس کا وفد سار کی وادی فرانس کو دیئے

جانے کی وکالت کرتا رہا لیکن امریکی صدر ولسن اور برطانوی وزیر اعظم لائیڈ جارج کی مخالفت کی وجہ سے یہ علاقہ فرانس کو منتقل نہیں کیا گیا بلکہ امریکی تجویز کے مطابق اس علاقہ کو پندرہ برس کے لیے مجلس اقوام کے کنٹرول میں دیا گیا۔ پندرہ سال بعد سار کے باشندوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی آزادی تھی۔ مجلس اقوام نے سار کی وادی کے انتظام کے لیے ایک پانچ رکنی کمیشن مقرر کیا۔ جنوری 1935ء میں وہاں استصواب عامہ (Plebiscite) کروایا گیا۔ تقریباً 90% رائے دہندوں نے جرمنی سے الحاق کے حق میں فیصلہ دیا۔ چنانچہ یکم مارچ 1935ء کو سار (Saar Valley) کا علاقہ جرمنی کو واپس کر دیا گیا۔

لیگ کی دوسری ذمہ داری ڈانزگ شہر سے متعلق تھی۔ پولینڈ ڈانزگ شہر پر اپنا قبضہ چاہتا تھا تاکہ سمندر تک اس کی رسائی ہو سکے۔ ڈانزگ کی آبادی جرمن اکثریت پر مشتمل تھی۔ پیرس کانفرنس نے ڈانزگ کو آزاد شہر کا موقف دیا۔ مجلس اقوام نے ڈانزگ بندرگاہ کے انتظام کے لیے ایک بین الاقوامی بندرگاہ بورڈ کا قیام عمل میں لایا اور تنازعات کے حل کے لیے ایک ریسڈنٹ ہائی کمشنر کا تقرر کیا۔

4. سماجی و معاشی فرائض Socio Economic Fuctions

عالمی امن کے قیام میں سماجی و معاشی خوشحالی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ مجلس اقوام نے جنگ سے تباہ حال یوروپ کی معاشی تعمیر نو کے لیے بڑے پیمانے پر اقدامات کیے۔ میثاق کی دفعہ 23 میں لیگ کو سماجی و معاشی میدانوں میں کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ چنانچہ لیگ نے غلامی کے خاتمہ، بچوں و خواتین کے تحفظ، بیماریوں کے تدارک اور مہاجرین کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کئی اقدامات کیے۔ 1923ء میں ایک عالمی تنظیم صحت کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ بین الاقوامی تعاون کے ذریعہ صحت عامہ کا تحفظ کیا جا سکے۔ 1920ء میں جنگی قیدیوں اور مہاجرین کی باز آبادکاری کے لیے ایک ہائی کمشنر کا تقرر کیا گیا۔

مجلس اقوام کا رول Role of league of Nations

مجلس اقوام نے اپنی بیس سالہ مختصر زندگی میں کئی ایک بین الاقوامی سیاسی مسائل کو سلجھانے کی کوششیں کی۔ چنانچہ اس بیس سال میں قوموں کے درمیان 43 تنازعات اس سے رجوع ہوئے۔ جہاں تک امن سے متعلق سیاسی تنازعات کا تعلق ہے مجلس اقوام صرف ایسے مسائل و معاملات کو ہی سلجھا پائی جن کا تعلق کمزور ممالک سے تھا یا پھر ممالک مجلس اقوام کے

فیصلے کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ بڑے اور طاقتور ممالک سے پیدا ہونے والے مسائل کو وہ قابو میں نہیں رکھ سکی۔ مجلس اقوام کی مختصر زندگی میں کامیابیوں کے مقابلہ میں ناکامیاں زیادہ ہیں جو اس کی ساخت اور حالات کا لازمی نتیجہ تھے۔ ذیل میں چند ایک تنازعات کا جائزہ لیا جائے گا جس سے مجلس اقوام کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

کامیابیاں

1. اینزلی تنازعہ Enzeli Dispute

یہ تنازعہ روس اور ایران کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ 1920ء میں روس ایران کی بندرگاہ اینزلی پر بمباری کیا اور قبضہ جمالیا۔ ایران نے اس مسئلہ کو مجلس اقوام سے رجوع کردیا۔ لیکن روس اور ایران کے درمیان راست بات چیت کے نتیجہ میں یہ مسئلہ سلجھ گیا اور مجلس اقوام کی مداخلت کے بغیر ہی روس اپنی افواج کو اینزلی سے ہٹالیا۔

2. آلند جزائر کا تنازعہ Aaland Islands Dispute

یہ تنازعہ فن لینڈ اور سویڈن کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ آلند کے جزائر خلیج بوتھنیا (Bothnia) میں واقع ہیں۔ تاریخی طور پر یہ جزائر اور فن لینڈ سویڈن ہی کے تھے۔ لیکن 1809ء میں ان پر روس کا قبضہ ہوگیا۔ 1917ء میں روس جب فن لینڈ اور ان جزائر کو آزاد کیا تو ان جزائر میں رہنے والے سویڈیش باشندے سویڈن میں شامل ہونے کے لیے ایک تحریک چلائے۔ برطانیہ مجلس اقوام کی توجہ اس جانب مرکوز کیا۔ فن لینڈ کا دعویٰ تھا کہ یہ اس کا داخلی معاملہ تھا۔ لیکن مجلس اقوام نے اس تنازعہ کو ماہرین قانون کی ایک کمیٹی کے حوالہ کیا۔ بالآخر 1921ء میں مجلس اقوام نے ان جزائر پر فن لینڈ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا جب کہ فن لینڈ آلینڈ کے باشندوں کو سیاسی خودمختاری اور سیاسی حقوق دینے کے لیے تیار ہوا۔ سویڈن مجلس اقوام کے اس فیصلے کو تسلیم کرلیا اور 6 اپریل 1922ء کو اس غرض کے لیے فن لینڈ اور سویڈن کے درمیان معاہدہ مفاہمت طئے پایا۔

3. البانیہ کا سرحدی تنازعہ Boundary Dispute of Albania

پہلی جنگ عظیم کے بعد قایم ہونے والی نئی مملکتوں میں سے ایک مملکت البانیہ بھی تھی۔ مجلس اقوام نے البانیہ کی آزادی کو تسلیم کرلیا تھا اور 1920ء میں اسے رکنیت بھی دی گئی تھی لیکن یوگوسلاویہ البانیہ پر حملہ کر کے اس کا الحاق کرلیا۔ مجلس اقوام نے اس تنازعہ کو سلجھاتے ہوئے پر

امن طور پر البانیہ کے اقتدار اعلیٰ کو بحال کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

4. اوپری سلیسیہ کا تنازعہ Upper Silesia Dispute

یہ مسئلہ جرمنی اور پولینڈ کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ معاہدہ ورسیلز کے تحت اوپری سلیسیہ کے کچھ حصے چیکوسلواکیہ کو دیئے گئے تھے اور باقی حصوں میں عوام کی مرضی جاننے کے لیے مارچ 1920ء میں استصواب عامہ کروایا گیا۔ عوامی فیصلہ جرمنی کے حق میں نکلا۔ لیکن پولینڈ سلیسیہ کے ان علاقوں کا مطالبہ کرنے لگا جہاں پولش زبان بولنے والوں کی اکثریت تھی۔ اس مسئلہ پر جرمنی اور پولینڈ کے درمیان تنازعہ پیدا ہوا۔ مجلس اقوام نے اس معاملے میں مداخلت کرتے ہوئے ایک کمیشن کا تقرر کیا۔ کمیشن کی سفارشات کے مطابق سلیسیہ کی نئی حد بندی کرتے ہوئے اسے مزید دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ دونوں ممالک نے اس فیصلہ کو قبول کرلیا۔

5. یونان اور بلغاریہ کا تنازعہ Greco-Bulgarian Dispute

یہ یونان و بلغاریہ کے درمیان ایک سرحدی جھگڑا تھا۔ یہ جھگڑا اس وقت نازک موڑ اختیار کرلیا جب 1925ء میں یونانی سپاہی چیک پوسٹ پر مارے گئے۔ یونان بلغاریہ سے معافی مانگنے اور معاوضہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا لیکن پھر اچانک بلغاریہ پر حملہ کردیا اور کچھ علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ یہ مسئلہ مجلس اقوام سے رجوع ہوا۔ مجلس اقوام کی کونسل نے جنگ بندی کا حکم جاری کرتے ہوئے ایک تحقیقی کمیشن مقرر کیا۔ کمیشن اس حملہ کے لیے یونان کی مذمت کیا اور 42,000 پونڈ معاوضہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ یونان کے پاس اس حکم کو ماننے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

6. موصل تنازعہ Mosul Controversy 1924

موصل آج عراق میں واقع ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل عراق ترکی کی حکمرانی میں تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد عراق کو برطانیہ کی تولیت میں دیا گیا۔ معاہدہ سیوریس کے ذریعہ موصل کو عراق کے حوالہ کیا گیا تھا۔ لیکن معاہدہ لوسان (Lausanne) میں کہا گیا تھا کہ ترکی اور برطانیہ آپسی گفت وشنید کے ذریعہ ترکی وعراق کے درمیان سرحد کا مسئلہ بارہ ماہ میں طئے کرلیں۔ اور اگر باہمی طور پر سرحدی تعین نہ کرسکیں تو اسے مجلس اقوام سے رجوع کردیں۔ چونکہ باہمی بات چیت کے ذریعہ مسئلہ طئے نہیں ہوسکا تھا اس لیے برطانیہ نے اس مسئلہ کو مجلس اقوام میں پیش کیا۔ اس شکایت کا جائزہ لینے کے لیے اگست 1924ء میں ایک غیر جانبدار کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سویڈن، بلجیم اور ہنگری اس کمیٹی کے اراکین تھے۔ 1925ء میں اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ

پیش کی۔کمیشن نے اپنی رپورٹ میں موصل پر ترکی کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے یہ سفارش کی کہ مقامی آبادی کے مفادات کی روشنی میں موصل عراق کو دیا جائے۔بشرطیکہ عراق پر 25 برسوں تک برطانیہ کی تولیت ہو۔مجلس اقوام کی کونسل نے اس رپورٹ کو قبول کرلیا۔لیکن کوئی فیصلہ لینے سے قبل کونسل نے اس مسئلہ پر عالمی عدالت کی رائے لینا چاہی۔عدالت نے کونسل کے فیصلہ کی اطاعت کو دونوں فریقوں کے لیے لازمی قرار دیا۔تب کونسل نے اپنا فیصلہ عراق کے حق میں دیا۔جس کی وجہ سے ترکی مجلس اقوام سے مایوس ہوگیا۔لیکن بعد میں برطانیہ،عراق اور ترکی کے درمیان ایک معاہدہ طئے پایا جس کی رو سے ترکی نے موصل پر عراق کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرلیا۔

ناکامیاں

1. آرمینیا تنازعہ Armenia Dispute

پہلی جنگ عظیم کے بعد قایم ہونے والی نئی مملکتوں میں آرمینیا بھی ایک نئی مملکت تھی جسے ترکی اور روس کے سرحدی علاقوں کو ملا کر 1920ء میں قایم کیا گیا تھا۔اس کا پورا نام مملکت جمہوریہ آرمینیا تھا۔اسے ایک تولیتی علاقہ قرار دیتے ہوئے مجلس اقوام نے اس کا انتظام امریکہ کے سپرد کیا۔لیکن امریکہ اس کی تولیت قبول کرنے سے انکار کردیا۔آرمینیا اور ترکی کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی۔بالآخر ترکی آرمینیا پر قبضہ کرلیا۔اور مجلس اقوام دیکھتی رہ گئی۔

2. ولنا تنازعہ Vilna Dispute

ولنا شہر کے متعلق پولینڈ اور لتھوانیا کے درمیان جھگڑا شروع ہوا۔تاریخی طور پر 1795ء سے ولنا لتھوانیا کا صدر مقام تھا۔لیکن 1795ء میں روس اس کو فتح کرلیا تھا۔معاہدہ ورسیلز میں شہر ولنا لتھوانیا کو لوٹا دیا گیا۔لیکن پولینڈ اس پر اپنا ادعا بتاتے ہوئے اس پر قبضہ کرلیا۔فرانس، یونان، برطانیہ اور اٹلی پولینڈ کی تائید کیے۔مجلس اقوام کی کونسل نے پولینڈ اور لتھوانیا کے درمیان نئی سرحد کھینچتے ہوئے ولنا شہر پولینڈ کو دے دیا۔

3. کرفو تنازعہ Corfu Dispute

اگست 1923 میں اٹلی اور یونان کے درمیان ایک تنازعہ پیدا ہوا جو کرفو تنازعہ کے نام سے مشہور ہوا۔بین الاقوامی کمیشن کے تحت سرحد کی حد بندی میں مصروف ایک اطالوی جنرل کا یونان میں قتل ہوا۔اٹلی کی فاشسٹ حکومت نے یونان سے اس واقعہ کے لیے معافی مانگنے اور بطور

معاوضہ پچاس ملین ڈالر ادا کرنے کا مطالبہ کیا اور اس کے لیے چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم بھی دیا گیا۔یونان کی حکومت مجلس اقوام کی کونسل سے رجوع ہوئی اور اس مسئلہ کو پر امن طور پر حل کرنے کی خواہش کی۔اس کے ساتھ ساتھ یونان کی حکومت سفراء کی کانفرنس (Conference of Ambassadors) سے بھی اس مسئلہ کو رجوع کی۔اس دوران اٹلی یونان کے جزیرہ کرفو پر بمباری کے بعد اس پر قبضہ کرلیا۔مجلس اقوام نے یونان کو حکم دیا کہ وہ معاوضہ کی رقم عالمی عدالت (World Court) میں جمع کرادے اور اس کے فیصلے کا انتظار کرے۔لیکن مسولینی مجلس اقوام کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے جزیرہ کرفو پر اپنا قبضہ برقرار رکھا اور مجلس اقوام کے اختیار کو ماننے سے انکار کردیا۔

4. منچوریا کا بحران Manchurian Crisis

مجلس اقوام کی ناکامیوں کے واقعات میں منچوریا کا تنازعہ بڑا اہم ہے۔جاپان 18 سپٹمبر 1931ء کو منچوریا پر حملہ کیا۔چین 21 سپٹمبر 1931ء کو مجلس اقوام سے مدد کی اپیل کیا۔ مجلس اقوام نے جاپانی افواج کو منچوریا سے نکل جانے کا حکم دیا۔لیکن جاپان اس حکم کی ان سنی کردیا۔جاپانی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے چین مجلس اقوام سے مدد کی اپیل کیا۔مجلس اقوام نے Lord Lytton کی صدارت میں ایک پانچ رکنی کمیشن مقرر کیا۔جاپان مزید آگے بڑھتے ہوئے شنگھائی پر حملہ کیا۔چین مجلس اقوام سے ایک بار پھر اپیل کیا۔لٹن کمیشن نے نومبر 1932ء میں پیش کردہ اپنی رپورٹ میں منچوریا میں ایک خود مختار چینی حکومت کے قیام کے سفارش کی۔مجلس اقوام کی اسمبلی نے جاپانی حملوں کی مذمت کرتے ہوئے کمیشن کی رپورٹ کو قبول کرنے جاپان سے کہا۔لیکن مارچ 1933ء میں جاپان مجلس اقوام کی رکنیت سے ہی مستعفی ہوگیا۔

جولائی 1937ء میں جاپان چین پر حملہ کردیا اور 27 جولائی کو چین کے صدر مقام پیکنگ پر قبضہ کرلیا۔چین ، جاپان کے خلاف معاشی تحدیدات عائد کرنے کی مجلس اقوام سے اپیل کیا۔لیکن مجلس اقوام کے اراکین اس کے لیے تیار نہیں تھے۔سپٹمبر 1938ء کو چین مجلس اقوام سے پھر ایکبار اپیل کیا جو بے سود ثابت ہوئی۔بالآخر 1939ء میں یہ تنازعہ دوسری جنگ عظیم کا ہی ایک حصہ بن گیا۔یہ مجلس اقوام کی بہت بڑی ناکامی تھی جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

5. جنگ ابی سینیا Abysinian War 1934-37

اٹلی 1896ء میں ایتھوپیا (حبش) سے جنگ میں شکست کھا چکا تھا اور وہ بدلہ لینے کے

لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ایتھوپیا مشرقی آفریقہ میں اریٹریا اور صومالیہ کے درمیان واقع ہے۔صومالیہ اٹلی کی نوآبادی تھا۔4 ستمبر 1934ء کو ابی سینیا کے سرحدی دیہات وال وال میں ہوئی فوجی جھڑپوں میں اٹلی کے تیرہ فوجی مارے گئے۔اٹلی اس واقعہ کے لیے ایتھوپیا سے معافی مانگنے اور معاوضہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔14 ڈسمبر 1934ء کو ایتھوپیا مجلس اقوام سے اپیل کیا اور مجلس اقوام نے اس واقعہ کی چھان بین کے لیے ایک چھ رکنی کمیشن کا تقرر کیا۔3 ستمبر 1935ء کو کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس واقعہ کے لیے کسی کو ذمہ دار قرار نہیں دیا۔لیکن مسولینی رپورٹ کو رد کرتے ہوئے ایتھوپیا میں افواج کو روانہ کیا۔ایتھوپیا پھر ایک بار مجلس اقوام سے اپیل کیا۔اس کے باوجود اٹلی 3 اکٹوبر 1935ء کو ایتھوپیا پر حملہ کیا۔ 19 اکٹوبر 1935ء کو مجلس اقوام کی اسمبلی نے اس حملہ کی مذمت کرتے ہوئے اٹلی کے خلاف معاشی تحدیدات عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔لیکن برطانیہ اور فرانس تیل پر تحدیدات اور اٹلی کے لیے نہر سویز کو بند کرنے کے خلاف تھے۔ بالآخر اٹلی 5 مئی 1936ء کو ایتھوپیا کے صدر مقام عدیس ابابا پر قبضہ کرلیا۔ 30 جون 1936ء کو ایتھوپیا کے شہنشاہ ہیل سلاسی خود بہ نفس نفیس مجلس اقوام کی اسمبلی میں پیش ہوکر سوال کیا کہ آخر وہ کب اپنے وطن لوٹے گا اور اپنے عوام کو جواب دے گا۔دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے سے یہ جنگ اس کا ایک حصہ بن گئی۔

مجلس اقوام کی ناکامی کی وجوہات

مجلس اقوام جزوی طور پر ہی بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینے میں کامیاب رہی ، لیکن یہ بین الاقوامی امن اور سلامتی کو فروغ دینے میں بالکلیہ طور پر ناکام رہی۔اس کے قیام کے ایک دہے بعد ہی سے اس کی ناکامی کے آثار واضح ہونے لگے تھے اور دو دہے بعد دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور لیگ کا خاتمہ ہوا لیکن کسی نے بھی لیگ کے خاتمہ پر دو آنسو نہیں بہائے بلکہ اس کی ناکامیوں کی وجوہات تلاش کرنے لگے۔بعض کے نزدیک لیگ کی ناکامی کی بڑی وجہ اس کی اجتماعی سلامتی کے نظام کی ناکامی تھی تو بعض کے نزدیک اس کی ناکامی کی اہم وجہ امریکہ کی عدم شمولیت تھی۔ذیل میں مجلس اقوام کی ناکامی کی وجوہات کا جائزہ لیا جائے گا۔

1. مجلس اقوام کی ناکامی کی پہلی وجہ یہ تھی کہ یہ امن سمجھوتہ ومعاہدہ ورسیلز کا لازمی حصہ تھی۔چنانچہ معاہدہ ورسیلز کے ابتدائی 26 دفعات مجلس اقوام کا میثاق (Covenant) بنے۔ چونکہ قوموں کو معاہدہ ورسیلز میں اعتماد نہیں تھا اور وہ اسے جبری و یک طرفہ وانتقامی معاہدہ سمجھتے تھے

چنانچہ اس کے ذریعہ سے قایم ہونے والے ادارے کو بھی وہ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔دوسری طرف بہت سے ممالک اس کے رکن نہیں بنے حتیٰ کہ امریکہ بھی اس کا رکن نہیں بنا۔جاپان، جرمنی و اٹلی بھی مجلس اقوام سے دستبردار ہوگئے جس کی وجہ سے مجلس اقوام ناکام ہوگئی۔

2. یہ محسوس کیا گیا کہ مجلس اقوام پر صرف دو بڑی طاقتوں برطانیہ اور فرانس کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے دوسرے ممالک کا مجلس اقوام میں اعتماد متزلزل ہوگیا۔

3. جن حالات میں مجلس اقوام کا قیام عمل میں آیا تھا وہ مجلس اقوام کی کارکردگی کے لیے سازگار نہیں تھے۔چنانچہ ان نامساعد حالات میں مجلس اقوام کی جانب سے عالمی امن کی برقراری کی کوششیں ایک معجزہ سے کم نہیں تھیں۔اگر امن سمجھوتہ انصاف اور غیر جانبداریت پر مبنی ہوتا تو شاید مجلس اقوام امن کے قیام میں کامیاب ہوتی۔لیکن چونکہ معاہدہ ورسیلز کی بنیادیں غیر منصفانہ تھیں اس لیے جرمنی اس کی مخالفت کرتا رہا۔جرمنی معاہدہ ورسیلز کی شرائط کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔چنانچہ ایسے حالات میں مجلس اقوام امن کے قیام میں ناکام ہوگئی۔

4. اجتماعی سلامتی کا نظام مجلس اقوام کی بنیاد تھا، لیکن یہ نظام مشکلات اور کمزوریوں سے پُر تھا۔اس نظام کی عمل آوری میں پہلی مشکل یہ تھی کہ بعض ممالک امیر تھے اور بعض غریب' بعض اقوام قدرتی وسائل سے مالا مال تھے تو بعض ممالک جغرافیائی و حکمت عملی کے اعتبار سے اہمیت کے حامل تھے۔معاشی طور پر ترقی یافتہ ممالک کی نوآبادیات تھیں اور عالمی بازار پر ان کا قبضہ تھا۔ایسے ممالک ''جوں کی توں'' صورت حال برقرار رکھنا چاہتے تھے۔چنانچہ مجلس اقوام میں تمام ممالک کا مفاد مشترک نہیں تھا اس وجہ سے اجتماعی سلامتی کا نظام غیر کارکرد ہوا۔دوسری طرف حملہ آور کے خلاف کوئی مشترکہ فیصلہ لیا بھی جائے تو اس کی عمل آوری مشکل تھی۔

5. اٹلی، جرمنی اور جاپان میں آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کے عروج سے بھی مجلس اقوام کو ناکامی کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔جاپان نئے علاقوں کو فتح کرنا چاہتا تھا اور اس کی بے جا حب الوطنی بین الاقوامی قانون اور اخلاق کے اُصولوں کو نظرانداز کرگئی۔جاپان منچوریا میں اپنے حملوں کو روکنے کے بجائے مجلس اقوام سے دستبرداری اختیار کرلیا۔اسی طرح ابی سینیا اٹلی کے حملوں کے خلاف جب مجلس اقوام عملی اقدامات کرنا چاہی تو اٹلی لیگ کی رکنیت سے مستعفی ہوگیا۔ادھر جرمنی بھی معاہدہ ورسیلز کے تحت اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے تیار نہیں تھا اور وہ بھی مجلس اقوام کو خیر باد کہہ دیا۔ممالک صرف اس وقت تک ہی مجلس اقوام کا رکن بنے رہنا

چاہتے تھے جب تک کہ اس کے ذریعہ ان کے مفادات کی تکمیل ہوتی ہو۔

6. مجلس اقوام کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجلس اقوام حکومتی عہدیداروں پر مشتمل ایک تنظیم تھی۔اسے آج اقوامِ متحدہ کی طرح کوئی عوامی تائید یا مدد حاصل نہیں تھی۔چنانچہ مجلس اقوام ایک وسیع عوامی ادارہ نہیں بن سکی۔

7. مجلس اقوام کی ناکامی کی ایک اور وجہ اس کی دستوری خامیاں تھیں جو اس کے قیام کے وقت سے ہی پائی جاتی تھیں۔پہلی خامی تو متفقہ فیصلوں کی تھی۔میثاق کی دفعہ 5 کے مطابق کسی مسئلہ پر فیصلہ کرنے کے لیے اسمبلی یا کونسل کے حاضر اراکین کی متفقہ مرضی ضروری تھی۔ جو کہ ایک ناممکن سی بات تھی۔چونکہ بین الاقوامی امن کے قیام سے متعلق شاید ہی کوئی مسئلہ ایسا ہو جب تمام ممالک متفقہ فیصلہ لے سکیں۔دوسری خامی یہ تھی کہ اسمبلی اور کونسل کے کاموں کے درمیان کاموں اور ان کے اختیارات کی تقسیم واضح نہیں تھی اور جب کوئی نازک مسئلہ پیدا ہوتا تو دونوں ہی'' پہلے آپ پہلے آپ'' کی صورتحال میں ہوتے اور دونوں ایک دوسرے پر تکیہ کرتے۔تیسری خامی یہ تھی کہ کسی نازک صورتحال سے اسمبلی یا کونسل کو واقف کرانے کا اختیار سکریٹری جنرل کو نہیں تھا بلکہ وہ اسمبلی یا کونسل کا اجلاس صرف اس وقت ہی طلب کرسکتا تھا جب تک کہ مسئلہ کا فریق مسئلہ کی طرف اس کی توجہ مبذول نہ کرواتا۔اس کے علاوہ مجلس اقوام کے ہاتھ کوئی بین الاقوامی پولیس یا فوج نہیں تھی جس کو حملہ آور کے خلاف فوری استعمال کرسکتا۔اس کے ساتھ ساتھ مجلس اقوام سے دستبرداری کسی بھی ملک کے لیے آسان تھی۔چنانچہ کوئی بھی ملک دوسال کی نوٹس دے کر مجلس اقوام کی رکنیت سے دستبرداری اختیار کرسکتا تھا۔

8. مجلس اقوام کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی سمجھی جاتی ہے کہ امریکہ مجلس اقوام کا رکن نہیں بنا تھا حالانکہ مجلس اقوام کا بانی وہی تھا۔ان دنوں روایتی طور پر امریکہ بیرونی امور میں عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند تھا اس لیے امریکی عوام نے مجلس اقوام میں اپنی شمولیت کو ضروری نہیں سمجھا تھا۔چنانچہ امریکہ مجلس اقوام کا رکن نہیں بنا تھا۔

9. مجلس اقوام کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ دنیا کے لیے پہلا اور انوکھا تجربہ تھا۔اس کی نوعیت وفاق یا کانفیڈریشن سے جداگانہ تھی۔مجلس اقوام عالمی حکومت کا پہلا تجربہ تھی۔قوموں کو اس سے پہلے بین الاقوامی معاملات کو ایک فورم میں پیش کرنے اور انہیں حل کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے اس کا اجتماعی سلامتی کا نظام کام نہیں کرسکا اور یہ ناکام ہوگئی

10. چھوٹے اقوام کو لیگ میں کوئی اعتماد نہیں تھا۔اجتماعی سلامتی کا اُصول عملی طور پر کبھی کارگر نہیں ہوا۔اگر تمام ممالک منچوریا اور ابی سینیا پر جاپان و اٹلی کے حملوں کے خلاف متحد ہوئے ہوتے تو ان حملوں اور ان کی تباہ کاریوں کو روکا جاسکتا تھا اور اس سے مجلس اقوام کا وقارو اعتیار بلند ہوتا۔چونکہ ہر ملک اپنے مفادات کے تابع ہوکر کام کرنا چاہتا تھا خصوصاً بڑی طاقتیں اس لیے لیگ چھوٹے ممالک میں کوئی اعتماد پیدا نہیں کرسکی۔

☆☆☆

باب 12

تنظیم اقوام متحدہ

The United Nations Organization

یہ نام یعنی ''اقوام متحدہ'' امریکی صدر فرینکلن ڈی۔ روزویلٹ (F.D.Roosevelt) نے تجویز کیا تھا اور سب سے پہلے یکم جنوری 1942ء کو اقوام منشورِ متحدہ میں اس وقت استعمال کیا گیا جب چھبیس ملکوں کے مندوبین نے اپنی حکومتوں کی طرف سے یہ عہد کیا کہ وہ محوری طاقتوں کے خلاف مشترکہ جد وجہد کرتے رہیں گے۔ اقوام متحدہ کا منشور پچاس ملکوں کے نمائندوں نے 25 اپریل سے 26 جون 1945ء تک سان فرانسسکو میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں تیار کیا تھا۔ چین، روس، برطانیہ اور امریکہ کے مندوبین نے 1944ء میں ڈمبارٹن اوکس میں اگست سے اکتوبر تک منعقدہ کانفرنس میں اقوام متحدہ کے قیام کی سفارش کی تھی۔ اقوام متحدہ کے منشور پر 26 جون 1945ء کو دستخط کیے گئے۔ پولینڈ جو کہ کانفرنس میں شریک نہیں تھا، بعد میں اس پر دستخط کیا اور اس طرح وہ بھی اکیا ساسی ممبر ملکوں میں شامل ہوگیا۔ باضابطہ طور پر اقوام متحدہ کا قیام 24 اکتوبر 1945ء کو اس وقت عمل میں آیا جب چین، فرانس، روس، برطانیہ اور امریکہ کی حکومتوں نے منشور کی توثیق کردی۔ اسکے علاوہ دیگر بہت سے ممالک نے بھی منشور پر دستخط کیے۔ اب ساری دنیا میں 24 اکتوبر ''یوم اقوام متحدہ'' کے طور پر منایا جاتا ہے۔

منشور کا دیباچہ

اقوام متحدہ کے دیباچۂ منشور میں ان تمام لوگوں کے نظریات اور مشترکہ مقاصد کا اعلان کیا گیا ہے جن کی حکومتوں نے باہمی اشتراک کے ذریعہ اقوام متحدہ کی بنا ڈالی تھی۔ منشور میں اراکین اقوام متحدہ نے اس بات کا عہد کیا کہ:

1. اپنی آئندہ نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھیں گے۔
2. حقوقِ انسانی، عظمتِ انسانی اور قدر و قیمت، مردوں، عورتوں کے مساوی حقوق اور چھوٹی بڑی تمام قوموں کی برابری کو قایم کریں گے۔
3. ایسے حالات پیدا کرینگے جن کے تحت حق و انصاف کا چرچا ہو، معاہدوں کے تحت قبول کی جانے والی ذمہ داریوں کا احترام ہو اور دیگر بین الاقوامی قوانین کے تقاضوں کی تکمیل ہو سکے۔
4. انسانوں کی سماجی ترقی اور بہتر معیار زندگی کے لیے اور زیادہ کھلی فضا میں کام کریں گے۔

5. ہم اصول رواداری پر عمل پیرا ہوں گے اور اچھے ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ پر امن زندگی بسر کریں گے
6. اپنی طاقت وقوت کو بین الاقوامی امن وسلامتی کے لیے منظم کریں گے۔
7. اس بات کو ملحوظ رکھیں گے کہ طریق کار اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے' مشترکہ مفاد سے ہٹ کر اور کسی صورت میں مسلح طاقت کا استعمال نہیں کریں گے۔
8. بین الاقوامی مشنری کو تمام انسانوں کے سماجی اور اقتصادی ترقی کو فروغ دینے کے لیے بروئے کار لائیں گے۔

منشور کے مطابق اقوام متحدہ کے حسبِ ذیل مقاصد ہیں۔

1. بین الاقوامی امن اور سلامتی کو برقرار رکھنا۔
2. قوموں اور ملکوں کے درمیان دوستانہ رشتوں کو فروغ دینا۔
3. بین الاقوامی معاشی' سماجی' ثقافتی اور انسانی مسائل حل کرنا اور انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کی سر بلندی کے لیے بین الاقوامی سطح پر تعاون کرنا۔
4. ان مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے قوموں کے اقدامات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے ایک مرکز کا کام کرنا۔

اصول

1. اس کی بنیاد تمام ممبر ملکوں کی خودمختاری اور برابری کے نظریے پر رکھی گئی ہے۔
2. منشور کے تحت تمام ممبر ممالک نیک نیتی کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے۔
3. امن' سلامتی اور انصاف کو خطرے میں ڈالے بغیر ممالک اپنے تمام بین الاقوامی تنازعات' پرامن طور پر حل کریں گے۔
4. ممالک اس بات کا ذمہ لیں کہ وہ بین الاقوامی تعلقات میں دوسرے ممالک کے خلاف نہ تو طاقت کا استعمال کریں گے اور نہ ہی طاقت استعمال کرنے کی دھمکی دیں گے۔
5. تنظیمِ اقوام متحدہ اپنے منشور کے تحت جو قدم بھی اٹھائے گی ممبر ممالک اس کو ہر قسم کی مدد دیں گے۔
6. اقوام متحدہ اس بات کا خیال رکھے گی کہ جہاں تک بین الاقوامی امن اور سلامتی کی برقراری کا تعلق ہے' وہ ممالک بھی جو ممبر نہیں ہیں ان ہی اصولوں پر عمل کریں گے۔
7. منشور میں اقوام متحدہ کو ممبر ممالک کے خالص داخلی معاملات میں مداخلت کا اختیار نہیں دیا گیا۔

اقوام متحدہ کی رکنیت ان تمام امن پسند ملکوں کے لیے ہے جو منشورِ اقوام متحدہ کے تحت عائد کردہ ذمہ داریوں کو قبول کرنے کیلیے تیار ہوں اور عالمی ادارے کے خیال میں ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے خواہاں اور اہل ہوں۔ اقوام متحدہ کے اصل اور اساسی ارکان وہ ممالک ہیں جنہوں نے سان فرانسسکو کانفرنس میں شرکت کی تھی یا اقوام کے متحدہ کے اعلان پر یکم جنوری 1942ء کو دستخط کیے تھے اور منشور کی توثیق کی تھی۔ سلامتی کونسل کی سفارشات پر جنرل اسمبلی، دوسرے ممالک کو ادارے کا ممبر بنا سکتی ہے۔ جنرل اسمبلی سلامتی کونسل کی سفارش پر ممبر ملکوں کی رکنیت خارج کرسکتی ہے یا انہیں رکنیت سے معطل کرسکتی۔ اگر ان ممالک کے خلاف سلامتی کونسل کوئی تادیبی کارروائی کررہی ہو تو انہیں رکنیت سے معطل کیا جاسکتا ہے۔ سلامتی کونسل چاہے تو کسی معطل شدہ ممبر ملک کے حقوق دوبارہ بحال کرسکتی ہے۔

اہم ادارے　　Main Organs

جنرل اسمبلی

دفعات 9 تا 22 جنرل اسمبلی کی ساخت و فرائض سے متعلق ہیں۔ جنرل اسمبلی تمام ممبر ملکوں پر مشتمل وہ ادارہ ہے جہاں اقوام متحدہ کے ممبر ممالک کے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا جاتا ہے۔ وہ منشور کے حدود کے اندر رہتے ہوئے تمام معاملات سے متعلق بحث کے بعد اپنی جانب سے سفارشات پیش کرتی ہے۔ کسی حکومت کو کسی خاص اقدام کے لیے مجبور کرنے کا اسے اختیار نہیں ہے۔ تاہم اس کی سفارشات عالمی رائے عامہ کی مظہر ہونیکی وجہ سے اخلاقی وزن کی حامل ہوتی ہیں۔ جب نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں تو اسمبلی ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اقدامات کرتی ہے۔ اور یہ اقدامات انسان دوستی پر مبنی کوششوں سے لے کر ترقیاتی پروگراموں، نوآبادیاتی نظام اور نسلی علیحدگی کے خلاف مہمات، عالمی دلچسپی کے معاملات مثلاً سمندروں اور بیرونی خلاء سے متعلق معاہدوں پر مذاکرات تک محیط ہیں۔

فرائض

1. دفعہ 11(1) کے مطابق عالمی امن اور سلامتی برقرار رکھنے کے لیے تعاون کے اصولوں پر تبادلۂ خیال کرنا اور سفارشات پیش کرنا، ان میں تخفیف افواج و اسلحہ پر مبنی اصولوں کے علاوہ اسلحہ کے لیے قواعد وضوابط بنانا بھی شامل ہے۔
2. دفعہ 10 کے مطابق عالمی امن و سلامتی پر اثر انداز ہونے والے کسی بھی مسئلے پر تبادلہ خیال کرنا اور اور اس بارے میں سفارشیں کرنا۔ البتہ ان میں وہ حالات اور مسائل شامل نہیں ہوں گے جو اس وقت سلامتی کونسل میں زیرِ غور ہیں۔

3. اسی اصول کے مطابق منشور کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کسی معاملے کے بارے میں سفارشیں پیش کرنا۔ ان میں وہ معاملات بھی شامل ہیں جن کا اقوام متحدہ کے کسی ادارے کے اختیارات و فرائض پر اثر پڑتا ہو۔
4. بین الاقوامی قانون کی ترتیب وتدوین' بین الاقوامی قانون' سیاسی تعاون کا فروغ 'سب کیلیے حقوق انسانی' بنیادی آزادیوں کا حصول' سماجی' ثقافتی' معاشی' صحت اور تعلیمی شعبوں میں بین الاقوامی تعاون بڑھانے کی تدبیریں معلوم کرنا اور سفارشیں کرنا۔
5. ہر اس معاملے کے پرامن تصفیئے کے لیے سفارش کرنا جس سے ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو' خواہ یہ معاملہ کسی بھی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔
6. سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے دوسرے اداروں کی رپورٹیں وصول کرنا اور ان پر تبادلہ خیال کرنا۔
7. خصوصی اہمیت کے علاقوں کے سوا' تمام علاقوں کے لیے تولیتی معاہدوں پر عملدرآمد کرانے کے لیے تولیتی کونسل کے ذریعے نگرانی کرنا۔
8. اقوام متحدہ کے بجٹ پر تبادلہ خیال کے بعد اس کی منظوری دینا' ممبروں کے درمیان حصہ رسدی کا تعین کرنا اور مخصوص اداروں کے بجٹ کی جانچ کرنا۔
9. سلامتی کونسل کے غیر مستقل ممبروں' سماجی و معاشی کونسل کے ممبروں اور تولیتی کونسل کے لیے ان ممبروں کا انتخاب کرنا۔ بین الاقوامی عدالت انصاف کے لیے جس کے انتخاب میں سلامتی کونسل کے ساتھ حصہ لینا۔ اور سلامتی کونسل کی سفارش پر سیکریٹری جنرل کا تقرر کرنا۔
10. اہم معاملات مثلاً امن و سلامتی سے متعلق سفارشات' اداروں کے ممبروں کے انتخاب' ممبروں کے داخلے' معطلی یا اخراج' تولیتی مسائل اور بجٹ کے معاملات سے متعلق فیصلے دو تہائی ووٹوں کے ذریعہ کیے جاتے ہیں۔

جنرل اسمبلی نے نومبر 1950ء میں ''اتحاد برائے امن'' کے عنوان سے ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ اگر سلامتی کونسل اپنے مستقل ممبروں میں عدم اتفاق کے باعث قیام امن کی بنیادی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام رہے' اور ایسی صورت میں جب کہ امن خطرے میں ہو یا نقض امن یا جارحیت کا اندیشہ ہو تو جنرل اسمبلی اقدام کر سکتی ہے۔ اسمبلی کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اجتماعی اقدامات کے لیے ممبروں کو اپنی سفارشات پیش کرنے کی غرض سے اس معاملے پر فوراً تبادلہ خیال کا اہتمام کرے ان اقدامات میں مسلح طاقت کا استعمال بھی شامل ہے جس کی سفارش اس صورت میں کی

جائے گی جب نقض امن یا جارحیت کے اقدام کا اندیشہ ہو یا بین الاقوامی امن اور سلامتی کے قیام یا اس کی بحالی کے لیے ایسی سفارش ضروری ہو۔

جنرل اسمبلی کا باضابطہ اجلاس سال میں ایک بار ہوتا ہے جس کا آغاز ستمبر کے تیسرے منگل کے دن ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ سلامتی کونسل کی درخواست پر اور اقوام متحدہ کے ممبروں کی اکثریت یا اگر وہ رضا مند ہو جائیں تو ایک ممبر کی درخواست پر بھی جنرل اسمبلی کا خاص اجلاس بلایا جا سکتا ہے۔ جنرل اسمبلی کا ایک ہنگامی خصوصی اجلاس بلانے کے لیے جو چوبیس گھنٹے کے اندر طلب کیا جا سکتا ہے اس کے لیے ضروری ہیکہ سلامتی کونسل اپنے کسی بھی نو ممبروں کی حمایت یا اقوام متحدہ کے ممبروں کی اکثریت کے ذریعہ خصوصی اجلاس طلب کرنے کی درخواست کرے۔ جنرل اسمبلی کے ہر ممبر کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔

جنرل اسمبلی اپنے فرائض سات بڑی کمیٹیوں کے ذریعہ انجام دیتی ہے ان کمیٹیوں میں تمام ممبروں کو نمائندگی کا حق حاصل ہے۔ ان کمیٹیوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

1. پہلی کمیٹی برائے سیاست وسلامتی کے امور جن میں اسلحہ جات کے ضابطے بھی شامل ہیں
2. خصوصی سیاسی کمیٹی جو پہلی کمیٹی کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہے
3. مالیاتی اور معاشی کمیٹی
4. انسانی سماجی اور ثقافتی کمیٹی
5. نو آبادیاتی نظام کے خاتمے سے متعلق کمیٹی
6. انتظامی امور اور بجٹ سے متعلق کمیٹی
7. قانونی کمیٹی۔

اگرچہ اسمبلی کا باقاعدہ اجلاس ہر سال صرف تین ہی ماہ ہوتا ہے تاہم اسمبلی کا کام خصوصی کمیٹیوں کے ذریعہ مسلسل جاری رہتا ہے۔

سلامتی کونسل Security Council

منشور کی دفعات 23 تا 54 سلامتی کونسل کی ساخت وفرائض سے متلق ہیں۔ سلامتی کونسل وہ ادارہ ہے جس پر امن وسلامتی کے قیام کی زیادہ تر ذمہ داری ہے۔ سلامتی کونسل پندرہ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں پانچ چین، فرانس، روس، برطانیہ اور امریکہ مستقل ارکان ہیں۔ باقی دس ارکان کا انتخاب دو سال کی میعاد کے لیے جنرل اسمبلی کی جانب سے کیا جاتا ہے۔

کونسل کے ہر رکن کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔ طریقہ کار کے معاملات سے متعلق فیصلے پندرہ ارکان

میں سے کم از کم نو کے مثبت ووٹوں سے ہوتے ہیں۔ مستقل معاملات سے متعلق فیصلوں کے لیے بھی نو ووٹ مطلوب ہوتے ہیں جن میں پانچوں مستقل ارکان کے مثبت ووٹ بھی شامل ہیں۔ یہ ضابطہ "عظیم طاقتوں کے اتفاق رائے" کا مظہر ہے۔ جسے اکثر اوقات "ویٹو" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی مستقل رکن کسی فیصلے کی حمایت نہیں کرتا لیکن ویٹو کے ذریعہ اسمیں رخنہ ڈالنے کا خواہاں بھی نہیں ہے تو اسے حق حاصل ہیکہ وہ رائے دہی میں شرکت ہی نہ کرے۔ رائے دہی سے الگ رہنا ویٹو تصور نہیں کیا جاتا۔

منشور کے تحت اقوام متحدہ کے تمام ارکان کونسل کے فیصلوں کو تسلیم کرنے اور ان پر عملدر آمد کرنے کا اقرار کرتے ہیں۔ جبکہ اقوام متحدہ کے دوسرے ادارے حکومتوں کو صرف سفارشیں ہی پیش کر سکتے ہیں سلامتی کونسل وہ واحد ادارہ ہے جو فیصلے کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہے جن کا نفاذ ممبر ممالک کو منشور کے تحت لازمی ہے۔ کونسل کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ جہاں کوئی تنازعہ یا ایسی صورت حال نمودار ہو جو دو یا دو سے زیادہ ممالک کے درمیان کشیدگی کا باعث ہو تو وہ اس کی تحقیقات کرائے۔ جب امن کے لیے خطرے سے متعلق کوئی شکایت اس کے سامنے آتی ہے تو کونسل کا پہلا اقدام عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ فریق پر امن ذرائع سے تصفیئے کی کوشش کریں۔ بعض صورتوں میں کونسل خود ہی تحقیقات کرانے کے بعد تصفیہ کرانے کا ذمہ لیتی ہے۔ وہ چاہے تو خصوصی نمائندے مقرر کرتی ہے یا پھر سکریٹری جنرل سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنے اثر ورسوخ سے کام لیں۔ بعض حالات میں یہ پر امن تصفیئے کے لیے اصول بھی مقرر کر سکتی ہے۔

جب کوئی تنازعہ جنگ کی صورت اختیار کر جاتا ہے تو کونسل کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو اس جنگ کو ختم کرائے۔ کونسل چاہے تو ایسے اقدامات، معاشی سزاؤں (مثلاً تجارتی ناکہ بندیوں) یا مجموعی فوجی اقدام کے نفاذ کا فیصلہ دے سکتی ہے۔ بعض اوقات یہ اقوام متحدہ کی قیام امن کے لیے ذمہ دار فوج کو پر آشوب علاقوں میں بھیجتی ہے۔ تا کہ مخالف افواج ایک دوسرے سے الگ رہ سکیں اور کشیدگیوں میں کمی ہو۔ دفعہ 24 کے مطابق سلامتی کونسل عالمی امن وسلامتی کے تحفظ کے لیے ذمہ دار ادارہ ہے۔ جس کے فرائض اس طرح ہیں۔

1. اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے مطابق بین الاقوامی امن وسلامتی برقرار رکھنا۔
2. ہر ایسے تنازعے یا صورت حال کی تحقیقات کرنا جس سے بین الاقوامی کشیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔
3. ایسے تنازعات کو طئے کرنے کے طریقوں اور شرطوں کی سفارش کرنا۔
4. ترکِ اسلحہ میں باقاعدگی پیدا کرنے کی غرض سے ایک نظام قایم کرنے کے منصوبے تیار کرنا۔

5. نقضِ امن کے اندیشے اور جارحیت کی نشاندہی کرنا اور ضروری اقدامات کی سفارش کرنا۔
6. ممبروں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ جارحیت کو روکنے یا ختم کرنے کے لیے معاشی پابندیاں عائد کریں اور دوسرے اقدامات کریں جن میں طاقت کا استعمال شامل نہیں۔
7. جارحیت کا ارتکاب کرنے والے کے خلاف فوجی اقدام کرنا۔
8. نئے ممبروں کے داخلے کی سفارش کرنا اور ان شرائط کو تجویز کرنا جن کے تحت ممالک بین الاقوامی عدالت انصاف کے تحریری قانون میں شامل ہو سکتے ہوں۔
9. خصوصی اہمیت کے علاقوں میں اقوام متحدہ کے تولیتی فرائض انجام دینا۔
10. جنرل اسمبلی کو سکریٹری جنرل کے تقرر کی سفارش کرنا اور جنرل اسمبلی کے ساتھ مل کر بین الاقوامی عدالت انصاف کے ججوں کا انتخاب کرنا۔
11. سالانہ اور دیگر خصوصی رپورٹیں جنرل اسمبلی کو پیش کرنا۔
12. منشور کی دفعات 5 اور 6 کے تحت کوئی بھی ممبر ملک جس کے خلاف سلامتی کونسل کی جانب سے تادیبی اقدام کیا گیا ہو، کونسل کی سفارش پر جنرل اسمبلی اسے رکنیت کے حقوق اور رعایتوں سے محروم کر سکتی ہے۔ ایک ممبر ملک جس نے منشور میں مندرج اصولوں کی پے در پے خلاف ورزی کی ہو جنرل اسمبلی اسے کونسل کی سفارش پر ادارے سے نکال سکتی ہے۔

سلامتی کونسل اقوام متحدہ کے تمام ممبروں کی جانب سے کام کرتی ہے۔ منشور کی دفعہ 25 کے تحت تمام ممبر ممالک اس کے فیصلوں کو ''منظور کرنے اور ان پر عملدرآمد کرنے سے اتفاق کرتے ہیں''۔ دفعہ 43 کے تحت وہ سلامتی کونسل کو بین الاقوامی امن اور سلامتی کے قیام کے لیے ''مسلح افواج، امداد اور دیگر سہولتیں'' فراہم کرنے کا ذمہ لیتے ہیں۔ سلامتی کونسل کی تشکیل کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ وہ مسلسل اپنے فرائض منصبی کی تکمیل میں سرگرم رہے اور اس کے ہر ممبر ملک کے ایک ایک نمائندہ کا ہر وقت اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں موجود رہنا لازمی ہے۔ کونسل اگر مناسب سمجھے تو وہ ہیڈ کوارٹر کے علاوہ کسی اور جگہ بھی اپنا اجلاس طلب کر سکتی ہے۔ 1972ء میں عدیس ابابا میں اس کا ایک اجلاس منعقد ہوا تھا، جبکہ اس سے پہلے سال اس کا اجلاس پنامہ میں ہوا تھا۔ اگر کوئی ایسا ملک ہے جو اقوام متحدہ کا ممبر ہو لیکن سلامتی کونسل کا ممبر نہ ہو تو وہ اس صورت میں بلا ووٹ اس کے اجلاس کی کارروائی میں حصہ لے سکتا ہے جب کونسل یہ سمجھے کہ متعلقہ معاملے کا اس ملک کے مفادات سے خاص تعلق ہے۔ 1976ء میں مشرقِ وسطیٰ پر جاری مباحث میں حصہ لینے کے لیے PLO کو مدعو کیا گیا تھا۔ جب کونسل میں کوئی معاملہ زیر غور ہو تو اقوام متحدہ کے ممبر

ممالک اور غیر ممبر ممالک دونوں ہی کو جبکہ وہ تنازعات کے فریق ہوں کونسل کی بحث میں حصہ لینے کی دعوت دی جاتی ہے۔ البتہ غیر ممبر ممالک کے سلسلے میں کونسل ان شرائط کا تعین کرتی ہے جن کے تحت انہیں بحث میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی ہو۔ سلامتی کونسل کے اجلاس متعینہ نہیں ہوتے بلکہ ضرورت اور مسائل کے اعتبار سے اس کے اجلاس مستقل ہوتے رہتے ہیں۔ ہر ماہ کے پہلے اجلاس میں انگریزی حروف تہجی کے لحاظ سے صدر کا انتخاب کیا جاتا ہے جو ایک ماہ تک اجلاسوں کی صدارت کرتا ہے۔

معاشی و سماجی کونسل Economic and Social Council

دفعات 61 تا 72 اس کی ساخت وفرائض سے متعلق ہیں۔ معاشی و سماجی کونسل وہ ادارہ ہے جو اقوام متحدہ اور اس کی خصوصی ایجنسیوں کے معاشی و سماجی کاموں میں رابطہ قایم کرتا ہے۔ یہ کونسل سفارشات کرتی ہے اور ترقی، عالمی تجارت، صنعتوں کے فروغ، قدرتی وسائل، انسانی حقوق، خواتین کی حیثیت، آبادی، سماجی بہبود، سائنس وٹکنالوجی، انسداد جرائم اور بہت سے دوسرے معاشی اور سماجی مسائل سے متعلق سرگرمیوں کا آغاز کرتی ہے۔ یہ کونسل 54 ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ 18 ممبر ہر سال جنرل اسمبلی کی جانب سے تین تین سال کی میعاد کے لیے منتخب کئے جاتے ہیں۔ سلامتی کونسل کے مستقل اراکین اس کے بھی رکن ہوتے ہیں۔ معاشی و سماجی کونسل میں ووٹوں کی معمولی اکثریت سے فیصلے کئے جاتے ہیں اور ہر ممبر کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔

فرائض

1. جنرل اسمبلی کے اختیارات کے تحت اقوام متحدہ کی معاشی اور سماجی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنا۔
2. بین الاقوامی معاشی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی اور صحت کے مسائل اور متعلقہ امور کا مطالعہ کرنا، رپورٹیں تیار کرنا اور سفارشیں پیش کرنا۔
3. عالمگیر انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کی پابندی کا اہتمام کرنا اور ان کے لیے احترام کے جذبے کو فروغ دینا۔
4. بین الاقوامی کانفرنسیں طلب کرنا اور ان امور سے متعلق جو اس کے دائرہ اختیار میں ہیں جنرل اسمبلی کے سامنے پیش کرنے کے لیے مسودہ معاہدے مرتب کرنا۔
5. مخصوص اداروں کے ساتھ معاہدے کرنا اور اقوام متحدہ کے ساتھ ان کے تعلقات کا تعین کرنا۔
6. ان اداروں کے مشورے سے اور انہیں سفارشات پیش کر کے جنرل اسمبلی اور اقوام متحدہ کے

ممبروں کو سفارشیں کر کے مخصوص اداروں کی سرگرمیوں میں رابطہ قایم کرنا۔

7. اقوام متحدہ کے ممبروں کے لیے اسمبلی کی جانب سے منظور کردہ خدمات انجام دینا اور جب درخواست کی جائے تو یہی خدمات مخصوص اداروں کے لیے انجام دینا۔

8. کونسل سے متعلق امور کے بارے میں غیر سرکاری اداروں سے صلاح و مشورے کرنا۔

معاشی و سماجی کونسل کے اجلاس عموماً ہر سال دو دو ماہ تک نیویارک اور جنیوا میں ہوتے ہیں۔ تاہم کونسل کی مستقل کمیٹیوں، کمیشنوں اور دوسرے ذیلی اداروں کے اجلاس ہیڈ کوارٹرز میں یا دوسرے مقامات پر سارا سال ہوتے رہتے ہیں۔

حسب ذیل اداروں سے متعلق کئی مستقل کمیٹیاں ہیں۔ مثلاً غیر سرکاری اداروں کی کمیٹی، بین الحکومتی ایجنسیوں کے ساتھ مذاکرات کی کمیٹی، مکانات، تعمیرات اور منصوبہ بندی کی کمیٹی، پروگرام اور رابطہ کی کمیٹی، قدرتی وسائل کی کمیٹی، جائزہ اور تشخیص کی کمیٹی، سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی کمیٹی، انسداد جرائم کی کمیٹی اور ترقیاتی منصوبہ بندی کی کمیٹی۔ غیر ملکی کارپوریشنوں سے متعلق کمیشن بھی ایک مستقل ادارہ ہے۔

مستقل کمیشنوں میں یہ کمیشن شامل ہیں۔ شماریاتی کمیشن، آبادی کمیشن، کمیشن برائے سماجی ترقی، انسانی حقوق سے متعلق کمیشن، خواتین کی حیثیت سے متعلق کمیشن اور منشیات سے متعلق کمیشن۔ انسانی حقوق سے متعلق کمیشن کا ایک ذیلی کمیشن مشرق قریب اور مشرق وسطی میں ناجائز ادویہ کی منتقلی اور متعلقہ معاملات کے بارے میں ہے۔

نیز اس کونسل کے تحت علاقائی معاشی کمیشن ہیں جن کا مقصد اپنے اپنے علاقہ کی معاشی اور سماجی ترقی میں مدد دینا اور ہر علاقہ کے ممالک کے معاشی تعلقات کو خود ان کے درمیان اور دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ مستحکم بنانا ہے۔ وہ کمیشن یہ ہیں۔ معاشی کمیشن برائے یورپ (جنیوا)، معاشی کمیشن برائے لاطینی امریکہ (سنتیاگو) اور معاشی کمیشن برائے مغربی ایشیا (بیروت)۔

یہ علاقائی معاشی کمیشن اپنے اپنے علاقوں کے مسائل کا جائزہ لے کر ممبر حکومتوں اور خصوصی ایجنسیوں کو عملی کورسس کی سفارش کرتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں ان کمیشنوں کے کام میں توسیع کی گئی ہے۔ اور وہ اب ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں زور شور سے حصہ لے رہے ہیں۔

تولیتی کونسل **Trusteeship Council**

دفعات 86 تا 91 اس کی ساخت اور فرائض سے متعلق ہیں۔ اقوام متحدہ کے منشور کے تحت تولیتی کونسل کو یہ کام سونپا گیا تھا کہ وہ عالمی تولیتی نظام کی تحویل میں دیئے گئے وقف علاقوں کے نظم و نسق کی

نگرانی کرے۔اس نظام کے بڑے مقاصد ان علاقوں کے باشندوں کی ترقی کو فروغ دینا اور خودمختاری یا آزادی کی جانب بتدریج ترقی میں ان کی مدد کرنا تھا۔

تولیتی نظام کے مقاصد خاطر خواہ حد تک پورے ہوئے ہیں۔کونسل کے ارکان کی ایک مقررہ تعداد کے بجائے منشور میں تولیتی علاقوں کا نظم ونسق چلانے والے ممالک اور ان ممالک کے درمیان' جو یہ خدمت انجام نہیں دیتے تھے' توازن کی گنجائش رکھی گئی ہے۔جس تناسب سے نظم ونسق چلانے والے ممالک کی تعداد کم ہوتی گئی اسی تناسب سے کونسل کا سائز بھی کم ہوتا گیا۔اب صرف پانچ ارکان رہ گئے ہیں جو یہ ہیں ۔ امریکہ (نظم ونسق چلانے والا ملک) اور سلامتی کونسل کے دوسرے مستقل ممبر (چین' فرانس' برطانیہ' روس)۔

تولیتی کونسل کا فرض تولیتی علاقوں کے نظم ونسق کی نگرانی کرنا ہے۔1947ء میں گیارہ تولیتی علاقوں کا انتظام اس کے ذمہ تھا جو اب آزاد ہو گئے ہیں۔

بین الاقوامی عدالت انصاف

بین الاقوامی عدالت انصاف کا دفتر ہیگ میں ہے۔یہ اقوام متحدہ کا سب سے بڑا عدالتی ادارہ ہے۔یہ عدالت متعلقہ قانون کے تحت کام کرتی ہے اور اس قانون کی دستاویز اقوام متحدہ کے منشور کا ایک لازمی حصہ ہے۔اس عدالت کے دروازے ان تمام اقوام کے لیے کھلے ہیں جو اس قانون کے پابند ہیں۔چنانچہ اقوام متحدہ کے تمام ممبر ملک خود بخود اسمیں شامل سمجھے جاتے ہیں۔اگر کوئی ملک اقوام متحدہ کا ممبر نہ ہو تو بھی بعض شرائط کے تحت اپنے مقدمے بین الاقوامی عدالت میں پیش کرسکتا ہے۔اس کے علاوہ سلامتی کونسل کسی بھی قانونی مسئلے پر عدالت سے مشورہ طلب کرسکتی ہے۔

عدالت کے دائرۂ اختیار میں وہ تمام معاملات شامل ہیں جو مختلف ممالک پیش کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے منشور میں مذکورہ اور دیگر سمجھوتوں اور معاہدوں میں شامل امور بھی عدالت کے دائرۂ اختیار میں آتے ہیں۔مختلف ممالک جب کسی جھگڑے کو عدالت میں پیش کرنا چاہیں تو وہ اپنی درخواست میں یا کسی معاہدے یا عہد نامے کے ذریعہ اس بات کا اعلان و اظہار کرتے ہیں کہ وہ عدالت کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔اگر کوئی فریق عدالت کے فیصلے کے تحت اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام ہو تو دوسرا فریق سلامتی کونسل سے رجوع ہو کر یہ مطالبہ کرسکتا ہے کہ عدالت کے فیصلہ پر عملدرآمد کرانے کے لیے ضروری تدابیر معلوم کی جائیں۔ یہ عدالت پندرہ ججوں پر مشتمل ہوتی ہے جو عدالت کے "ممبر" کہلاتے ہیں۔جنہیں جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل الگ الگ ووٹنگ کے ذریعہ آزادانہ طور پر منتخب کرتی

ہے۔ججوں کا انتخاب ان کی قومیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کی صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ البتہ اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ عدالت میں دنیا کے مختلف اہم ترین نظام ہائے قانون کی نمائندگی ہو۔ایک ہی ملک کے دو افراد اس عدالت کے جج نہیں بن سکتے۔جج نو سال کے لیے ہوتے ہیں اور دوبارہ بھی منتخب ہو سکتے ہیں۔اپنے عہدے کی میعاد کے دوران وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتے۔

سکریٹریٹ

سکریٹریٹ اقوام متحدہ کے دوسرے اداروں کا نظام چلاتا ہے اور ان کے مقرر کردہ پروگراموں اور پالیسیوں پر عملدر آمد کراتا ہے۔سکریٹری جنرل اس کا سربراہ ہوتا ہے جس کا تقرر جنرل اسمبلی کی جانب سے سلامتی کونسل کی سفارش پر کیا جاتا ہے۔اسکے بہت سے فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی ہیکہ وہ ہر ایسے معاملے پر سلامتی کونسل کو متوجہ کرے جسے وہ بین الاقوامی امن وسلامتی کے لیے خطرناک تصور کرتا ہے۔اقوام متحدہ کے پہلے سکریٹری جنرل ناروے کے ٹریگولی تھے۔جنہوں نے 1953ء تک خدمت انجام دی۔سویڈن کے ڈاگ ہمیر شولڈ 1953ء سے لے کر اپنی موت تک، جو 1961ء میں جہاز کے ایک حادثے میں آفریقہ میں واقع ہوئی' اس عہدے پر فائز رہے۔ان کے بعد ان کی جگہ برما کے یوتھان اس عہدے پر مامور ہوئے۔ڈسمبر 1971ء میں آسٹریا کے ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائیم کی تقرری عمل میں آئی اور جنوری 1972ء میں انہوں نے اس عہدے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ڈسمبر 1976ء میں مسٹر والڈ ہائیم دوسری میعاد کے لیے منتخب ہوئے۔1981ء میں پیرو کے جاویر پیرز ڈ کیولر اور 1991ء میں مصر کے بطروس بطروس غالی کے بعد گھانا کے کوفی عنان 2001ء سے شروع ہوئی اپنی دوسری میعاد میں کام کر رہے ہیں۔سکریٹریٹ' جو ہیڈ کوارٹر میں اور دوسرے مقامات پر کام کرنے والے بین الاقوامی عملے پر مشتمل ہوتا ہے' اقوام متحدہ کا روزمرہ کا کام انجام دیتا ہے اسکے عملے کے افراد ممبر ممالک کے باشندوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔بین الاقوامی سول ملازمین کی حیثیت سے وہ اس ادارے کے لیے کام کرتے ہیں۔ ہر ملازم اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ نہ تو کسی حکومت یا بیرونی طاقت سے ہدایات کا طالب ہوگا اور نہ ہی ان کی ہدایات قبول کرے گا۔اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ 100 کے تحت ہر ممبر ملک اس بات کی حامی بھرتا ہے کہ وہ سکریٹری جنرل اور ان کے عملے کی ذمہ داریوں کی مخصوص بین الاقوامی نوعیت کا احترام کرے گا اور ان کے فرائض کی عمل آوری میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔

سکریٹری جنرل اور ان کے عملے کا کام بھی اتنا ہی زیادہ ہے جتنا کہ اس کے مسائل کی فہرست جن سے اقوام متحدہ کو عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔اثر ورسوخ اور بعض اوقات بین الاقوامی تنازعات کے حل

کے لیے رسمی مصالحت، بحالی امن کی کارروائیوں کا انتظام کرنا، سرکاری نمائندوں کے ساتھ تبادلہ خیال کرنا، دنیا کے معاشی رجحانات اور مسائل کا جائزہ لینا، انسانی حقوق اور قدرتی وسائل کا مطالعہ اور بین الاقوامی کانفرنسوں کا انتظام کرنا۔ اعداد وشمار مرتب کرنا، سلامتی کونسل یا دوسرے اداروں کے فیصلوں پر عمل آوری کا جائزہ لینا۔ اور ذرائع ابلاغ کو اقوام متحدہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنا اس کے فرائض میں شامل ہے۔

اقوام متحدہ کے خصوصی ادارے

بچوں کے لیے خصوصی فنڈ UNICEF

بچوں کے لیے اقوام متحدہ کا فنڈ (UNICEF) جنرل اسمبلی کی جانب سے 11 ڈسمبر 1946ء کو قایم کیا گیا تھا۔ اس کا کام ترقی پذیر ملکوں کو بلالحاظ نسل، مذہب یا سیاست ان کے بچوں اور نوجوانوں کے حالات بہتر بنانے میں مدد دینا ہے۔ بچوں کا یہ فنڈ حکومتوں کی درخواست پر ہی ممالک کو ان کے خاص طور پر ایسے منصوبوں میں مدد دیتا ہے جو قومی ترقیاتی پروگراموں کا جزو ہوتے ہیں۔ فی الحال بچوں کا یہ فنڈ آفریقہ، ایشیاء، براعظم امریکہ اور مشرقی بحیرہ روم کے خطے کے ملکوں میں جہاں بچے کم سے کم لازمی بنیادی خدمات کی دسترس سے باہر ہیں، بچوں کے پروگرام میں مدد دے رہا ہے۔

بچوں کے لیے اقوام متحدہ فنڈ کا اصل مقصد جس کی توثیق جنرل اسمبلی کی 1976ء کی ایک قرارداد سے ہو چکی ہے ترقی پذیر ممالک کو اس قسم کے شعبوں مثلاً صحت کے تحفظ، غذائیت، تعلیم، صاف اور محفوظ پانی کی رسد اور دیہاتی عورتوں اور لڑکیوں کا بار کم کرنے والے چھوٹے موٹے کاموں میں بنیادی خدمات کی منصوبہ بندی کرنے میں مدد دینا ہے۔ بچوں کے لیے اقوام متحدہ فنڈ کی جانب سے دی جانے والی امداد کا بیشتر حصہ ساز وسامان اور رسد کی شکل میں ہوتا ہے مثلاً صحت کے مرکزوں اور دن میں دیکھ بھال کے مراکز کا ضروری سامان، دوائیں، کنوؤں کی کھدائی کا سامان، نل اور نلکے، بیج، باغبانی کا سامان، بہت بڑے پیمانے پر نصاب کی کتابیں تیار کرنے کے لیے مشینیں اور کاغذ۔ اس کے علاوہ ان خدمات کو چلانے اور عملہ فراہم کرنے کے لیے مقامی لوگوں کو تربیتی وظائف کی شکل میں جو امداد فراہم کی جاتی ہے وہ روز افزوں اہمیت کی حامل ہوتی جا رہی ہے۔

جنرل اسمبلی کی جانب سے بچوں کے لیے اقوام متحدہ فنڈ کو اقوام متحدہ کے نظام کا وہ ''رہنما ادارہ'' قرار دیا گیا ہے جو بچوں کے عالمی سال 1979ء کی سرگرمیوں کو مربوط کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس عالمی سال کا مقصد تمام ممالک میں بچوں کی موجودہ دلچسپیوں اور ترقی کے مواقع پر توجہ مرکوز کرنا اور بچوں

کے فائدے کے لیے مقامی اور قومی سطح پر خصوصی اقدام کا اہتمام کرنا ہے۔ بچوں کے لیے اقوام متحدہ فنڈ کی تین چوتھائی آمدنی حکومتوں سے حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ باقیماندہ آمدنی غیر سرکاری اداروں کے عطیات، افراد کے عطیات اور اس قسم کی سرگرمیوں مثلاً بچوں کیلیے اقوام متحدہ فنڈ کے تقریباتی مبارکباد کے کارڈوں کی فروخت سے حاصل ہوتی ہے۔ 1965ء میں بچوں کے لیے اقوام متحدہ فنڈ کو امن کا نوبل انعام دیا گیا۔

ایک ایگزیکٹیو بورڈ جسے اقوام متحدہ کی معاشی وسماجی کونسل منتخب کرتی ہے بچوں کے لیے اقوام متحدہ فنڈ کے کام کا نگران ہوتا ہے۔ اس بورڈ کے اجلاس ہر سال ہوتے ہیں جن میں موجودہ پروگراموں کا جائزہ لیا جاتا ہے اور نئے پروگراموں کی منظوری دی جاتی ہے۔ یہ پروگرام جو سراسر رضا کارانہ عطیات سے چلتے ہیں ان پر بچوں کے لیے اقوام متحدہ فنڈ کے عملے کی مدد سے ساٹھ کے لگ بھگ حلقہ واری دفتروں میں کام ہوتا ہے اور یہ سب کے سب دفاتر نیویارک میں بچوں کے لیے اقوام متحدہ فنڈ کے ہیڈ کوارٹر میں ایک ایگزیکٹیو ڈائرکٹر کے تحت ہوتے ہیں۔

پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر کا دفتر

جنرل اسمبلی نے یکم جنوری 1951ء کو پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر (UNHCR) کا دفتر قایم کیا جو غیر سیاسی طور پر خالصتاً انسان دوستی کے جذبے کی بنیاد پر پناہ گزینوں کو قانونی تحفظ فراہم کرتا ہے اور کسی حکومت یا اقوام متحدہ کی درخواست پر انہیں مادی امداد بھی دیتا ہے۔ اس ادارہ کے آئین وضوابط کے تحت پناہ گزین وہ لوگ ہیں جو انقلاب یا حکومت میں سیاسی تبدیلی سے خوفزدہ ہو کر یا ملک کے اندر ایسے ہنگاموں سے ڈر کر جن کی بناء پر آبادی کے کچھ طبقوں کو لاحق خطرات کی وجہ سے اپنے وطن سے باہر چلے گئے ہوں۔

1971ء سے پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر کے دفتر سے یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ پے در پے کچھ ایسے خصوصی اقدامات کرے جو بے گھر ہونے والے ان لوگوں کے لیے منفعت بخش ہوں جو اگرچہ ضابطے اور آئین کے مطابق تو پناہ گزینوں کے زمرے میں نہ آتے ہوں مگر اپنے آپ کو پناہ گزینوں کے سے حالات میں پائیں اور وہ عالمی امداد کے بھی محتاج ہوں۔

اپنے قیام ہی کے وقت سے پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر کا دفتر ان کوششوں میں دلچسپی لے رہا ہے جو اس قومی تحفظ کی بحالی کے لیے کی جا رہی ہیں جس سے ایک پنا گزین محروم ہوا ہے۔ اس کے لیے پناہ دینے کے طریقے کو فروغ دینے کی ضرورت ہے اور جب ایک بار پناہ گزینوں کو

پناہ مل جائے تو پھر اس کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ اس قسم کے اہم شعبوں مثلاً روزگار، تعلیم، رہائش، نقل و حرکت کی آزادی اور کسی ایسے ملک کو واپسی کے خلاف تحفظ جہاں ان کی جان یا آزادی کو خطرہ لاحق ہو، ان کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے۔ اس سلسلے میں اصل عالمی دستاویز پناہ گزینوں کی حیثیت سے متعلق 1951ء کا وہ معاہدہ ہے جس میں پناہ گزینوں کے حقوق کا تعین کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ برتاؤ کا وہ کم سے کم معیار بھی مقرر کر دیا گیا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ 1976ء میں 68 ممالک اس معاہدے میں شریک ہو گئے تھے اور 63 ممالک 1967 کے اس معاہدے میں شامل ہو گئے تھے جو 1951ء کے معاہدے کو پناہ گزینوں کے نئے گروپوں تک وسعت دیتا ہے۔

پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر کا دفتر ہند چینی (Indo-China) میں بے گھر لوگوں کی بحالی کے فروغ کیلیے کام کیا۔ موزمبیق میں پناہ گزینوں کیلیے اقوام متحدہ کا دفتر دوسرے ممالک سے واپس آنے والے پناہ گزینوں اور اس ملک کے جدوجہد آزادی کے دوران اندرون ملک بے گھر ہونے والے لوگوں کی مدد کیا۔ سکریٹری جنرل کی درخواست پر پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کا ہائی کمشنر قبرص میں بے گھر ہونے والے اور محتاج لوگوں کے لیے اقوام متحدہ کی انسان دوستی پر مبنی امداد کے سلسلے میں رابطہ افسر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1976ء میں اس دفتر نے لبنان میں خانماں برباد لوگوں کو امدادی سامان بھجوانے کا انتظام کیا۔ اسی سال اگست میں سکریٹری جنرل نے پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر کو انگولا میں انسان دوستی کے جذبے پر مبنی امداد کے لیے رابطہ افسر کی حیثیت سے مقرر کیا تھا۔ آج یہ ادارہ افغانستان کے پناہ گزینوں کی مدد کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں ہے۔

اقوام متحدہ کی تجارت و ترقی سے متعلق کانفرنس UNCTAD

اقوام متحدہ کی تجارت و ترقی سے متعلق کانفرنس 30 ڈسمبر 1964ء کو جنرل اسمبلی کے ایک مستقل ادارے کی حیثیت سے قایم کی گئی تھی۔ اسکے قیام کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ عالمی تجارت کو فروغ دیا جائے اور خصوصاً ترقی پذیر ممالک کی معاشی ترقی کو آگے بڑھایا جائے۔ اقوام متحدہ کی تجارت و ترقی سے متعلق کانفرنس ان کوششوں میں ایک نمایاں کردار ادا کرتی ہے جو ایک نئے عالمی معاشی نظام (NIEO) کے قیام اور دوسرے ترقیاتی مقاصد کے حصول، ممالک کے معاشی حقوق و فرائض کے منشور اور جنرل اسمبلی کے 1975ء کے ساتویں خصوصی اجلاس میں ترقی اور عالمی معاشی تعاون سے متعلق منظور کردہ قرارداد کے سلسلے میں کی گئی تھیں۔

اس کانفرنس میں اقوام متحدہ کے تمام ممبر شامل ہیں۔ نیز وہ ممالک جو اقوام متحدہ کے ممبر تو نہیں

ہیں لیکن خصوصی اداروں کے یا ایٹمی توانائی کے عالمی ادارے کے ممبر ہیں وہ بھی اس کانفرنس میں شامل ہیں۔اس کانفرنس کا پہلا اجلاس جنیوا میں 1964ء میں منعقد ہوا۔دوسرا اجلاس نئی دہلی میں 1966ء میں ہوا۔تیسرا سنتیا گو میں 1972ء میں ہوا۔چوتھا نیروبی میں 1976ء میں ہوا اور پانچواں 1979ء میں ہوا۔اس کی دسویں کانفرنس 2000ء میں بنکاک میں منعقد ہوئی۔

اقوام متحدہ کی تجارت وترقی سے متعلق کانفرنس کا مستقل نظام تجارت وترقیاتی بورڈ پر مشتمل ہے جس میں اقوام متحدہ کی تجارت وترقی سے متعلق کانفرنس کے تمام ارکان شامل ہوسکتے ہیں۔اس بورڈ کا اجلاس ہر سال ہوتا ہے جبکہ وزارتی سطح کے اجلاس کانفرنس کے اجلاسوں کے درمیان ہر دوسال کے بعد منعقد ہوتے ہیں

اقوام متحدہ کی تجارت وترقی سے متعلق کانفرنس کے بڑے پروگراموں میں سے ایک پروگرام اشیاء کے مسائل سے عہدہ برآ ہونا ہے۔اس پروگرام کے تحت جو مربوط پروگرام برائے اشیاء کے نام سے معروف ہے جو تجاویز بھی پیش کی جاتی ہیں ان کا مقصد ترقی پذیر ممالک کی بنیادی اشیاء کے لیے منفعت بخش اور متوازن قیمتوں کا حصول اور صنعتی ممالک کی منڈیوں میں ان اشیاء کی کھپت کی صورتحال کو بہتر بنانا ہے۔اس پروگرام کا ایک مرکزی حصہ فالتو ذخائر میں سرمایہ کاری کے لیے ایک مشترکہ فنڈ کے قیام کا متقاضی ہے۔یہ ذخائر اشیاء کی قیمتوں میں بہت زیادہ کمی بیشی کو ختم کرنے میں مدد دیں گے۔

اقوام متحدہ کی تجارت وترقی سے متعلق کانفرنس کے ایک دوسرے بڑے پروگرام کا مقصد ترقی پذیر ممالک کی مشینی پیداوار اور نیم مشینی پیداوار کی برآمدات کو پھیلانا اور متنوع کرنا ہے۔اقوام متحدہ کی تجارت وترقی سے متعلق کانفرنس میں طویل مذاکرات کے بعد 1977ء میں ترجیحات کے عمومی نظام کی ترویج سے متعلق معاہدہ کیا گیا۔جس کا مقصد ترقی پذیر ممالک کو برآمدات کے سلسلے میں وسیع تر مواقع فراہم کرنا تھا۔یہ معاہدہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ روایتی پالیسیاں جو مبادلے اور انتہائی پسندیدہ ملک (Most Favoured Nation) کے اصول پر مبنی ہیں ترقی پذیر ممالک کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ناکافی ہیں۔ترقی پذیر ممالک کے قرضوں سے متعلق مسائل اور پھر ان ممالک کو اصل وسائل کی منتقلی اقوام متحدہ کی تجارت وترقی سے متعلق کانفرنس کے کام کا ایک بڑا شعبہ ہے۔اقوام متحدہ کی تجارت وترقی سے متعلق کانفرنس نے مالیاتی امداد کی شرائط کو بہتر بنانے' امدادی رقوم میں اضافوں کا اہتمام کرنے' قرضوں کے بوجھ کو کم کرنے اور ایک ایسا عالمی مالیاتی نظام مرتب کرنے کے اقدامات کی سفارش کی ہے جو موجودہ عالمی معاشی حالات اور خصوصاً ترقی پذیر ممالک کی ضروریات کے ساتھ بہتر طور پر ہم آہنگ

ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اقوام متحدہ کی تجارت وترقی سے متعلق کانفرنس ترقی پذیر ممالک کے درمیان تجارت کی توسیع، معاشی اتحاد اور معاشی تعاون کے فروغ پر بہت زیادہ زور دیتی ہے۔ اس قسم کے شعبوں مثلاً برآمدی قرضہ جات، حمل ونقل، بیمہ اور ہمہ جہتی پیداواری مہموں میں بہت کچھ سرگرمیاں متوقع ہیں۔ اقوام متحدہ کی تجارت وترقی سے متعلق کانفرنس کا ایک سکریٹریٹ ہے جس کا سربراہ ایک سکریٹری جنرل ہوتا ہے اور اس کا ہیڈ کوارٹر پیلس ڈی نیشنز جنیوا میں ہے۔

متعلقہ ادارے

بین الحکومتی ادارے علیحدہ خود مختار تنظیموں کی حیثیت رکھتے ہیں اور خاص سمجھوتوں کے ذریعہ اقوام متحدہ سے منسلک ہوتے ہیں، یہ ادارے رابطہ قایم کرنیوالی اقوام متحدہ کی تنظیم معاشی اور سماجی کونسل کے ذریعہ سے اقوام متحدہ کے ساتھ اور آپس میں مل جل کر کام کرتے ہیں۔

ایٹمی توانائی کا بین الاقوامی ادارہ IAEA

یہ ادارہ 29 جولائی 1957ء کو قایم کیا گیا۔ اسکا آئین 26 اکتوبر 1956ء کو بین الاقوامی کانفرنس میں منظور کیا گیا تھا۔ اس پر اس وقت عملدرآمد شروع ہوا جب اس کی دستاویزات پر کم سے کم اٹھارہ ملکوں نے دستخط کیے۔ دستخط کرنیوالوں میں کینڈا، فرانس، روس، امریکہ، برطانیہ میں سے کم از کم تین ملکوں کے دستخط ضروری تھے۔

اس ادارہ کے قیام کا مقصد دنیا میں امن صحت اور خوشحالی کے لیے ایٹمی توانائی کو ترقی دینا ہے۔ اسکا کام اس بات کی ضمانت دینا ہے کہ ایٹمی استعمال جنگی مقاصد کے لیے نہ ہونے پائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ایٹمی توانائی کے عالمی ادارے کے بڑے بڑے کام حسب ذیل ہیں۔ پرامن مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی کے استعمال کو فروغ دینا اور ایٹمی تحقیق اور تجربات میں امداد دینا، ریڈیائی شعاعوں کو علاج معالجہ کے سلسلہ میں دوا کے طور پر استعمال کرنا اور زراعت آبی وسیلوں اور صنعت کو ترقی دینا۔ اطلاعات کے نظام کو بہتر بنانا۔ فنی امداد دینا فیلوشپ فراہم کرنا اور سازوسامان اور سہولتوں کی فراہمی کا انتظام کرنا، مادی وسائل کو فوجی استعمال میں آنے سے روکنا اور ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے سے متعلق معاہدے کے تحت پابندیوں کا اہتمام کرنا، حفاظتی معیار مقرر کرنا، حفاظتی مشن بھیجنا، قوانین اور معاہدوں کی تیاری میں مدد دینا اور ایٹمی اطلاعات کا عالمی نظام چلانا، ایٹمی معاملات سے متعلق مطبوعات اکٹھی کرنا اور ان کی تشہیر کرنا ہے۔

بین الاقوامی ادارہ محنت ILO

معاہدہ ورسیلز کے تیرہویں حصہ کو اس کے دستور کے طور پر منظور کیے جانے کے بعد 11 اپریل 1919ء کو اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہ پہلا مخصوص ادارہ ہے جو 1946ء میں اقوام متحدہ کے ساتھ خود کو وابستہ کیا۔ یہ ادارہ سماجی انصاف کو ترقی دیکر دائمی امن کو قایم کرنے ۔ بین الاقوامی اقدامات کے ذریعہ محنت کشوں کی حالت اور انکے معیار زندگی کو بہتر بنانے اور معاشی و سماجی استحکام کو ترقی دینے پر اپنی توجہ مرکوز کیا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ادارہ محنت حکومت' محنت کشوں اور انتظامیہ کے درمیان قریبی تعلقات قایم کرتا ہے۔ کم سے کم درجہ کے بین الاقوامی معیار کی سفارش کرتا ہے' اور اجرت' اوقات کار' ملازمت کے لیے کم سے کم عمر' مختلف قسم کے محنت کشوں کے کام کی نوعیت' محنت کشوں کو معاوضہ' سماجی بیمہ تنخواہ کے ساتھ چھٹی' صنعتی تحفظ' شرائط ملازمت' محنت کشوں کے معائنے اور آزادی اجتماع جیسے امور کے متعلق سمجھوتے مرتب کرتا ہے۔ یہ ادارہ متعلقہ حکومتوں کے تعاون سے وسیع پیمانے پر فنی امداد بھی دیتا ہے۔

''کانفرنس'' ILO کا مرکزی ادارہ ہے جس میں تمام رکن ممالک کی نمائندگی ہوتی ہے۔ حکومت کے دو نمائندوں کے علاوہ ہر ملک ملازمین اور مزدوروں کے ایک نمائندے کو اس میں روانہ کرتا ہے۔ کانفرنس کا اجلاس سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ یہ نئے اراکین کے داخلہ' بجٹ کی منظوری اور کام کے بین الاقوامی قواعد کو طئے کرتا ہے۔ ILO کی انتظامی ۔ ں کا انتخاب تین سال کے لیے ہوتا ہے۔ سال میں اس کے تین اجلاس ہوتے ہیں۔ ILO کا ہیڈ کوارٹر جنیوا' سوئٹزرلینڈ میں ہے۔ 1969ء کا نوبل امن انعام اس کو سماجی انصاف کے میدان میں اس کے کارناموں کے لیے دیا گیا تھا۔

اقوام متحدہ کی تعلیمی سائنسی اور ثقافتی تنظیم UNESCO

یونیسکو 4 نومبر 1946ء کو اس وقت قایم کیا گیا جب اس کے آئین کے 20 دستخط کنندگان نے اپنی منظوری کی دستاویزات حکومت برطانیہ کے حوالے کیں۔ اس کا مقصد تعلیم' سائنس اور ثقافت کے ذریعہ اقوام عالم میں تعاون پیدا کرکے دنیا میں امن و سلامتی کو تقویت پہنچا کر انصاف اور قانون کی حکمرانی' حقوق انسانی اور بنیادی آزادی کے احترام کا رجحان پیدا کرنا ہے۔ اس کے دیگر اہم مقاصد میں تعلیم کو اس طرح سے پھیلانا اور عام کرنا کہ ہر ملک کے لوگ زیادہ موثر طریقے پر اپنی ترقی کا اہتمام کرسکیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے اساسی اداروں کے قیام میں مدد دینا جن کے ذریعہ ہر ملک اپنے وسائل کے بہتر استعمال پر قادر ہوسکے۔ قومی ثقافتی اقدار کی حوصلہ افزائی اور ثقافتی ورثے کا کچھ اس طرح

سے تحفظ کہ اپنا ثقافتی تشخص کھوئے بغیر جدیدیت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جاسکے۔ علم کی عالمگیر مرکزیت کے لیے اطلاعات اور اطلاعاتی نظاموں کی ترقی' حقوق انسانی' انصاف اور امن کے حصول کے لیے ذرائع کی حیثیت سے سماجی علوم کو فروغ دینا ہے۔

جنرل کانفرنس ممبر ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کانفرنس کے اجلاس دو سال میں ایک مرتبہ ہوتے ہیں۔ جن میں تنظیم کی پالیسی اور پروگرام مرتب کیے جاتے ہیں۔

اس کا ایک ایگزیکٹو بورڈ ہوتا ہے جو 34 ممبروں پر مشتمل ہوتا ہے ان ممبروں کا انتخاب جنرل کانفرنس کرتی ہے اس کے اجلاس سال میں کم سے کم دو مرتبہ ہوتے ہیں۔ اور اس کے فرائض میں کانفرنس کے پروگرام پر عملدرآمد کرنا شامل ہے۔ اسکا سکریٹریٹ بین الاقوامی اسٹاف اور ایک ڈائریکٹر جنرل پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر پیرس میں ہے۔

عالمی ادارہ صحت WHO

عالمی ادارہ صحت کے آئین کو 22 جولائی 1946ء کو بین الاقوامی صحت کانفرنس نے منظور کیا' اس کانفرنس کو معاشی و سائنسی کونسل نے نیویارک میں طلب کیا تھا۔ بالآخر عالمی ادارہ صحت کا قیام اقوام متحدہ کے 26 ممبروں کی جانب سے اسکے آئین کی توثیق کے بعد 7 اپریل 1948ء کو عمل میں آیا۔ اس کا مقصد عام لوگوں کی صحت کے معیار کو بلند کرنا ہے۔ عالمی ادارہ صحت دنیا بھر میں صحت کے فروغ کے لیے خدمات فراہم کرتا ہے۔ ممبر ممالک کے ساتھ صحت سے متعلق ان کی کوششوں میں تعاون کرتا ہے اور طبی تحقیقات کی تنظیم کرتا ہے۔ اس کی سرگرمیوں میں جن سے تمام ممالک مستفید ہوتے ہیں' بین الاقوامی اہمیت رکھنے والی بیماریوں کے بارے میں روزانہ اطلاعات فراہم کرنا' بیماری' زخم اور موت کے اسباب کی بین الاقوامی فہرست شائع کرنا' ادویہ کے مضر اثرات کا پتہ لگانا' جراثیم کش ادویہ' ویکسین وغیرہ کے لیے عالمی معیار مقرر کرنا شامل ہیں۔ الگ الگ ملکوں کو ان کی درخواست پر جو امداد دی جاتی ہے' اس میں بیماریوں کا مقابلہ کرنے' حفظان صحت کے کارکنوں کی تربیت اور صحت کی خدمات کے استحکام کے لیے قومی پروگراموں کی اعانت شامل ہے۔ ورلڈ ہیلتھ اسمبلی میں تمام ممبر شریک ہوتے ہیں۔ اس کا اجلاس ہر سال ہوتا ہے اور وہ ادارہ صحت کی پالیسی مرتب کرتا ہے۔

اس کا اگزیکٹو بورڈ 24 ممبرو پر مشتمل ہوتا ہے ان کا انتخاب اسمبلی کرتی ہے بورڈ کے اجلاس سال میں دو مرتبہ ہوتے ہیں اور بورڈ اسمبلی کی مجلس عاملہ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اس کا سکریٹریٹ ایک ڈائریکٹر جنرل اور حسب ضرورت فنی اور انتظامی عملے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں ہے۔

عالمی بینک یا بین الاقوامی بینک برائے تعمیر و ترقی IBRD

اس بینک کا قیام 27 دسمبر 1945ء کو اس وقت عمل میں آیا جب 28 ممالک کے نمائندوں نے بریٹن ووڈ کانفرنس منعقدہ جولائی 1944ء کے مرتب کیے ہوئے سمجھوتے کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ لیکن یہ بینک جولائی 1946ء سے ابتدائی 10 بلین ڈالر سرمایہ سے کام کرنا شروع کیا۔

اس کا مقصد پیداواری مقاصد کے لیے ممبر ملکوں کے علاقوں کی تعمیر نو اور ترقی کے لیے سرمایہ فراہم کرنا، نجی غیر ملکی سرمایہ کاری کو ترقی دینا اور مناسب شرائط پر نجی سرمایہ کی فراہمی میں کمی کی صورت میں بینک کے سرمایہ سے اپنے جمع کیے ہوئے فنڈ اور دوسرے ذرائع سے پیداواری مقاصد کے لیے قرضے دیکر کمی کو پورا کرنا، بین الاقوامی تجارت کی متوازن ترقی اور بینک کے ممبروں کی پیداواری وسائل کی ترقی کے لیے بین الاقوامی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کر کے ادائیگیوں کے توازن کو برقرار رکھنا ہے۔

یہ بینک قومی معاشی سہولتوں کی ترقی کے لیے قرضے دیتا ہے۔ قرضے ممبر ممالک، ان کے سیاسی سب ڈویژنس یا ان کے علاقے میں نجی صنعتوں کو دیئے جا سکتے ہیں۔ قرض خواہ اگر حکومت نہیں تو اسے ممبر حکومت سے ضمانت دلانا ہوتا ہے۔ بینک کی امداد صرف قرضے دینے تک محدود نہیں بلکہ وہ مختلف صورتوں میں اور بڑے پیمانے پر ممبر ممالک کو فنی امداد بھی فراہم کرتا ہے۔

بین الاقوامی ترقیاتی ادارہ IDA

عالمی بینک بین الاقوامی ترقیاتی ادارہ کے انتظامیہ کا ذمہ دار ہے۔ یہ ادارہ بینک کا ایک اہم ادارہ ہے جو 24 سپٹمبر 1960ء کو قایم ہوا۔ عالمی بینک سے تعلق رکھنے والے تمام ممالک بین الاقوامی ترقیاتی ادارہ کے ممبر بن سکتے ہیں۔ معاشی ترقی اور پیداواری صلاحیت میں اضافہ اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد ہے، جس کے حصول کے لیے ادارے میں پسماندہ شریک ملکوں کی ترقیاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے آسان اور زیادہ لچکدار شرائط پر قرضے دیئے جاتے ہیں۔ عام قرضوں کے مقابلے میں ان قرضوں کا بوجھ بہت ہلکا ہوتا ہے۔ ان اقدامات کی غرض و غایت معیار زندگی بلند کرنا ہے۔

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ International Monetary Fund

یہ فنڈ 27 دسمبر 1945ء کو اس وقت قایم کیا گیا جب ان ممبروں کے نمائندوں نے جن کا کوٹہ بینک کے سرمایہ کا 80 % ہے بریٹن ووڈ سمجھوتے کی توثیق کی دستاویز داخل کر دی۔ یہ ادارہ 8,800 ملین ڈالر کے ابتدائی سرمایہ سے یکم مارچ 1947ء سے کام کرنا شروع کیا۔

اس کا مقصد بین الاقوامی مالیاتی تعاون میں اضافہ اور بین الاقوامی تجارت میں ترقی دینا، تبادلہ

کے استحکام کی حالت کو بہتر بنانا' تبادلہ کے متعلق مناسب انتظامات کو برقرار رکھنا اور تبادلے کے سلسلے میں نقصانات سے بچانا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ ممبروں کے درمیان روپیہ کے لین دین کے سلسلہ میں ایک کثیر المقاصد نظام قایم کرنے میں مدد دیتا ہے اور ممبر ملکوں کے درمیان غیر ملکی زر مبادلہ پر عائد شدہ پابندیوں کو ختم کراتا ہے کیونکہ یہ پابندیاں عالمی تجارت کی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ ممبر ملکوں کے درمیان غیر ملکی زر مبادلہ فروخت کرتا ہے۔ تاکہ وہ ادائیگی کے توازن کی مشکلات پر قابو پاسکیں۔ اس کے علاوہ یہ فنڈ مالیاتی امور کے متعلق حکومتوں کو مشورے بھی دیتا ہے۔ یہ سرمایہ کاری اور بینک کے قرضے حکومت کے اخراجات اور ٹیکسوں کے سلسلہ میں افراط زر کی روک تھام کے متعلق اقدامات کی سفارش کرتا ہے۔ اس نے زر مبادلہ کی پابندیوں کے دباؤ کو گھٹانے کے لیے مالیاتی اقدامات اور مالیاتی محفوظ ذخیروں کی حالت نمایاں طور پر بہتر ہونے کی صورت میں درآمد میں نرمی پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی مشینری

گورنروں کا بورڈ ہر ممبر ملک کے مقرر کیے ہوئے ایک گورنر اور اس کے ایک متبادل پر مشتمل ہے۔ بورڈ کو بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے جملہ اختیارات حاصل ہیں وہ اپنے کئی اختیار ایگزیکٹیو ڈائریکٹرس کو منتقل کرسکتا ہے۔ صرف ممبر کی حیثیت سے کسی ملک کے فنڈ میں شریک کرنے یا معطل کرنے' کوٹہ پر نظر ثانی کی منظوری دینے یا ممبر ملکوں کی کرنسیوں کی مساوی قیمت میں ردوبدل کرنے' فنڈ کی آمدنی کی تقسیم کے متعلق فیصلہ کرنے اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کو ختم کرنے سے تعلق رکھنے والے اختیارات ایگزیکٹیو ڈائریکٹرس کو منتقل نہیں کیے گئے ہیں۔

اس کے پانچ ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کا انتخاب وہ ممبر کرتے ہیں جن کا سب سے زیادہ کوٹہ ہوتا ہے اور باقی پندرہ کا انتخاب باقی ممبروں کے گورنر کرتے ہیں۔ یہ ڈائریکٹر فنڈ کے انتظام و انصرام کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ مینیجنگ ڈائریکٹر کا انتخاب ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کرتے ہیں اور وہ بہ اعتبار عہدہ ایگزیکٹیو ڈائریکٹرس کا چیرمین اور عملے کا سربراہ ہوتا ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر 19 ویں ایچ اسٹریٹ واشنگٹن ڈی سی 20431 امریکہ میں ہے۔

ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن　WTO

ڈبلیو۔ ٹی۔ او اشیاء اور خدمات میں بین الاقوامی تجارت کو چلانے اور دانشمندانہ ملکیتی حقوق (Intellectual Property Rights) کے تحفظ کے لیے ایک چوکھٹا فراہم کرتا ہے۔ یہ بین الاقوامی

تجارت کے لیے قوموں کے درمیان معاہدات کے نفاذ کے لیے ذمہ دار ہے۔ ان معاہدات میں General Agreements on Tariffs and Trade (GATT) بھی شامل ہیں۔

ابتداء Origin

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے بین الاقوامی تجارت کے ہمہ فریقی (Multilateral) چوکھٹے کا آغاز ہوا۔ 1944ء میں امریکہ کے شہر بریٹین ووڈس (Brettan Woods) میں منعقد عالمی مالیاتی کانفرنس میں IMF اور IBRD کے قیام کے لیے معاہدات ہوئے۔ IMF کا مقصد تجارتی ملکوں کے توازن ادائیگی کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے قرضوں کا بندوبست کرنا تھا جب کہ IBRD کا مقصد تباہ حال معیشتوں کی بحالی کے لیے آسان شرائط پر طویل مدتی قرض فراہم کرنا تھا۔ یہ دونوں ادارے ترقی یافتہ ممالک کے عطیے سے قایم ہوئے اور وہی اپنے ووٹ کے ذریعہ اس کے فیصلوں اور کارکردگی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ تجارت کی راہ میں حائل غیر ضروری رکاوٹوں اور بہت زیادہ ٹیرف کی و جہ سے عالمی تجارت کا دائرہ سمٹنے لگا تو آزاد عالمی تجارت کو فروغ دینے کے لیے ایک تیسرے ادارے ڈبلیو۔ ٹی۔ او (بین الاقوامی تجارت تنظیم) کے قیام کی ضرورت محسوس کی گئی۔

1947ء میں جنیوا کانفرنس جس میں 23 ملکوں نے شرکت کی تھی نے GATT معاہدات پر دستخط کیے۔ 1948ء میں دوسری کانفرس ہوانا (کیوبا) میں منعقد ہوئی جس میں 50 ممالک شرکت کیے۔ اس کانفرنس میں WTO کے منشور کو منظوری دی گئی جو "ہوانا چارٹر" کہلاتا ہے۔ شریک ملکوں کی ایک معتدبہ تعداد اس منشور کی توثیق کر دیتی تو یہ تنظیم 1951ء میں ہی قایم ہوتی۔ لیکن سرد جنگ کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا۔ GATT عالمی تجارت و ٹیرف کو طئے کرنے کے لیے ایک ہمہ فریقی فورم تھا۔ 1947ء سے 1994ء تک اس کے ہمہ تجارتی بات چیت (Multi Trade Negotiations) کے آٹھ دور کے مذاکرت ہوئے۔ آٹھویں مذاکرت کا آغاز 1986ء میں یورگوائے کے شہر Puntadeleste میں ہوا جو یوروگوائے راؤنڈ کے نام سے جاتے ہیں۔ ان مذاکرات کا اختتام ڈسمبر 1993ء کو ہوا۔ اس میں طئے شدہ معاہدہ پر مراقش کے شہر مراکش میں اپریل 1994ء میں دستخط ہوئے۔ اس معاہدہ میں بین الاقوامی تجارت میں بڑے پیمانے پر آزادانہ تجارت کو فروغ دینے کے لیے ایک مستقل تنظیم قایم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور GATT کے اراکین نے مراقش اعلامیہ پر دستخط کرتے ہوئے WTO کے قیام کی راہ ہموار کی۔ اب یہ تنظیم GATT کی جگہ یکم جنوری 1995ء سے کام کر رہی ہے۔ اس کی ایک وزارتی کانفرنس سال 2000ء میں امریکی شہر Seattle میں اور دوسری وزارتی کانفرنس نومبر 2001ء میں دوحہ

قطر میں ہوئی۔اس کانفرنس میں چین اور تائیوان کی رکنیت کو قبول کرلیا گیا۔جس سے ڈبلیو۔ٹی۔او کے اراکین کی تعداد 144 ہوگئی۔چین 143 اور تائیوان 144 ویں رکن بنے۔

عالمی امن کے قیام میں اقوام متحدہ کا رول

اقوام متحدہ اپنے قیام کے بعد سے عالمی امن کے فروغ کے اقدامات میں مصروف ہے۔عالمی امن کے قیام کے اس کے اقدامات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک امن کے قیام کے لیے عملی کوششیں واقدامات' دوسرے امن کے لیے مختلف قراردادوں اور اعلان ناموں (Declarations) کی منظوری' تیسرے متاثرین کی راحت وامداد کے کام۔جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل بنیادی طور پر قیام امن کی ایجنسیاں ہیں جو اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق کام کرتی ہیں۔قوموں کے درمیان جب کشیدگی بڑھتی ہے اور اس سے امن کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو سلامتی کونسل فوری طور پر حرکت میں آتی ہے اور نفس مسئلہ کی کھوج لگا کر تناؤ وکشیدگی کو کم کرنے کے اقدامات کرتی ہے۔اب اقوام متحدہ کی افواج تناؤ کی روک تھام کے لیے متاثرہ خطوں میں مورچہ سنبھال رہی ہیں۔ایک مصالحت کار کے طور پر اقوام متحدہ کا سکریٹری جنرل سفارتی اقدامات کے ذریعہ امن کے امکانات کو تلاش کرتا ہے۔وہ اور اس کے قاصد اس کام میں مسلسل مصروف رہتے ہیں۔یہاں تک کہ مختلف شورش زدہ ممالک میں جمہوریت کی بحالی میں اور وہاں پر امن وغیر جانبدارانہ انتخابات کے انعقاد میں اقوام متحدہ مدد دیا ہے۔چنانچہ 1990ء میں ہیتی' 1992ء میں انگولا' 1993ء اور 1998ء میں کمبوڈیا اور 1994ء میں ایلسلواڈر' جنوبی آفریقہ اور موزنبیق وغیرہ میں انتخابی عمل کی نگرانی کے لیے مبصرین کو روانہ کیے تھے۔1992ء میں اقوام متحدہ کے برقراری امن کے شعبہ میں ایک علیحدہ Electoral Assistance Division قایم کیا گیا۔اپریل 1992ء سے مئی 1995ء کے دوران تقریباً 65 ممالک کو انتخابات کے انعقاد میں ٹکنیکل مدد دیا ہے۔اقوام متحدہ نے افغانستان میں مابعد طالبان ایک وسیع البنیاد حکومت کے قیام کے لیے ہمہ فریقی کانفرنس کا جرمنی میں انعقاد عمل میں لایا اور چھ ماہ کے لیے حامد کرزئی کی قیادت میں جمہوری حکومت کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا ہے۔چھ ماہ کے بعد انتخابات کے ذریعہ ایک مستقل حکومت قایم ہوگی۔ذیل میں امن کے لیے اقوام متحدہ کے چند اہم اقدامات کا جائزہ لیا جائے گا۔

مسئلہ کوریا

1910ء سے کوریا پر جاپان کا قبضہ تھا۔دوسری جنگ عظیم کے بعد اسے شمال اور جنوبی کوریا میں تقسیم کیا گیا۔اور 1948ء میں جمہوری عوامی جمہوریہ کے نام سے شمالی کوریا اور ریپبلک آف کوریا کے نام

سے جنوبی کوریا میں دو مختلف حکومتیں وجود میں آئیں۔ شمالی کوریا میں کمیونسٹ اقتدار میں تھے اور جنوبی کوریا میں مخالف کمیونسٹ Syngman Rhee کی مخالف کمیونسٹ حکومت تھی۔

1950ء میں شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ اس وقت تک چین میں کمیونسٹ اقتدار میں آچکے تھے۔ کمیونزم کے پھیلاؤ کے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے امریکہ جنوبی کوریا کی مدد کرنے لگا۔ اقوام متحدہ نے اپنی قرارداد میں شمالی کوریا کو حملہ آور قرار دیتے ہوئے حملہ کی مذمت کی اور رکن ممالک سے جنوبی کوریا کی مدد کرنے کے لیے کہا۔ اور امریکہ چند دوسرے ممالک کی فوج کے ساتھ جنوبی کوریا کی مدد کرنے لگا۔ سویت یونین اپنی افواج کو شمالی کوریا روانہ کیا۔ چونکہ اس وقت تک سویت یونین بھی ایٹمی طاقت حاصل کرلیا تھا اس لیے دو ایٹمی طاقتوں کے درمیان جنگ سے وسیع تباہی کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اقوام متحدہ کی مداخلت سے بالآخر یہ جنگ 1953ء میں ختم ہوئی۔ لیکن اس کی وجہ سے سرد جنگ شدت اختیار کرلی۔

کانگو کا مسئلہ

کانگو بلجیم کی نوآبادی تھا۔ جسے 1960ء میں آزادی دی گئی تھی۔ لیکن جلد ہی وہاں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ بلجیم اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی افواج کو وہاں روانہ کیا۔ قومی حکومت بیرونی مداخلت کو روکنے کے لیے اقوام متحدہ سے اپیل کی۔ بیرونی افواج معدنیات سے مالا مال کٹنگا صوبہ میں باغیوں کی مدد کر رہی تھیں۔ سیکیوریٹی کونسل نے کانگو کو اپنی افواج ہٹالینے کا حکم دیا اور بیس ہزار افراد پر مشتمل اقوام متحدہ کی فوج کو وہاں متعین کردیا۔ لیکن کٹنگا صوبہ میں وزیر اعظم Patrice Lumumba کے قتل سے حالات مزید خراب ہو گئے۔ کٹنگا صوبہ کو کانگو سے علیحدہ کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ فبروری 1963ء میں کٹنگا دوبارہ کانگو میں ملا اور جون 1964ء تک اقوام متحدہ کی افواج کانگو سے دستبردار ہوئیں اور اس ملک کا نام بدل کر Zaire رکھا گیا۔

مسئلہ فلسطین

مئی 1948ء میں فلسطین کے علاقہ میں مملکت اسرائیل کے قیام سے فلسطین کا مسئلہ پیدا ہوا۔ حالانکہ اقوام متحدہ نے 1947ء میں قرارداد 181 کے ذریعہ فلسطین کو تقسیم کرتے ہوئے دو آزاد مملکتیں اسرئیل اور فلسطین کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ لیکن اسرائیل پورے فلسطین پر قابض ہوگیا۔ فلسطینی عرب بڑے پیمانے پر ہجرت کرنے لگے جس سے مہاجرین کا مسئلہ پیدا ہوا۔ 1949ء میں اسرائیل اور چار عرب ممالک مصر، شام، اردن اور لبنان کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ 1956ء میں نہر سوئیز کا بحران پیدا

ہوا جو مصر کے خلاف اسرائیل' فرانس اور برطانیہ کی فوجی مداخلت کے باعث رونما ہوا تھا۔ ایک معاہدہ کے ذریعہ حملہ آور افواج واپس ہوئیں اور اقوام متحدہ کی ہنگامی افواج امن کی نگرانی کے لیے مقرر کی گئی۔ نہر سوئیز کو جو جنگ کے نتیجہ میں بند ہوگئی تھی اقوام متحدہ نے صاف کروایا۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کو روکنے کے لیے سلامتی کونسل نے اقوام متحدہ کے فوجی مبصروں کو گولان اور نہر سوئیز کے علاقوں میں جنگ بندی کی نگہداشت پر مقرر کیا۔ 17 جون 1967ء کو جنرل اسمبلی نے اپنے خصوصی اجلاس میں اسرائیل پر زور دیا کہ وہ کوئی ایسا اقدام نہ کرے جس سے بیت المقدس کی حیثیت بدلنے کا امکان ہو۔

22 نومبر 1967ء کو سلامتی کونسل نے مشرق وسطیٰ میں پائیدار امن کے قیام کے لیے قرارداد نمبر 242 کو متفقہ طور پر منظور کرتے ہوئے مقبوضہ علاقوں سے اسرائیلی افواج کو واپس بلانے پر زور دیا۔ اکٹوبر میں قرارداد 340 کے ذریعہ تمام افواج کو اپنی پوزیشن پر واپس جانے کا حکم دیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 1975ء میں PLO کو فلسطینیوں کا حقیقی نمائندہ تسلیم کرتے ہوئے اسے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ ان تمام کوششوں کے باوجود فلسطینیوں کو ان کا حق ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ 1990ء سے فلسطین اور اسرائیل کے درمیان راست اوسلو میں ہوئی بات چیت کے بعد مغربی کنارہ اور غازہ پٹی میں فلسطینیوں کی حق خود اِرادیت کے تحت محدود حکومت قایم کی گئی ہے۔ لیکن اسرائیل ایک آزاد مملکت فلسطین کے قیام میں نت نئے روڑے اٹکا رہا ہے۔

سماجی و معاشی امور اور شہری کے حقوق کے تحفظ اور ماحولیات جیسے مسائل پر بھی اقوام متحدہ نے توجہ دی ہے۔ 10 ڈسمبر 1948ء کو اعلان نامہ انسانی حقوق کے ذریعہ سے انسانی حقوق کے تحفظ کے اقدامات کیے۔ 1966ء میں انسانی حقوق کے سلسلے میں کئی قراردادیں اپنائی گئیں۔ 1981ء میں عوامی حقوق برائے امن کا اعلان نامہ جاری کیا۔ اس میں آزادی' انصاف' مساوات کے ذریعہ بین الاقوامی امن و سلامتی کے قیام پر زور دیا گیا۔ 1984ء میں اس اعلان نامہ کو دہراتے ہوئے قوموں کو طاقت کے استعمال یا دھمکی سے گریز کرنے کی خواہش کی گئی۔ 1986ء کو بین الاقوامی امن کا سال قرار دیا گیا۔ ماحولیات کے تحفظ کے لیے 1992ء کی ارض چوٹی کانفرنس اقوام متحدہ کی اہم کانفرنسوں میں ایک ہے۔

ارض چوٹی کانفرنس

برازیل کے مشہور شہر ریو ڈی جنیرو (Rio De Janeiro) میں کرہ ارض اور اس کے فطری ماحول کے تحفظ کے لیے اقدامات پر غور کرنے اقوام متحدہ کے ادارے برائے ماحولیات و ترقی UNCED کے زیر اہتمام 3 جون 1992ء میں عالمی کانفرنس ہوئی۔ اسٹاک ہوم میں 1972ء میں منعقدہ

ایک کانفرنس میں ماحول کی آلودگیوں سے انسانی زندگی کو لاحق خطرات کا احساس کر لیا گیا تھا اور ایک عالمی کمیشن ماحول کی آلودگیوں کی جانچ کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس کمیشن نے 1987ء میں ایک تحقیقاتی رپورٹ ''ہمارا مشترکہ مستقبل'' کے نام سے شائع کی تھی۔ اس رپورٹ میں کرہ ارض پر انسانی نباتاتی اور حیوانی زندگیوں کو ماحول میں بڑھتی ہوئی آلودگیوں سے لاحق خطرات کی تفصیل کے ساتھ اس کے انسداد کے فی الفور اقدامات کی ضرورت واضح کی گئی تھی۔ ڈسمبر 1989ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اس رپورٹ کی بنیاد پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر اقوام متحدہ کے ادارے UNCED نے یہ طئے کیا کہ یہ کانفرنس 1992ء میں برازیل کے مشہور شہر ریوڈی جنیرو میں منعقد کی جائے۔

ریوڈی جنیرو میں UNCED کی بین الاقوامی کانفرنس نے ماحولیات، جنگلات، نباتات، تازہ صاف پانی کے وسائل، سمندروں، دریاؤں، ندیوں اور ساحلی علاقوں کو مختلف النوع آلودگیوں کے ضرر رساں اثرات سے محفوظ رکھنے کے اقدامات اور آلودگیوں کے انسداد کے اقدامات طئے کیے۔ جنگلات اور نباتاتی دولت کے تحفظ کے اقدامات کے ساتھ عالمی سطح پر پھیلی ہوئی غربت کے انسداد کے لیے بھی اقدامات طئے کیے گئے۔ UNCED کی یہ کانفرنس کرہ ارض کے تحفظ کے لیے ایک منشور اور 21 ویں صدی میں قدرتی ماحول کے تحفظ اور آلودگیوں کو انسداد کے لیے منصوبہ بندی کی۔

کرہ ارض کے قدرتی ماحول کی بحالی کے لیے ترقی یافتہ دولت مند ملکوں اور ترقی پذیر غریب ملکوں کے مابین ایک عمومی مفاہمت اور معاہدے ضروری ہیں۔ UNCED کی اس کانفرنس کا مقصد یہی تھا کہ آلودگیوں کے انسداد کے اقدامات کیے جائیں تاکہ کرہ ارض پر قدرتی ماحول بحال ہو سکے اور انسانی زندگی کو ماحول کی تباہی سے جو خطرات لاحق ہو گئے ہیں ان کا سدباب اور خاتمہ ہو سکے۔

Koyoto معاہدہ

کرہ ارض کے درجۂ حرارت میں مسلسل اضافہ سے عالم انسانیت کو خطرہ لاحق ہے۔ امکان ہے کہ 2080ء تک زمین کا درجہ حرارت 1.4 سے 5.8 ڈگری سیلسیس تک پہنچ جائیگا۔ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے United Nations Frame work Convention on Climate Change (UNFCC) کی نگرانی میں 1997ء سے کویوٹو (جاپان) میں بات چیت کا آغاز ہوا۔ اور ایک پروٹوکول کو اپنایا گیا۔ جولائی 2001ء میں بون (Bonn) میں منعقدہ کانفرنس میں 178 ممالک نے کویوٹو پروٹوکول کے 12-2008 تک مقررہ نشانہ کے مطابق مضر گیسوں کو 1990 کی

سطح 5.2% سے کم کرنے کے لیے معاہدہ پر دستخط کیے۔ امریکہ اس معاہدہ پر دستخط سے انکار کیا۔ حالانکہ امریکہ کی آبادی دنیا کی آبادی کی 4% ہے لیکن عالمی آلودگی میں اس کا حصہ 25% ہے۔ امریکہ پہلے سے بڑھتی مانگ اور ناکافی سپلائی کی وجہ سے توانائی کے بحران سے دوچار ہے اور اسے ڈر ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا کرنے والے پاور پلانٹ کو بند کردینے سے اس کی معیشت متاثر ہوگی۔ گرین ہاوز گیس (GHG) کے لیے ذمہ دار 55% ممالک کی جانب سے اس معاہدہ کی توثیق کے بعد اس کا نفاذ 2002ء سے ہوگا۔ اب تک صرف رومانیہ ہی اس کی توثیق کیا ہے۔ ماحولیات پر دوسرا کنونشن اکٹوبر 2002ء میں مراقش میں منعقد ہوگا۔ امریکہ اس کنونشن میں اپنے منصوبہ کو پیش کرنے کا اعلان کیا ہے' اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری کوفی عنان نے امریکہ کی جانب سے کیوٹو معاہدہ کو مسترد کیے جانے پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ اور اس بات پر زور دیا کہ ہمیں ماحولیاتی مسائل کو منظرِ عام پر لانے کے لیے اور مستعدی سے عمل کرنا ہوگا اور دن بدن بڑھتی گرمی کو روکنے کی تدابیر کرنی ہوں گی۔

اقوام متحدہ کو جمہوری بنانے کی ضرورت واقدامات

اقوام متحدہ اپنے قیام کے پچپن برس مکمل کرچکا ہے۔ گذشتہ نصف صدی سے یہ عالمی امن کے قیام' استحکام اور انسانی مسائل کے حل کے لیے سرگرداں ہے۔ انسانی زندگی کی مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی سرگرمیوں سے اقوام متحدہ کی گہری وابستگی نے نہ صرف اقوام عالم کو ایک دوسرے سے قریب کیا ہے بلکہ اس سے فرد کو عالمی شہریت عطا ہوئی ہے۔ بجا طور پر اقوام متحدہ آج کی عصری بین الاقوامی زندگی کے اہم تقاضوں میں سے ایک ہے۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اقوام متحدہ کی پندرہویں جنرل اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اس ادارے کے بغیر دنیا کا تصور بھی مشکل ہے۔ اگر اس ادارے میں کچھ نقائص ہیں بھی تو وہ موجودہ عالمی صورتحال کا عکس ہیں۔ اگر آج ادارہ اقوام متحدہ نہ ہوتا تو ہمارا پہلا کام اس ادارے کی تشکیل ہوتا''۔ چنانچہ اقوام متحدہ آج قوموں کی سیاسی معاشرتی' تمدنی و معاشی زندگی کا ایک حصہ ہے' اس لیے اس ادارے کو زیادہ نمائندہ اور جمہوری بنانے پر زور دیا جارہا ہے۔ خصوصاً اس ادارے کو بڑے وطاقتور ممالک کے قبضے سے بچانا ضروری ہے۔

1945ء میں اقوام متحدہ کے قیام کے وقت سلامتی کونسل کے لیے مستقل اراکین کا تعین ممالک کی فوجی طاقت اور عالمی سیاست میں انکے اثر ونفوذ کے مدنظر کیا گیا تھا۔ لیکن موجودہ بین الاقوامی صورتحال میں مابعد دوسری جنگ عظیم کا توازن طاقت تحلیل ہوچکا ہے۔ طاقت کے متعدد مراکز وجود میں آئے ہیں اور علاقائی معاشی اتحادات کے ذریعہ ممالک باہمی تعلقات کو فروغ دے رہے ہیں۔ اسکے علاوہ نیوکلیر

ممالک کی تعداد بشمول ہندوستان و پاکستان سات ہو چکی ہے۔سویت یونین کے انتشار سے ابھرنے والی وسطی ایشیاء کی نئی جمہورتیں بھی نیوکلیر صلاحیت سے لیس ہیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ ایسے ممالک کی فہرست بھی طویل ہے جن کے متعلق قیاس ہے کہ وہ نیوکلیر دہلیز پر کھڑے ہیں۔اسطرح روایتی نیوکلیر طاقتوں کے فوجی وسیاسی اثر میں قابل لحاظ کمی ہوگئی ہے۔چنانچہ عالمی اسلحہ منڈیوں میں اب امریکہ روس برطانیہ اور فرانس کے مقابل کئی دوسرے ترقی پذیر ممالک نے اپنا مقام بنالیا ہے۔اس کے علاوہ اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ چنانچہ اس وقت رکن ممالک کی تعداد 189 ہے۔ان تمام باتوں کے مدنظر پندرہ رکنی سلامتی کونسل کو وسعت دینے اور مستقل اراکین کی تعداد میں اضافہ کرنے کا مطالبہ شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔

اقوام متحدہ کے قیام کے وقت سلامتی کونسل کے اراکین کی تعداد صرف گیارہ تھی۔جس میں سے پانچ ممالک امریکہ، سویت یونین، برطانیہ، فرانس اور چین مستقل اراکین تھے۔باقی چھ عارضی اراکین کا انتخاب جنرل اسمبلی دوسالہ میعاد کے لیے کرتی تھی۔لیکن 1963ء میں بڑھتی ہوئی رکنیت کے پیش نظر اس کے منشور میں ترمیم کے ذریعہ غیر مستقل اراکین کی تعداد کو بڑھا کر دس کر دیا گیا۔ موجودہ سلامتی کونسل کا قیام یکم جنوری 1966ء کو عمل میں آیا۔جس کے اراکین کی تعداد پندرہ ہے۔مذکورہ بالا پانچ مستقل ممالک کے علاوہ دس عارضی اراکین کو جنرل اسمبلی دوسالہ میعاد کے لیے منتخب کرتی ہے۔غیر مستقل اراکین میں سے پانچ نشستیں آفروایشیائی ممالک کے لیے۔دو مغربی یوروپ اور دو لاطینی امریکہ اور باقی ماندہ دنیا کے لیے ایک نشست مختص کی گئی ہے۔کونسل کے ہر رکن کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔طریق کار کے معاملات سے متعلق فیصلوں کے لیے پندرہ ارکان میں سے کم از کم نو ووٹ درکار ہیں۔جن میں پانچوں مستقل ارکان کے مثبت ووٹ بھی شامل ہیں۔یہ ضابطہ "عظیم طاقتوں کے اتفاق رائے" کا مظہر ہے۔جسے ہم حق تنسیخ یا ویٹو بھی کہتے ہیں۔اس طرح اقوام متحدہ پانچ بڑی طاقتوں کے دائرہ اثر میں رہ کر کام کرتا ہے۔تیسری دنیا کے ممالک کو اپنی عددی قوت کے علاوہ، مجموعی رقبہ وآبادی کے لحاظ سے ایک فیصلہ کن قوت ہونی چاہیئے۔اس لیے سویت یونین کے بکھراؤ کے بعد سے عالمی طاقت کی نئی تقسیم میں وہ اپنے لیے بھی ایک بھرپور حصے کا مطالبہ کررہے ہیں۔اس کے علاوہ عالمی افق پر نئے کردار ابھر رہے ہیں جو سلامتی کونسل میں اپنے لیے مستقل نشست کا مطالبہ کررہے ہیں۔نیز یہ کہ اکثر ممالک کے خیال میں سویت یونین کے خاتمے سے ادارہ اقوام متحدہ غیر متوازن ہوگیا ہے اور اس پر امریکہ کا غلبہ ہے اور امریکہ اسے اپنے مقاصد کے لیے ایک آلہ کے طور پر استعمال کررہا ہے۔چنانچہ اقوام متحدہ کو امریکہ کے سیاسی وفوجی

مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ بننے سے روکنے کے لیے ضروری ہے کہ سلامتی کونسل کے ڈھانچے میں تبدیلی کی جا کر نئی طاقتوں کو اس میں شامل کیا جائے تا کہ اس طرح یہ زیادہ جمہوری، نمائندہ اور موثر و غیر جانبدارانہ ادارہ کے طور پر کام کر سکے اور حقیقی طور پر عالمی رائے عامہ و رجحانات کی عکاسی و ترجمانی کر سکے۔

چونکہ اقوام متحدہ اب ایک فیصلہ کن اور Authoritative طاقت کا موقف اختیار کر چکا ہے، اسی لیے سلامتی کونسل کے ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ گذشتہ پانچ سالوں کے دوران سلامتی کونسل کو عالمی عاملہ کا حقیقی موقف حاصل ہو چکا ہے۔ آج اقوام متحدہ عالمی امن کے نگرا نکار نہیں بلکہ بر قراری امن کے لیے ذمہ دار ایجنسی کے طور پر peace keeping کا موثر رول ادا کرتے ہوئے قوت نافذہ کو استعمال کر رہا ہے۔ ایران عراق جنگ کے خاتمے کے لیے دونوں سوپر پاورز کی متحدہ قرار داد 598 سے لے کر کویت سے عراق کے تخلیے کے عملی اقدامات، بوسنیا و صومالیہ میں امن کی برقراری کے فوجی رول وغیرہ ان تمام معاملات میں اقوام متحدہ عالمی حکومت کا رول انجام دے چکا ہے۔ چنانچہ برقراری امن Peace keeping کی پندرہ سرگرمیوں میں اس وقت اقوام متحدہ کے تقریباً اسی ہزار 80,000.00 افواج متعین ہیں جس پر ماہانہ 215 ملین ڈالر سے زیادہ کا صرفہ ہو رہا ہے۔ اس طرح اقوام متحدہ کے اس بڑھتے ہوئے رول کے پیش نظر کئی ممالک سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت کے خواہاں ہیں۔ تا کہ اس طرح وہ اقوام متحدہ کو ایک آلہ کار ادارہ بننے سے روک سکیں۔

صنعت و ٹکنالوجی کی ترقی نے قدیم عالمی معاشی تقسیم کو بھی ناکارہ بنا دیا ہے چنانچہ دنیا اب Technotronics کے اس دور سے گذر رہی ہے جس میں ہر طرف نئی معاشی صف بندیاں ہو رہی ہیں اور معاشی قوت ہی بین الاقوامی سیاست میں ایک فیصلہ کن قوت کے طور پر فوجی طاقت پر برتری حاصل کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاپان جو دوسری جنگ عظیم کے بعد سے عالمی سیاست میں ایک خاموش (Passive) عنصر تھا اب ایک طاقتور سرگرم (Dynamic) اداکار کے طور پر ابھر رہا ہے۔ آج جاپان امریکہ کے بعد دنیا کا دوسرا ملک ہے جو فوج پر سب سے زیادہ خرچ کرتا ہے چنانچہ وہ اب سلامتی کونسل میں اپنے لیے ایک مستقل نشست کا مطالبہ زوروں سے کر رہا ہے اسی طرح جرمنی دوبارہ اتحاد سے نہ صرف بڑا ملک بن گیا ہے بلکہ ایک عظیم معاشی قوت کا حامل ملک ہے۔ اس لیے وہ بھی اپنے لیے ایک مستقل نشست کا حامی ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں ہندوستان بھی اپنی آبادی و صنعتی و ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت کا دعویدار ہے۔ یہ فہرست یہیں ختم نہیں ہوتی

بلکہ لاطینی امریکی ملک برازیل اور آفریقی ممالک مصر اور نائجیریا بھی اپنے لیے مستقل نشست کی مہم کا آغاز کیئے ہیں۔لیکن مستقل رکنیت کے لیے ضروری شرائط آفروایشائی ممالک میں صرف ہندوستان ہی پورے کرسکتا ہے‘اور بیشتر ممالک ہندوستان کو اپنا نمائندہ ملک سمجھتے ہیں۔

سابقہ سکریٹری جنرل اقوام متحدہ بطروس غالی نے سلامتی کونسل کی توسیع کے مسئلے پر رکن ممالک سے رائے طلب کی تھی۔امریکہ کا موقف یہ ہے ک جاپان اور جرمنی کو انکی معاشی قوت کے اعتبار سے مستقل رکنیت دی جانی چاہیئے۔جب کہ برطانیہ اور فرانس کی رائے میں سلامتی کونسل کی توسیع کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔برطانیہ اور فرانس کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ سلامتی کونسل میں عظیم تر جرمنی کی موجودگی میں کہیں انکی وقعت نہ گھٹ جائے۔چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ جب موجودہ سلامتی کونسل ہی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کررہی ہے تو اسمیں توسیع کی ضرورت کیا ہے۔اور اہم یہ نہیں ہے کہ سلامتی کونسل کے اراکین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے بلکہ اہم یہ ہے کہ اس کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے۔

سویڈن کے وزیر اعظم Ingvar Carlsson‘ جو Commission of Global Governance کے ساتھی چیرمن بھی تھے‘ نے مابعد سرد جنگ عالمی صیانت میں اقوام متحدہ کو زیادہ جمہوری بنانے کی سفارش کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ سکیوریٹی کونسل میں Standing Members کی نئی رکنیت قایم کی جائے اور صنعتی ممالک سے دو‘ ایشیاء آفریقہ و لاطینی امریکہ کے ممالک سے ایک ایک رکن لیا جائے۔یہ رکنیت ایسے ممالک کو دی جائے جو عالمی امن کے قیام میں تعمیری رول ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔جنرل اسمبلی ان اراکین کو منتخب کریگی۔اسکے علاوہ سلامتی کونسل کے دس عارضی اراکین کی تعداد کو بڑھا کر تیرہ کیا جائے اور اسی تناسب سے قراردادوں کی منظوری کے لیے ضروری ووٹ کی تعداد میں بھی اضافہ کیا جائے۔اسکے ساتھ ساتھ سلامتی کونسل کے پانچ مستقل اراکین اس بات سے اتفاق کریں کہ وہ آئندہ دس سال تک اپنے ویٹو کے حق کے استعمال سے حتی الامکان گریز اور قومی سلامتی کے لیے ضروی انتہائی حالات میں ہی حق ویٹو سے استفادہ کریں گے۔اس طرح پہلے پانچ سالوں میں ویٹو کے عدم استعمال کو دیکھتے ہوئے بعد کے سالوں میں حق ویٹو کو ختم کرنیکے لیے باہمی رضامندی حاصل کی جاسکتی ہے۔



باب 13

علاقائی تنظیمیں

The Regional Organisations

بین الاقوامی سیاست میں علاقائی تنظیمیں دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کی دین ہیں۔ کئی ایک بین الاقوامی تنظیمیں اور ادارے جیسے عرب لیگ 1945ء تنظیم آفریقی اتحاد 1963ء، آرگنائیزیشن آف امریکن اسٹیٹس (OAS) 1948ء یوروپین اکنامک کمیونٹی، 1958ء، آسیان(ASEAN) 1967ء، خلیج تعاون کونسل (GCC) 1981ء اور سارک (SAARC) 1985 اہم ہیں۔ علاقائی تنظیم کسی خاص جغرافیائی علاقے کی مقتدر مملکتوں کی ایک تنظیم ہوتی ہے جس کا مقصد علاقائی تعاون کو فروغ دیتے ہوئے علاقہ کے عوام کے لیے بہتر معیار زندگی کو حاصل کرنا اور علاقہ میں بہر صورت امن کے قیام کے ذریعہ معاشی ترقی کو یقینی بنانا ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی علاقائی تنظیم میں صرف اس علاقے کے ممالک ہی شامل ہوں۔ اٹلی یونان اور ترکی شمالی بحیرہ اوقیانوس کے ممالک نہ ہونے کے باوجود بھی ناٹو کا ایک حصہ ہیں۔ افغانستان جنوبی ایشیاء میں ہونے کے باوجود سارک کا رکن نہیں ہے۔ کینیڈا بھی آرگنائیزیشن آف امریکن اسٹیٹس کا رکن نہیں ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں علاقہ واریت کسی علاقہ کی تین یا زائد مملکتوں کے باہمی اتحاد کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مشترکہ مفادات کے ساتھ ساتھ جغرافیائی خصوصیات خصوصاً نسل، زبان، تاریخ اور تہذیب کے مشترکہ رشتے میں بندھے ہوتے ہیں اور ان مشترکہ رشتوں کی وجہ سے ممالک باہمی تعلق واتحاد کے ذریعہ علاقائی تعاون وامن کو فروغ دینے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ''ایک علاقائی اتحاد یا معاہدہ مقتدر مملکتوں کی ایک علاقہ میں مشترکہ مفادات کی حامل ممالک کی رضا کارانہ انجمن ہوتی ہے جس کا مقصد اس علاقے میں مل جل کر کام کرتے ہوئے انسانی ترقی کو پانا ہوتا ہے۔ اس میں کسی طرح بھی ایک دوسرے کے خلاف فوجی عزائم نہیں ہوتے''۔

یوروپین کمیونٹی

یوروپین کمیونٹی جو اب یوروپین یونین کہلاتی ہے یوروپ کے ممالک کی ایک اہم علاقائی انجمن ہے جو بتدریج ترقی کے منازل طئے کرتے ہوئے آج متحدہ یوروپ کی نمائندہ تنظیم بن گئی ہے۔ یوروپین اکنامک کمیونٹی کا قیام جنوری 1958ء میں عمل میں آیا۔ فرانس، بلجیم، نیدرلینڈ، لگسمبرگ، اٹلی اور مغربی جرمنی 6 ابتدائی اراکین تھے۔ یوروپین کول اینڈ اسٹیل کمیونٹی (ECSC) 1950ء کے قیام سے متحدہ

یوروپ کی تحریک کوتقویت ملی۔ECSC کے ذریعہ یوروپ کے مندرجہ بالا چھ ممالک کی لوہے،فولاداور کوئلے کی صنعتوں کوایک ماورائے قوم اختیار (Supranational Authority) کے ذریعہ مربوط کیا گیا تھا۔اس کی کامیاب کارکردگی کے نتیجے میں روم معاہدہ Treaty of Rome 1957 کے ذریعہ یوروپین اکنامک کمیونٹی کا قیام عمل میں آیا۔ابتدائی چھ اراکین سے اب اس کے رکن ممالک کی تعداد بڑھتے بڑھتے 15 ہوگئی ہے۔اس کے قیام کے دواہم مقاصد تھے 1. کمیونسٹ روس کے خطرات کے خلاف مغربی یوروپ کوسیاسی طور پر متحد کرنا اور 2. جنگ سے تباہ شدہ یوروپی معیشت کی تعمیرنو کرنا۔اس کے قیام سے رکن ممالک کے درمیان اشیاء،سرمایہ اورمحنت کی آزادانہ نقل وحرکت پر طبعی ومالی تحدیدات ختم ہوگئیں۔تیسرے ممالک سے درآمدات پر عائد ہونے والے ٹیرف کوسب کے لیے یکساں بنایا گیا اوررکن ممالک کی معاشی پالیسیوں میں ہم آہنگی پیدا کی گئی۔

رکنیت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ یوروپین کمیونٹی ارتباط (Integration) کے عمل کوتیز کی۔ چھ ممالک کی جانب سے 1957ء میں قایم کردہ یوروپین ایٹمک انرجی کمیونٹی ECSC،EURATOM اور EEC ایک واحد یوروپین کمیونٹی میں تبدیل ہوگئے۔ 70 کے دہے کے خاتمہ تک کسٹمس یونین، یوروپین مانٹیری یونین (EMU) اورراست طور پر منتخبہ یوروپی پارلیمنٹ وغیرہ یوروپین کمیونٹی کی حاصل کردہ کامیابیاں تھیں۔قومی سرحدی رکاوٹوں کے بغیراشیاء وخدمات میں مشترکہ منڈی کے قیام کے لیے 1985 میں منظورہ سنگل یوروپین ایکٹ یوروپین یونین کے لیے بنیاد کا پتھر ثابت ہوا۔ 1992ء میں یوروپین کمیونٹی کے اراکین کی تعداد بارہ تھی جواس طرح ہے برطانیہ، بلجیم، ڈنمارک، فرانس، جرمنی، یونان، آئیرلینڈ، اٹلی، لکسمبرگ، نیدرلینڈ، پرتگال اوراسپین۔

فبروری 1992ء میں یورپین کمیونٹی کے بارہ سربراہان مملکت وحکومت نیدرلینڈ کے شہر ماسٹرچ میں ملاقات کیے اورایک یوروپین یونین کے قیام کا فیصلہ کیے۔اس کا نفاذ یکم نومبر 1993ء سے اس وقت عمل میں آیا جب کہ مذکورہ بالاتمام بارہ ممالک کی قومی پارلیمنٹس نے اس کی منظوری یا توثیق کی۔

اس معاہدہ کے تحت مذکورہ بارہ ممالک اپنی سرحدوں کوختم کرکے ایک وسیع یوروپین کمیونٹی تشکیل دیں گے۔ پہلے مرحلے میں ان ممالک کی مشترکہ تجارتی منڈی قایم ہوگی۔ معاشی اصلاحات، خارجی معاملات، مشترکہ سکیوریٹی نظام، تجارت، زراعت، حمل ونقل، صحت قانون، تعلیم، توانائی اور سیاحت یوروپین کمیونٹی کے مشترکہ اختیارات ہوں گے۔ یورپین کمیونٹی قوموں کے داخلی معاملات میں حد سے زیادہ غیرضروری مداخلت سے گریز کرے گی۔ عام ضروریات کے تحت یوروپین کمیونٹی باتفاق رائے

یکساں قوانین مدون کرسکتی ہے۔ لیکن معاہدہ اس بات کی مخالفت کرتا ہے کہ متعدد علاقوں میں جہاں اس وقت حق رائے دہی کے ذریعہ کوئی فیصلہ کرنا ہو تو ایسی صورت میں مختلف اقوام میں ووٹ کی طاقت کو رواج دینا ضروری ہے۔

سیاسی اصلاحات کے تحت، تمام بارہ ممالک کے شہری مساوی درجہ کے حامل ہونے کی وجہ سے آزادانہ طور پر کہیں بھی سکونت، تجارت یا نوکری کر سکتے ہیں۔ بلدیاتی انتخابات میں کسی بھی ممبر ملک کا کوئی بھی شہری کسی بھی ملک کے شہر میں امیدوار بن سکتا ہے اور کہیں بھی ووٹ دے سکتا ہے۔ اسی طرح یوروپین پارلیمنٹ کے لیے بھی کسی بھی ملک و علاقہ سے انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے۔ خارجی معاملات میں یوروپین کمیونٹی کی آواز ایک ہی ہوگی اور سیکوریٹی، صیانت بشمول مشترکہ صیانتی حکمت عملی آگے چل کر مشترکہ دفاعی نظام میں تبدیل ہو جائے گی۔ تمام ممبر ممالک کے سنٹرل بینک یکم جنوری 1994 سے ایک مرکزی بینک سے مربوط ہو گئے ہیں۔ یکم جنوری 1997ء کو تمام ممبر ممالک افراط زر، خسارہ، شرح سود، بجٹ اور کرنسی کے استحکام پر ایک معاہدہ کیے جس کے نتیجہ میں یکم جنوری 1999ء سے ایک مشترکہ کرنسی یورو (Euro) کو اپنائے۔ تین سال تک قومی کرنسی اور یورو ساتھ ساتھ چلے۔ جنوری 2002ء سے قومی کرنسی کا چلن ختم ہوا اور یکم جنوری 2002ء رات 12 بجے سے 12 یورو ممالک کے 300 ملین عوام کے لیے یورو کرنسی شروع ہوئی۔ یوروپین یونین کے تین ممالک ڈنمارک، سویڈن اور برطانیہ یورو کرنسی کو اپنانے سے انکار کیے۔ امکان ہے کہ یہ تین ممالک 2003ء تک یورو کرنسی کو اپنائیں گے۔ پورے یوروپ کے لیے واحد یورو کرنسی اپنانے کے نتیجہ میں یوروپ میں تجارت اور سرمایہ مشغول کرنے میں سہولت ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اس کی وجہ سے یوروپ کی معیشت ایک مربوط معیشت ہوگی اور تیسرے یہ کہ عالمی معیشت میں یوروپ کی اہمیت میں اضافہ ہوگا۔ چنانچہ عالمی تجارت میں یوروپین یونین کا مشترکہ حصہ 25% ہے۔ اس طرح امریکہ پر یوروپین یونین کو سبقت ہوگی۔

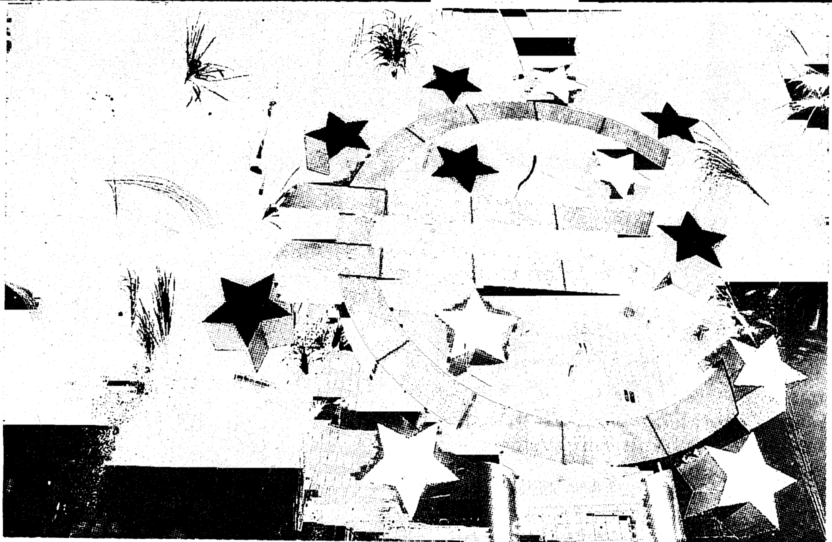
تنظیمی ساخت

یوروپین یونین ایک یوروپین کمیشن، مجلس وزراء (Council of Ministers)، یوروپین پارلیمنٹ، معاشی وسماجی کمیٹی اور عدالت انصاف (Court of Justice) پر مشتمل ہے۔ کمیشن قومی حکومتوں کی جانب سے نامزدہ اراکین پر مشتمل ہوتا ہے جو چار سالہ میعاد کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہ کمیشن عاملانہ فرائض انجام دیتا ہے اور پالیسی امور میں اہم فیصلے کرتا ہے۔ یہ کونسل آف منسٹرس کی جانب سے کیے گیے فیصلوں کی عمل آوری کو یقینی بناتا ہے۔ مجلس وزراء ہر رکن ملک سے ایک وزیر پر مشتمل

European Union
Members
Aspirants

یوروپین یونین اوراس کا نشان

Iceland
ATLANTIC
OCEAN
North
sea
Norway
Sweden
Finland
RUSSIA
Estonia
Lativia
Lithuania
Denmark
UK
Netherlands
Belguim
Germany
Poland
Luxem
bourg
Czech Rep.
Slovakia
Ukraine
France
Austria
Hungary
Romania
Italy
Spain
Adriatic Sea
Black Sea
Bulgaria
TURKEY
Greece
Malta
AFRICA
Cyprus
MEDITERRANEAN SEA



ہوتی ہے۔ مجلس وزراء کا مہینے میں کم از کم ایک اجلاس ہوتا ہے جس میں تمام اہم امور کے متعلق فیصلے کیے جاتے ہیں۔ وزراء کی کونسل کمیشن کے ساتھ مکمل تعاون کرتی ہے۔ کمیشن مجلس وزراء کے مباحث میں عملی حصہ لیتا ہے۔

یوروپی پارلیمنٹ یا اسمبلی تمام ممبر مملکتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان نمائندوں کو متعلقہ ممالک کی مقننہ منتخب کرتی ہے۔ یہ 142 اراکین پر مشتمل ہوتی ہے۔ ممالک کو ان کی آبادی و معاشی قوت کی بنیاد پر طئے شدہ تناسب سے نمائندگی دی گئی ہے۔ یہ نمائندے اپنی حکومتوں کی ہدایات کے مطابق کام نہیں کرتے بلکہ وہ آزادانہ طور پر فیصلے لیتے ہیں۔ پارلیمنٹ مباحث اور سالانہ رپورٹوں کے ذریعہ کمیشن اور کونسل پر نگرانی رکھتی ہے۔ پارلیمنٹ کونسل سے رسمی سفارشات بھی کرسکتی ہے لیکن یہ سفارشات کونسل کے لیے لازمی نہیں۔

معاشی وسماجی کمیٹی (ECSC) مختلف ممالک کی معاشی وسماجی زندگی سے تعلق رکھنے والے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ انھیں چار سالہ میعاد کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ عموماً 1/3 اراکین ٹریڈ یونین، 1/3 ملازمین اور باقی عام مفادات کے نمائندے ہوتے ہیں۔ عدالت انصاف کے اراکین کو چھ سالہ میعاد کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ رکن ممالک میں پیدا ہونے والے تنازعات کو حل کرتی ہے۔ اس کے فیصلوں کی پابندی تمام فریقین کے لیے لازمی ہے اور ان فیصلوں کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جاسکے گی۔ یوروپین کمیونٹی کے تمام ممالک ایک طئے شدہ تناسب سے اپنا چندہ دیتے ہیں جن سے انتظامی اخراجات کی تکمیل ہوتی ہے۔

یوروپین کمیونٹی ایک موثر علاقائی تنظیم ثابت ہوئی ہے۔ یہ نہ صرف رکن ممالک کے درمیان ٹیرف کے مسائل کو حل کی ہے بلکہ ان کے درمیان عظیم تر تعاون کو فروغ دیتے ہوئے معاشی ترقی کے میدان میں دنیا کے دوسرے علاقوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت کا مظاہرہ کی ہے۔ جس سے دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی علاقائی تعاون کے جذبے کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ یوروپین یونین کے اراکین کی تعداد اس وقت پندرہ ہے جب کہ مزید 14 ممالک اس کی رکنیت حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔

یوروپین یونین اور ہندوستان

یوروپین کمیونٹی سے سب سے پہلے بہتر تعلقات قایم کرنے والے ممالک میں ہندوستان آگے تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے یوروپین کمیونٹی سے تعلقات 1960ء کے دہے سے ہیں۔ 1993ء میں ہندوستان یوروپین یونین سے تعلقات کی تجدید کرتے ہوئے "ترقی میں ساجھے داری"

(Partnership in Development) کا ایک نیا معاہدہ کیا۔ 1996ء میں ہندوستان اور یوروپین یونین نے ایک یادداشت مفاہمت (MOU) پر دستخط کیے۔ اگست 1997ء میں یوروپین یونین نے ہندوستان میں صحت کی نگہداشت پروگرام کی عمل آوری کے لیے 250 ملین ڈالر کا عطیہ ہندوستان کو دیا۔ زراعت، توانائی "سیاحت" اطلاعاتی ٹکنالوجی اور ٹیلی مواصلات میں تعاون سے یوروپین یونین اور ہندوستان کے درمیان وسیع تر مفاہمت پائی جاتی ہے۔ یوروپین یونین نے ہندوستان کو تجارت کے لیے پسندیدہ ملک (Most Fovoured Nation) کا موقف دیا ہے۔ ہندوستان کی 30% برآمدات یوروپین یونین کو جاتی ہیں خصوصاً زراعتی پیداوار میں ہندوستان کو اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ زراعت کے شعبہ میں بہتر سوجھ بوجھ کے لیے دونوں طرف کے ماہرین کا ایک گروپ تشکیل دیا گیا۔ ہندوستان یوروپین یونین کو 1,274 ملین یورو مالیت کی زراعتی پیداوار برآمد کرتا ہے جب کہ یوروپین یونین کی ہندوستان کو برآمدات 152 ملین یورو کی ہیں۔ چنانچہ یوروپین یونین سے ہندوستان کو برآمد کیے جانے والے ہر ڈالر کے مقابلے میں ہندوستان دس ڈالر یوروپین یونین کو برآمد کرتا ہے [1]۔ ہندوستان اور یوروپین یونین کی پہلی چوٹی کانفرنس پرتگال کے شہر Lisbon میں سال 2000ء میں منعقد ہوئی تھی جس میں تجارت و سرمایہ کاری میں اضافہ کے لیے اقدامات تجویز کیے گئے تھے۔ نومبر 2001ء میں نئی دہلی میں منعقدہ دوسری ہند۔ یوروپین یونین چوٹی کانفرنس میں آئندہ پانچ برسوں کے دوران باہمی تجارت کو 25 بلین یورو سے بڑھا کر دوگنی یعنی 50 بلین یورو کرنا طئے کیا گیا [2]۔ اگرچیکہ یوروپین یونین ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی ساجھے دار ہے اس کے باوجود ہندوستان اور یوروپین یونین کے درمیان تجارتی معاملات میں خلیج وسیع ہے۔ سال 2000-1999ء کے درمیان دوطرفہ تجارت 25,661,000 یورو تھی جو کہ ہندوستان کی تقریباً 30% برآمدات پر مشتمل ہے [3]۔ ہندوستان کو ٹکسٹائیل درآمدات پر ٹیرف میں کمی کرنے کی ضرورت ہے تبھی کپڑا برآمد کرنے والے یوروپی تاجرین کو مواقع مل سکتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کو یہ شکایت ہے کہ یوروپین یونین کوٹا طریقہ کار کو ختم نہیں کر رہا ہے۔

آسیان ASEAN

یہ جنوب مشرقی ایشائی ممالک کی تنظیم ہے جس کو 1967ء میں بنکاک اعلامیہ کے ذریعہ انڈونیشیاء، ملائیشیاء، سنگاپور، فلپائنس، اور تھائی لینڈ نے قایم کیا تھا۔ بعد میں 1984ء میں ویتنام اور 1997ء میں لاؤس و مینمار (برما) اور کمبوڈیا بھی اس میں شامل ہوئے۔ اس طرح آسیان کے اب

---

1. دی ہندو 18 اپریل 2001ء صفحہ 15   2. دی ہندو 24 اپریل 2001ء صفحہ 1   3. دی ہندو 21 نومبر 2001ء صفحہ 12

10 ممالک ہیں۔ اس تنظیم کے قیام کے حالات اور وجوہات عجیب وغریب ہیں۔ اس کے بانی پانچ ممالک انڈونیشیا، ملائیشیاء، سنگاپور، فلپائین اور تھائی لینڈ کے درمیان کئی ایک باہمی تنازعات تھے۔ انڈونیشیاء کے صدر سکارنو (Sukarno) کے دور میں انڈونیشیاء کی پالیسی ملائیشیا کو "کچل دینے" کی تھی۔ یہاں تک کہ 1965ء میں ملائیشیاء کے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے عارضی رکن منتخب ہونے کے خلاف انڈونیشیاء اقوام متحدہ کی رکنیت سے علیحدگی اختیار کرلیا تھا دوسری طرف ملیشیاء اور فلپائین کے درمیان علاقائی تنازعہ تھا۔ سنگاپور کو ملائیشیائی وفاق سے خارج کردیا گیا تھا۔ ان مخالفانہ حالات میں آسیان کا قیام حیرت انگیز واقعہ تھا۔

1963ء میں فرانسیسی، ہند۔ چین میں تصادم اپنے عروج پر تھا۔ جنوبی ویتنام میں تقریباً آدھے ملین امریکی افواج کمیونسٹ گوریلاوں کے خلاف جنگ لڑرہے تھے۔ چنانچہ جنوبی ایشیاء کے ان ممالک کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر جنوبی ویتنام میں کمیونزم کی فتح ہوتی ہے تو وہ بھی کمیونسٹ توسیعت پسندی کا شکار ہوجائیں گے۔ ان پانچ ممالک کے سامنے اپنی سلامتی وحفاظت کا واحد راستہ آپسی اتحاد تھا۔ چنانچہ انڈونیشیاء، ملائیشیاء، فلپائین، سنگاپور اور تھائی لینڈ کے وزرائے خارجہ اگست 1967ء میں بنکاک میں ملاقات کیے اور 8 اگست کو علاقہ میں معاشی وتہذیبی تعاون کے فروغ کے لیے ایک انجمن کے قیام کا اعلامیہ جاری کیے جو بنکاک اعلامیہ کہلاتا ہے۔ اس کے اہم مقاصد اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

1. علاقہ میں معاشی نمو، سماجی ترقی اور تمدنی ترقی کو تیز کرنا۔
2. علاقائی امن واستحکام کو فروغ دینا۔
3. معاشی، سماجی، تہذیبی، تکنیکی، سائنسی اور انتظامی میدانوں میں سرگرم تعاون وباہمی مدد کو فروغ دینا۔
4. تعلیمی، تکنیکی اور انتظامی میدانوں میں ایک دوسرے کو ٹریننگ اور تحقیق کی شکل میں مدد فراہم کرنا۔
5. جنوب مشرقی ایشیائی مطالعہ کو فروغ دینا۔
6. زراعت وصنعت میں ایک دوسرے سے استفادہ کو فروغ اور تجارت کو وسعت دینا۔

آسیان کی تنظیم وزارتی کانفرنس، مجلس قائمہ (Standing Committee)، سکریٹریٹ اور کئی ایک مستقل وعارضی کمیٹیوں پر مشتمل ہے۔ وزارتی کانفرنس رکن ممالک کے وزرائے خارجہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس علاقہ سے متعلق فوجی ودیگر امور پر غور وخوض کے لیے وزارتی کونسل کے وقتاً فوقتاً اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔ عموماً اس کے اجلاس رکن ممالک میں یکے بعد دیگرے ہر سال ہوتے ہیں۔ اسٹانڈنگ کمیٹی کے اجلاس ضرورتاً ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کمیٹی میزبان ملک کے وزیر خارجہ اور دیگر رکن ممالک کے سفراء

پر مشتمل ہوتی ہے۔ 1976ء میں اس کا سکریٹریٹ جکارتہ میں قایم کیا گیا۔ آسیان کی اب تک سات چوٹی کانفرنسیں ہوئی ہیں۔ ساتویں چوٹی کانفرنس نومبر 2001ء میں برونی میں ہوئی ۔ 1975ء سے آسیان ایک سرگرم علاقائی تنظیم کے طور پر کام کررہی ہے۔ جنوری 1992ء میں سنگاپور میں ہوئی چوتھی چوٹی کانفرنس میں معاشی تعاون کوفروغ دینے کے لیے (ASEAN Free Trade Area) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کا نفاذ 2003ء سے ہوگا۔ 1971ء میں آسیان نے جنوب مشرقی ایشیاء کو منطقہ امن قرار دیا تھا تا کہ یہ علاقہ بڑی طاقتوں کے اثر سے آزاد ہو۔ 1992ء میں آسیان نے دنیا کے چند ممالک جیسے ہندوستان، امریکہ، جاپان، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو Dialogue Partner کا موقف دیا ہے۔ جن کے ساتھ آسیان ممالک معاشی تعاون کو خصوصی طور پر فروغ دیں گے۔ جولائی 1993ء میں آسیان نے آسیان ریجنل فورم (ARF) کا قیام عمل میں لایا جس میں 1998ء میں دس آسیان اور بارہ غیر آسیان ممالک شامل ہیں۔ ہندوستان ان میں سے ایک ہے۔

آسیان اور ہندوستان

آسیان ممالک ہندوستان کے قریبی پڑوسی ممالک ہیں۔ 1997ء میں آسیان میں مائنمار (برما) کی شمولیت سے ہندوستان کی آسیان کے ساتھ مشترکہ سرحد ہے۔ ہندوستان کے آسیان ممالک سے تاریخی تعلقات کے ساتھ ساتھ تہذیبی روایات بھی ہیں۔ آسیان ممالک کی جدوجہد آزادی میں ہندوستان ان کا ساتھ دیا تھا۔ اسی لیے 1992ء میں جب ہندوستان آسیان کے ساتھ تجارت، سیاحت اور ٹکنیکل میدان میں بات کی تجویز رکھی تو آسیان نے اسے بآسانی قبول کرلیا۔ انڈونیشیاء، اور ملائیشیاء کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی وتہذیبی تعلقات ہیں۔ سال 2000ء وزیراعظم واجپائی نے انڈونیشیاء اور ملائیشیاء کا دورہ کیا۔ مائینمار سے ہندوستان کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ چنانچہ ہندوستان اب آسیان کے ساتھ چوٹی ملاقات کا خواہاں ہے۔

سارک SAARC

علاقہ واریت کا رجحان جنوب مشرقی ایشیاء میں بھی 1980ء کے دہے میں فروغ پایا۔ جنوبی ایشیاء کے نو میں سات ممالک بنگلہ دیش، بھوٹان، ہندوستان، مالدیپ، نیپال، پاکستان اور سری لنکا (افغانستان اور برما دوسرے دو ممالک ہیں) کے درمیان علاقائی تعاون عمل کے لیے سارک تنظیم کا قیام مابعد دوسری جنگ عظیم کے دور میں علاقائی تعاون کے لیے کی گئی کوششوں میں سب سے اہم ہے۔

سارک کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ ہے، چونکہ جنوبی ایشیاء میں علاقائی تعاون کی کوشش پہلی بار حقیقی معنوں میں سوپر پاورس کے اثرات سے آزاد اور خود اختیارانہ طور پر اجتماعی تعلقات کے ذریعہ علاقائی ترقی کی طرف ایک اہم جہت تھی۔ سارک کے فیصلے اور سرگرمیاں رکن ممالک کی اجتماعی فکر کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ جنوبی ایشیاء کے یہ سات ممالک الگ الگ سیاسی وحکومتی ڈھانچوں کے حامل ہیں۔ بعض ممالک جمہوری وسیکولر آئین (دستور) رکھتے ہیں تو بعض ممالک میں شاہی و مذہبی حکومتیں ہیں، جب کہ بنگلہ دیش و پاکستان اکثر فوجی حکومتوں کے زیر اثر رہے ہیں اور اب صرف بھوٹان و پاکستان کو چھوڑ کر تمام ممالک میں عوامی منتخبہ دستوری و جمہوری حکومتیں کام کررہی ہیں۔ اس کے علاوہ جغرافیائی و تاریخی وحدت اس علاقے میں سیاسی جغرافیہ سے بالاتر ہے۔ یہ ممالک نہ صرف سماجی، تہذیبی مذہبی ونفسیاتی طور پر مشترکہ قدروں کے حامل ہیں بلکہ یہاں کے عوام میں کچھ حد تک نسلی یکسانیت اور خونی رشتہ بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس علاقے کے ممالک اپنے سیاسی اختلافات کی وجہ سے کبھی کسی مشترکہ مساعی کے ذریعے اپنے عمومی نوعیت کے مسائل کے حل کی اجتماعی کوشش نہیں کیے۔ جنوبی ایشیاء کے یہ سات ممالک آبادی کے اعتبار سے دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی رکھتے ہیں۔ لیکن فی کس آمدنی کے اعتبار سے غریب ترین اور پسماندہ ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور بھوٹان نہ صرف جغرافیائی وحدت رکھتے ہیں بلکہ ان کی تاریخی روایات اور سماجی و مذہبی قدریں مشترکہ ہیں۔ سری لنکا اور مالدیپ بحر ہند کی دو چھوٹی مملکتیں ہیں اور ان کے ہندوستان و پاکستان سے خصوصیت کے ساتھ نسلی تاریخی اور مذہبی تعلقات ہیں۔ چنانچہ بدلتی دنیا کے حقائق کے پیش نظر ان تمام ممالک کے درمیان بہتر تنظیمی وابستگی کے ساتھ اتحاد کے تعلقات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی تاکہ اس پورے علاقے کے مشترکہ مسائل جیسے منشیات ماحولیات، انتہا پسندی وغیرہ سے نمٹا جاسکے۔

آج سے زائد از دو دہے قبل جنوبی ایشیاء کے ممالک میں تعاون کے فروغ کے لیے بنگلہ دیش کے صدر مرحوم ضیاء الرحمٰن نے پہل کرتے ہوئے پڑوسی ممالک ہندوستان، نیپال، پاکستان اور سری لنکا کا دورہ کیا اور ان ملکوں کے قائدین سے آپسی تعاون کے فروغ کے لیے بات چیت کی۔ بعد میں انہوں نے ان ملکوں کے سربراہان حکومتوں کو اپنے ایک مراسلہ میں علاقائی تعاون کے لیے ادارتی انتظام کو قایم کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے ایک چوٹی کانفرنس کی تجویز رکھی تھی۔ پڑوسی ممالک کے درمیان تعاون کے فروغ کے شعبوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک مسودہ دستاویز بھی ان ممالک میں گشت کروائی جو بعد میں سارک علاقائی تنظیم کے قیام کا باعث بنی۔ اس میں انہوں نے علاقے کے تمام

ممالک کے درمیان باہمی مفادات کے معاملات میں تعاون، باہمی اعتماد اور سوجھ بوجھ کو فروغ دینے و نیز علاقے میں ترقیاتی خلیج کو کم کرنے کے اقدامات کے لیے جنوبی ایشیاء کے ممالک میں تعاون کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے گیارہ ایسے شعبوں کی نشاندہی کی تھی جس میں علاقے کے ممالک ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔ جس میں مواصلات، موسمیات، حمل و نقل، جہاز رانی، سیاحت، دیہی ترقی، تہذیبی تعاون اور سائنس و ٹکنالوجی میں تعاون قابل ذکر ہیں۔

جنوبی ایشیاء کے ان سات ممالک کے معتمدین خارجہ کی اپریل 1981ء میں منعقدہ کانفرنس میں صدر بنگلہ دیش کی تجاویز کا جائزہ لیا گیا اور علاقائی تعاون سے اتفاق کرتے ہوئے پانچ شعبوں زراعت، دیہی ترقی، مواصلات، موسمیات، صحت و آبادی کی سرگرمیوں کی نشاندہی کی گئی اور بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال اور پاکستان کو ان شعبوں میں کوآرڈینیٹر کے طور پر کام کرنے اور سفارشات پیش کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس کے علاوہ ساتوں ممالک کے اعلیٰ عہدہ داروں پر مشتمل ایک کمیٹی ممکنہ تعاون کے دوسرے شعبوں کی نشاندہی کے لیے مقرر کی گئی اور سری لنکا کو اس کمیٹی کا کوآرڈینیٹر مقرر کیا گیا۔ اس کمیٹی نے آپسی ممکنہ تعاون کے جملہ تیرہ شعبوں کی نشاندہی کی۔

ان کاوشوں کے نتیجے میں بالآخر ڈسمبر 1985ء میں سات ایشیائی ممالک کی پہلی چوٹی کانفرنس ڈھاکہ میں منعقد ہوئی جس میں علاقائی تعاون کو ''SAARC'' جنوبی ایشیائی اسوسی ایشن برائے علاقائی تعاون کا نام دیا گیا۔ اس طرح باضابطہ طور پر سارک کے قیام کا اعلان ہوا اور متفقہ طور پر ایک سکریٹریٹ کے قیام کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ نومبر 1986ء کی بنگلور سارک چوٹی کانفرنس نے کھٹمنڈو میں سارک کے لیے ایک مستقل سکریٹریٹ کے قیام کا فیصلہ کیا، اس طرح سارک تنظیم ایک باضابطہ ادارتی شکل اختیار کر لی۔ لیکن بنگلور کانفرنس کو زیادہ کامیاب نہیں کہا جاسکتا چونکہ معاشی تجارت اور صنعتی تجارت کے لیے ہندوستانی اپیل کی پاکستان کی جانب سے محض اس خوف سے مخالفت کی گئی کہ کہیں ہندوستان اپنی برتری کے ذریعہ بہتر موقف حاصل نہ کر لے۔ اس طرح سارک کانفرنس باہمی شکوک و شبہات کی فضاء کو ختم نہ کر سکی اور ابھی تک یہ باہمی شبہات کے دباؤ میں ہی ہے۔ دوسری طرف جنوبی ایشیاء کے دوسرے ممالک بھی سارک میں شرکت کے خواہش مند ہیں۔ نومبر 1987ء کی کھٹمنڈو تیسری چوٹی کانفرنس میں شمولیت کے لیے افغانستان کی درخواست پر غور کیا گیا، لیکن ابھی تک افغانستان کی درخواست تصفیہ طلب ہے۔ برما بھی سارک میں شرکت کا خواہش مند ہے۔ اس کانفرنس میں سارک ممالک میں بہتر اطلاعات کے لیے ایک سارک آڈیو ویژول ایکسچینج (SAVE) پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

سارک کی پانچویں چوٹی کانفرنس 1990ء مالدیپ کے صدر مقام مالے میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں مشترکہ پراجکٹوں کے لیے ایک علاقائی فنڈ قایم کرنا طئے کیا گیا۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں ایک ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ سنٹر، کھٹمنڈو میں ایک علاقائی ٹی بی سنٹر اور دہلی میں ایک علاقائی ڈاکومنٹیشن سنٹر قایم کرنا طئے کیا گیا۔ ڈسمبر 1991ء میں سری لنکا کے صدر مقام کولمبو میں ہوئی چھٹی چوٹی کانفرنس اس اعتبار سے اہم تھی کہ اس میں جنوبی ایشیائی ترجیحی تجارت کا معاہدہ South Asian Preferential Trade Agreement (SAPTA) کے لیے سری لنکا کی تجویز سامنے آئی۔ اپریل 1993ء کی ساتویں ڈھاکہ چوٹی کانفرنس نے SAPTA کی تجویز کو منظوری دیتے ہوئے ایک 63 نکاتی ڈھاکہ اعلامیہ جاری کیا۔ اس کانفرنس میں یہ طئے کیا گیا کہ رکن ممالک آپسی درآمدات کے لیے دس فیصد ٹیرف میں کمی کریں گے۔ اس کے علاوہ رکن ممالک میں معاشی تعاون کو فروغ دینے کے لیے آئندہ پندرہ برسوں میں مرحلہ وار طریقے پر ٹیرف کو ختم کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا گیا۔ ڈھاکہ اعلامیہ میں جنوبی ایشیاء میں غربت کے خاتمہ کے لیے مربوط پروگرام کو منظور کیا گیا۔ ماحول، آبادی، خواتین، معذور افراد، بچوں اور نوجوانوں کے لیے مربوط پروگرام سے بھی اتفاق کیا گیا۔ دہشت گردی، منشیات، کے خلاف مشترکہ اقدام کو اس اعلامیہ میں شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک Suoth Asian Development Fund (SADF) کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

آٹھویں چوٹی کانفرنس مئی 1995ء میں نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں SAPTA کی توثیق کرتے ہوئے سارک کی دسویں سالگرہ کی مناسبت سے ڈسمبر 1995ء سے اس کے نفاذ کا اعلان کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں رکن ممالک کے درمیان تجارت اور درآمدات کے لیے کسٹم اور اکسائیز رعایتیں دی گئیں۔ ہندوستان رکن ممالک سے 106 مصنوعات کی درآمد پر کسٹم اور اکسائیز رعایتوں کا اعلان کیا۔ جب کہ پاکستان 35، سری لنکا31، مالدیپ17، نیپال 14، بنگلہ دیش 12 اور بھوتان 7 مصنوعات کو درآمدی تحدیدات سے آزاد کیے۔ بہتر تجارتی تعلقات کے لیے سارک ممالک ساؤتھ ایشین فری ٹریڈ اگریمنٹ (SAPTA) کے قیام کے لیے بھی رضامندی کا اظہار کیے۔ ساؤتھ ایشین ڈیولپمنٹ فنڈ کے لیے عملی اقدامات کرتے ہوئے ہندوستان 20 ملین روپیے، پاکستان 22 ملین روپیے، بنگلہ دیش 6 ملین ٹکا، بھوتان 2 ملین نوگی ٹرم (Nugi Trum)، مالدیپ ایک ملین روپیہ، نیپال اور سری لنکا فی کس چھ ملین روپیے دینے کا اعلان کیے۔

نویں سارک چوٹی کانفرنس مئی 1997ء میں مالے (مالدیپ) میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس

میں 2001ء سے SAFTA کا اعلان کیا گیا۔ جولائی 1998ء میں کولمبوسری لنکا میں منعقدہ دسویں چوٹی کانفرنس بڑی اہمیت کی حامل ثابت ہوئی۔ یہ کانفرنس ایک ایسے وقت ہوئی جب کہ ہندوستان اور پاکستان کی جانب سے کیے گئے نیوکلیر تجربات کی وجہ سے پورا علاقائی منظراور طاقت کا توازن تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف اور ان کے وزیر خارجہ نے سارک کانفرنسوں میں ممالک کے باہمی مسائل کو اٹھانے کی گنجائش فراہم کرنے کے لیے سارک منشور میں ترمیم کی تجویز پیش کی۔ لیکن اراکین نے اس تجویز کو مسترد کردیا۔ اس طرح باہمی مسائل کو سارک فورم میں اٹھانے کی پاکستانی کوشش ناکام ہوگئیں۔ اس کانفرنس میں عالمیانہ (Globalisation) کے نتیجے میں پیدا ہونے والی عالمی معاشی صورتحال اور WTO کا جائزہ لیا گیا۔ باہمی تجارت کو فروغ دینے کے لیے ہندوستان کے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے ہندوستان کی جانب سے 2,000 اشیاء پر سے درآمدی تحدیدات کی برخواستگی اور ہندوستانی سرمایہ کاروں کی جانب سے اس علاقے میں سرمایہ کاری کی حد کو 15 ملین ڈالرز تک بڑھانے کا اعلان کیا۔ پاکستان کے سوا تمام ممالک 2001ء سے SAFTA کے نفاذ کے لیے رضامند ہوئے۔ پاکستان اس کا نفاذ 2003 سے کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جنوری 2002ء تک بھی SAFTA کا نفاذ ممکن نہ ہوسکا۔

اکٹوبر 1999ء میں پاکستان میں حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے کھٹمنڈو میں منعقدشدنی گیارہویں چوٹی کانفرنس مسلسل التواء کے بعد جنوری 2002ء میں منعقد ہوئی۔ کھٹمنڈو اعلامیہ میں دہشت گردی کی تمام شکلوں اور مظاہر کے خلاف جدوجہد کا عہد کرتے ہوئے 11 سپٹمبر 2001ء کے حملوں کے بعد اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 1373 کی حمایت کی گئی اور دہشت گردی کے خلاف 1987ء کے سارک معاہدہ پر عمل کا فیصلہ کیا گیا۔ جنوبی ایشیاء میں آزادانہ تجارت اور سماجی شعبہ کے دیگر مسائل کو بھی اس اعلامیہ میں شامل کیا گیا۔ بارہویں چوٹی کانفرنس 2003ء میں اسلام آباد (پاکستان) میں ہوگی۔

سارک تنظیم اپنے سالانہ سربراہ اجلاسوں کے ذریعہ علاقائی قائدین کو ایک ساتھ مل بیٹھنے کے زرین مواقع فراہم کرتی ہے۔ جس میں ان ممالک کو ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے اور باہمی امور میں مشاورت واختلافات کی یکسوئی کے مواقع بھی فراہم ہوتے ہیں، اور یکساں مسائل ورجحانات میں ایک بین الاقوامی فورم کے طور پر علاقائی مفادات کا تحفظ کرسکتے ہیں۔ سارک کا اہم کارنامہ اس کے ممالک کے درمیان عظیم تر سماجی وتہذیبی تعلق کا فروغ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سارک ممالک مجموعی طور پر صرف 250 امریکی ڈالر کی اوسط فی کس آمدنی کے حامل غریب ممالک ہیں، جن کے یکساں سماجی،

معاشی اور انسانی مسائل ہیں۔ یہ اپنے وسائل کو مجتمع کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ سارک بحیثیت ایک علاقے کے انسانی، معدنی، زرعی، زمینی اور آبی وسائل سے مالا مال ہے۔ اگر ان وسائل کو ترقی دی جائے تو پورا علاقہ ایک خوشحال علاقہ بن سکتا ہے۔

سارک نے اس علاقے کے عوام میں بہتر تعاون اور ان کے سماجی مسائل کے حل میں شاندار کام انجام دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر سال 1989ء کو سارک سال برائے انسداد منشیات قرار دیا تھا۔ اسی طرح مالے چوٹی کانفرنس نے سال 1990ء کو سارک سال برائے لڑکی بچی (Girl Child) قرار دیا تھا۔ 1988ء کی اسلام آباد چوٹی کانفرنس میں سارک ممالک کے اراکین پارلیمنٹ اور سپریم کورٹ ججس کو ایک دوسرے کے ملک میں سفر کے لیے ویزا کی رکاوٹوں کو ختم کردیا گیا۔ سارک ممالک کے درمیان ثقافتی تبادلے کے پروگرام کے تحت ٹی وی پر ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو سارک ممالک کی دستاویزی فلمیں بتائی جاتی ہیں۔ اسی طرح صحافتی تبادلے و تعاون کے امکانات بھی روشن ہیں۔ ڈسمبر 1992ء میں سارک ممالک چار جونیر کرکٹ ٹیموں کے درمیان کرکٹ میچس بھی منعقد ہوئے ہیں۔

سارک تنظیم اپنے ممالک کے مختلف النوع سیاسی نظاموں باہمی شکوک وشبہات اور اختلافات کی وجہ سے دیگر علاقائی تنظیموں سے مختلف ہے اور اس میں ابھی تک علاقائی وحدت اور یکجہتی کی اسپرٹ کا فقدان ہے۔ اسی لیے یہ یوروپین یونین یا آسیان کی طرح کا موقف حاصل نہیں کرسکی۔ بلکہ سارک اجتماعی اقدامات اور سرگرمیوں پر باہمی تعلقات کی سطح اور مفادات کا گہرا اثر ہے۔ اسی لیے سارک کی ترقی کو اطمینان بخش نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی ترقی کی رفتار اتنی سست ہے کہ بعض مرتبہ اس کے سالانہ اجلاسوں کا انعقاد بھی مسائل سے دوچار ہوجاتا ہے اور ایک غیر یقینی کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے لیے اس کے منشور میں موزوں تبدیلی و ترمیم کی ضرورت ہے تاکہ موقتی حالات سے ہم آہنگی پیدا کی جاسکے۔ ورنہ اس کا مستقبل ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔

ناٹو North Atlantic Treaty Organization

شمالی بحیرہ اوقیانوس معاہدہ تنظیم (NATO) دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کنیڈا اور مغربی یوروپ کے ممالک کے درمیان قایم ہونے والا پہلا و اہم فوجی اتحاد تھا جو آج تک قایم ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سویت یونین کی جانب سے کمیونزم کے پھیلاؤ کے خطرات سے نمٹنے کے لیے امریکہ و مغربی یوروپ ایک فوجی معاہدہ میں شامل ہوگئے۔ یہ ایک اجتماعی سلامتی کا معاہدہ ہے۔ جس کا مقصد کسی ایک رکن ملک پر حملہ کی صورت میں اس کی اجتماعی مدد و محافظت ہے۔ مارچ 1948ء میں بروسلز میں

فرانس، برطانیہ، بلجیم، نیدر لینڈ اور لکسمبرگ' یوروپ میں کسی بھی حملے کے خلاف مشترکہ دفاع کے لیے ایک معاہدہ کیے جو بروسلز معاہدہ تنظیم کے نام سے مشہور ہوا۔ چونکہ اس معاہدہ میں امریکہ شامل نہیں تھا، اس لیے 4 اپریل 1949ء کو امریکہ و کینیڈا کو شامل کرتے ہوئے اجتماعی سلامتی کے ایک نئے معاہدہ پر دستخط کیے گئے۔ چنانچہ ابتداء میں اس میں دس یوروپی ممالک آئیس لینڈ، ناروے، برطانیہ، ڈنمارک، بلجیم، نیدر لینڈ، لکسمبرگ، پرتگال، فرانس اور اٹلی کے علاوہ دو غیر یوروپی ممالک امریکہ اور کینیڈا شامل تھے۔ بعد میں فبروری 1952ء میں یونان وترکی اور مئی 1955ء میں مغربی جرمنی اس میں شامل ہوئے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر بروسلز میں ہے۔ اس کی ایک مشترکہ دفاعی کمان ہے۔ کسی بھی ایک ملک پر حملہ تمام ممالک پر حملہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن عملی طور پر اب یہ امریکی زیر اثر تنظیم ہے۔ چنانچہ مغربی یوروپ میں سویت یونین کی توسیع پسندانہ سرگرمیوں پر اس کے ذریعہ روک لگائی گئی تھی۔ سویت یونین کے خاتمہ کے بعد مزید کئی یوروپی ممالک جیسے لتویا وغیرہ اس کی رکنیت کے خواہاں ہیں۔ اس وقت اس کے رکن ممالک کی تعداد 19 ہے۔

مئی 1955ء میں سویت یونین، پولینڈ، ہنگری، چیکوسلواکیہ، بلغاریہ، البانیہ، رومانیہ اور مشرقی جرمنی ناٹو کے جواب میں دفاع و سلامتی کے لیے پولینڈ کے شہر وارسا میں جمع ہوئے اور معاہدہ وارسا (Warsaw Pact) کی بنیاد ڈالے۔ جو سویت یونین کے زیر اثر جوابی صیانتی اتحاد تھا۔ اس طرح پورا یوروپ مغرب مشرق میں ناٹو اور وارسا معاہدہ کے خطوط پر منقسم تھا۔ 1991ء میں سویت یونین کے بکھر جانے کے بعد اس معاہدہ کو ختم کیا گیا۔

☆☆☆

حصہ چہارم
دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا کی صورت گری
World After the Second World War

باب 14

عظیم طاقتیں-دو قطبی نظام' سرد جنگ اور دیتانت
Super Powers-Bi-Polarity, Cold War and Detente

تاریخی طور پر ہر دور میں کسی نہ کسی قوم و ملک کو بڑی طاقت ہونے کا اعزاز رہا ہے۔ایک وقت تھا جب یونان اور روم کو ان کے علم ، فلسفہ ، ادب و تمدن کی وجہ سے ساری دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔پہلی جنگ عظیم سے پہلے یوروپی سیاست میں برطانیہ ،فرانس ، جرمنی ، آسٹریا ہنگری ، روس اور ترکی کو بڑی طاقتیں سمجھا جاتا تھا۔لیکن پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں آسٹریا ہنگری بکھر گیا۔ جرمنی کی تقسیم عمل میں آئی اور ترکی کے ہاتھ سے اس کی نوآبادیات نکل گئیں۔اس طرح صرف برطانیہ و فرانس ہی بڑی طاقتوں کے طور پر باقی رہے۔دوسری جنگ عظیم سے قبل جاپان کو ایشیاء کی بڑی و اہم طاقت ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان کمزور پڑ گیا اور برطانیہ و فرانس بھی اپنی طاقت کو باقی رکھ نہیں پائے۔ان دونوں کی جگہ امریکہ اور سویت یونین عالمی سیاست میں زبردست طاقت بن کر اُبھرے۔پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہی عالمی سیاست میں امریکی اثر و رسوخ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔دوسری جنگ عظیم میں امریکی طاقت نے جرمنی و جاپان کو سرنگوں ہونے پر مجبور کردیا۔اس طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کو ایک طاقتور ترین قوت کا موقف حاصل ہوگیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک غیر یوروپی طاقت کو بین الاقوامی سیاست میں فیصلہ کن طاقت کا موقف حاصل ہوا۔دوسری جنگ عظیم میں محوری طاقتوں کی شکست فاش سے اور اتحادی طاقتوں کے فوجی و معاشی طور پر کمزور پڑ جانے کے نتیجے میں یوروپ اور عالمی سیاست میں طاقت کا خلاء پیدا ہوا۔چنانچہ امریکہ اور سویت یونین اس خلاء کو پر کرتے ہوئے عالمی سیاست میں ایک برتر قوت کا موقف حاصل کرلیے۔دوسری جنگ عظیم کے آخری ایام میں یعنی 16 جولائی 1945ء کو امریکہ دنیا کے پہلے ایٹمی تجربے کے ذریعہ سے اور بالآخر 6 اور 8 اگست 1945ء کو ایٹمی اسلحہ کو جاپانی شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرا کر دنیا میں ایک برتر یا عظیم طاقت (Super Power) کا موقف حاصل کرلیا۔

دوسری طرف سابقہ سویت یونین (USSR) نظریاتی طور پر امریکہ کے مدمقابل تھا۔ اپنے کمیونسٹ نظریہ کے ذریعہ دنیا پر حکمرانی کا خواہاں تھا اور مختصر عرصہ میں وہ نہ صرف ایٹمی صلاحیت کا حامل ہوگیا بلکہ اپنے پاس ہائیڈروجن بم رکھنے کا دعویٰ بھی کیا۔سویت یونین کی توسیعپسندانہ پالیسی اور کمیونزم کے پھیلاؤ کے اقدامات سے امریکہ اور سویت یونین کے درمیان عالمی ٹکراؤ کی صورتحال پیدا ہوگئی اور ان دونوں نے دنیا کو دو طاقتور فوجی بلاکوں میں منقسم کردیا۔اس طرح دنیا میں طاقت کے دو مراکز پیدا ہوگئے۔دوسری جنگ عظیم کے فوری بعد بین الاقوامی تعلقات میں ایک دوسرے کی مخالف طاقت کے دو مراکز وجود میں آئے جسے دو قطبی نظام (Bi-Polarity) کا نام دیا گیا۔اس سے مراد دو انتہائی حدوں پر قطبین (Polars) کا وجود ہے۔سرمایہ داریت اور کمیونزم کے ساتھ امریکہ اور سویت یونین کو عالمی طاقت کی تقسیم میں دو انتہائی حدیں سمجھا گیا اور یہ فرض کرلیا گیا کہ سرمایہ داریت اور کمیونزم کے درمیان امن اور بقائے باہم ناممکن ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے آخری دور سے پروفیسر ڈبلیو۔ٹی۔فاکس (W.T.Fox) نے عظیم طاقتوں کی اصطلاح کو وضع کیا تھا۔اس کے مطابق ''عظیم طاقت وہ طاقت ہوتی ہے جس کی مسلح افواج اتنی متحرک ہوتی ہیں کہ انہیں دنیا میں حکمت عملی کے کسی کونے یا خطے میں تعینات کیا جاسکتا ہے اور یہ سب کچھ وہ اپنی طاقت و اثر پذیریٰ تاثر کیے بغیر کرسکتی ہے''۔عموماً عظیم طاقت وہ ہوتی ہے جو اپنی مسلح افواج کو دنیا کے کسی بھی کونے میں 24 گھنٹے کے اندر اندر متحرک کرسکتی ہے۔اس کے علاوہ عظیم طاقت کے پاس ہمہ اقسام کے نیوکلیر اسلحہ کا وسیع ذخیرہ ہوتا ہے۔چنانچہ امریکہ اور سویت یونین اپنی فوجی طاقت اور اثر پذیری کے لحاظ سے اس تعریف پر پورے اترتے تھے۔ان دونوں نے دنیا کے اہم حکمت عملی کے خطوں میں اپنی افواج کو اس طرح متعین کیا تھا کہ وہ مختصر نوٹس پر دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ سکتی تھیں، سمندروں میں پھیلے ہوئے ان کے بحری بیڑے اور فضائی اڈے اسی مقصد کے لیے تھے۔اس طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد بڑی طاقتوں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور اثر پذیر طاقتیں وجود میں آئیں جنہیں عظیم طاقتوں کا نام دیا گیا۔

برتر فوجی طاقت عظیم طاقتوں کی ایک اہم خصوصیت ہوتی ہے۔امریکہ اور سویت یونین دنیا کے دو بڑے فوجی اقوام تھے۔سویت یونین کے پاس پانچ ملین دنیا کی سب سے بڑی فوج

تھی اور 1991ء میں اس کے زوال تک وہ 715 نیوکلیر تجربات کر چکا تھا اور دنیا میں دوسرے نمبر پر تھا۔جب کہ امریکہ اس وقت تک 936 نیوکلیر تجربات کر چکا تھا[1]۔اب تک امریکہ کے نیوکلیر کی تعداد بڑھکر قریب ایک ہزار ہوچکی ہے۔اس کا فوجی بجٹ برائے سال 2000-1999 ، 1,036 ملین ڈالر تھا اور اس کے پاس موجود نیوکلیر اسلحہ 687 ICBM ، 464 SLBM اور Bombers کی تعداد 300 اور اس کے مسلح افواج کی تعداد 1,365,800 ہے[2]۔اس طرح دور تک وار کرنے والے نیوکلیر اسلحہ کا بھاری ذخیرہ عظیم طاقتوں کے پاس ہوتا ہے۔فرانس ، چین ، برطانیہ ، ہندوستان و پاکستان بھی نیوکلیر ممالک ہیں۔لیکن ان میں سے کسی کے پاس نیوکلیر اسلحہ کا بھاری ذخیرہ نہیں۔معاشی طاقت کے لحاظ سے بھی امریکہ معاشی طور پر طاقتور اور پہلی بڑی معیشت کا حامل ملک ہے۔عالمی تجارت میں اس کا حصہ 24 ہے۔جب کہ اس کی آبادی دنیا کی آبادی کی صرف 4% ہے۔غریب ممالک کے لیے سطح غربت سے نیچے کا معیار یومیہ ایک امریکی ڈالر ہے ،لیکن امریکہ کے لیے یہی معیار یومیہ گیارہ ڈالر ہے۔عظیم طاقت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ عالمی سیاست پر اثر پذیری کی صلاحیت رکھتی ہے۔چنانچہ امریکہ کے مفادات سارے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور دنیا میں ہونے والی کوئی بھی تبدیلی اس کے مفادات پر کاری ضرب ثابت ہوسکتی ہے۔1991ء میں عراق کو کویت سے نکال باہر کر کے اور 11 ستمبر 2001ء کو دہشت گرد حملوں کے جواب میں افغانستان میں فوجی مداخلت کر کے امریکہ یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کی اہلیت کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست میں ایک زبردست قوت ہے۔ان حالات کا جائزہ لیا جائے گا جن میں سویت یونین اور امریکہ عالمی سیاست میں عظیم طاقتیں بن کر اُبھرے۔

سویت یونین کا عروج و زوال

اکٹوبر 1917ء میں روس میں کمیونسٹ انقلاب بیسویں صدی کا ایک اہم واقعہ ہے۔انقلاب کے بعد سویت یونین کا قیام 30 ڈسمبر 1922ء کو عمل آیا۔اس وقت کی چار سوشلسٹ جمہوریتوں روس ، یوکرین ، بائیلو رشیا اور کوہ قاف کے اُس پار واقع جمہوریتوں نے یہ مملکت تشکیل دی تھی۔یہ چاروں اساسی جمہوریتیں 1917ء کے عظیم انقلاب روس کے نتیجہ میں آزاد ہوئی تھیں۔ان چاروں جمہوریتوں کے نمائندوں کا اہم اور تاریخ ساز اجلاس 30 ڈسمبر 1922ء کو

1. SIPRI Year Book 1992

2. ملٹری بیلنس 2000-2001 صفحہ 16

منعقد ہوا ، جسے سوویٹس کی پہلی کل یونین کانگریس منتخب کونسلوں کا نام دیا گیا۔اس اجلاس نے چاروں جمہوریتوں کے مساویانہ بنیادوں پر متحد ہونے اور ایک واحد مملکت کے قیام کا متفقہ فیصلہ کیا۔ولادیمیر ایلیچ لینن نے جو انقلاب روس کے رہنما اور دنیا کی پہلی سوشلسٹ مملکت کے بانی و معمار تھے خود مختار سویت جمہوریتوں کے قیام کا نظریہ پیش کیا تھا۔ازبک اور ترکمان جمہورتیں 1924ء میں قایم ہوئیں۔1929ء میں تاجکستان ، 1936ء میں قازقستان اور کرغزیہ کی جمہورتیں وجود میں آئیں۔اسی سال آزربئیجان ، جارجیا اور آرمینیا کا قیام عمل میں آیا۔یہ ساری جمہوریتیں کوہ قاف کے اس پار واقع جمہوریت کا جزو تھے جس کے خاتمہ کے بعد ساری جمہورتیں سویت یونین کی اکائیاں بن گئیں۔1940ء میں لتھوانیا ، لتویا ، استونیا بھی یونین میں شامل ہوگئے۔سویت یونین کے عملاً خاتمہ تک بھی ان تمام جمہوریتوں میں 1977ء کا دستور نافذ العمل تھا جس کے تحت ہر جمہوریت کو علیٰحدگی اختیار کرنے کی آزادی دی گئی تھی۔

سویت جمہوریتوں میں علیٰحدگی کا رجحان 1980ء کے دہے کے اواخر میں تقویت اختیار کرگیا۔تمام پندرہ جمہوریتوں کے عوام میں یہ جذبہ فروغ پانے لگا کہ انہیں زیادہ خود مختاری ملنی چاہیے۔نسلی بنیادوں پر اختلافات رونما ہونے لگے۔آذربائیجان اور اس سے متصلہ دوسرے علاقوں میں نسلی فسادات میں سینکڑوں افراد ہلاک ہوگئے۔کان کنوں کی ہڑتالیں معمول بن گئیں۔صنعتی پیداوار میں انحطاط کے ساتھ ساتھ افراط زر میں اضافہ ہوتا گیا۔اس کے علاوہ سیاسی قیادت میں تیزی سے تبدیلی رونما ہونے لگی۔1983ء میں صدر لیونڈ برزنیف کے انتقال کے بعد مسلسل دو صدور آندرے پوف اور چرننکو محض دوسالہ مدت میں انتقال کرگئے 1985ء میں جب میخائیل گورباچوف نے اس عظیم عالمی طاقت کی باگ دوڑ سنبھالی تو معاشی بدحالی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور علاقائی ونسلی رجحانات کا عام طور پر اظہار ہورہا تھا۔چنانچہ صدر گورباچوف نے معاشی و سیاسی اصلاحات کا بیڑہ اُٹھایا۔Glassnost سیاسی اصلاحات کی پالیسی کے تحت انہوں نے اب تک بندعوام کو قدرے اظہار خیال اور سیاسی سرگرمیوں کی آزادی دی تو حکومت کے خلاف عوامی ناراضگی کا لاوا اُبل پڑا۔معاشی اصلاحات کی پالیسی Prestroika یعنی آزاد منڈی معیشت کے باوجود معاشی حالت میں کوئی سدھار نہیں آیا۔پیداوار میں تباہ کن حد تک کمی ہوتی گئی اور اشیاء مایحتاج کی سربراہی کا نظام عوام کی ضرورت کی تکمیل سے قاصر ہوتا گیا۔روٹی کے لیے عوام کو گھنٹوں قطاروں میں کھڑا ہونا پڑرہا تھا۔گیاس کے تیل کی قلت نے ایسا بحران پیدا کردیا تھا کہ

دوسری جنگ عظیم کے دور کی تلخ یادیں تازہ ہورہی تھیں۔گورباچوف نے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے جو بھی اقدامات کیے بدبختی سے اس کا الٹا اثر ہورہا تھا، جس کے باعث گورباچوف ایک طرف ساری دنیا میں غیر معمولی شہرت اور مثالی وقار حاصل کررہے تھے تو دوسری طرف سویت یونین کے عوام میں مایوسی پھیل رہی تھی اور گورباچوف غیر مقبول ہوتے جارہے تھے۔آخر کار عاجز آ کر گورباچوف نے اختیارات کو غیر مرکوز کرنے سے اتفاق کرلیا۔جمہوریتوں کو معاشی امور میں زیادہ اختیارات عطا کرنے کے مقصد سے ایک معاہدہ مرتب کیا، تاکہ مرکز کے استحکام کو برقرار رکھا جاسکے۔1991ء کے آغاز کے ساتھ ہی گورباچوف کی قیادت کو چیلنج کرنے کی ایک نئی لہر کا آغاز ہوا۔بالٹک جمہوریتوں نے آزادی کے لیے اصرار شروع کردیا۔روسی فیڈریشن کے صدر بورس یلتسین نے ماسکو میں برسر عام گوربا چوف کی قیادت کے خلاف آواز اُٹھائی۔ان کی اس آواز پر عام سویت شہریوں نے لبیک کہا۔جون 1991ء میں یلتسین نے واشنگٹن کا دورہ کیا اور امریکی کانگریس کے قائدین کو بتایا کہ روس کی عوام جمہوریت کے لیے آمادہ ہیں اور سیاسی اصلاحات کے لیے کمربستہ ہیں۔اگست 1991ء میں جب صدر گورباچوف ماسکو سے دور چھٹیاں گذار رہے تھے تو سویت پولٹ بیورو کے معمر اور کٹر کمیونسٹ قائدین نے علَمِ بغاوت بلند کردیا اور اقتدار پر قابض ہوگئے۔گورباچوف نظر بند کردیئے گئے۔لیکن بغاوت منظّم کرنے والے قائدین یلتسین کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔انھوں نے عدم تشدد پر مبنی تحریک شروع کی اور بغاوت کو ناکام بنانے میں کلیدی رول انجام دیااور محض 72 گھنٹوں بعد گورباچوف کو رہا کرالیا۔کمیونسٹ پارٹی کا 74 سالہ دور انتہائی بھیانک حالات سے دوچار ہوگیا اور پارٹی کی گرفت کمزور پڑگئی۔وسط ڈسمبر 1991ء میں گورباچوف جمہوریتوں کے دولت مشترک پر مبنی برائے نام اتحاد اور جمہوریتوں کی خود مختاری کے لیے نئے نظام سے متعلق یلتسین کی تجویز پر متفق ہوئے۔اس طرح سویت یونین کے خاتمہ کی راہ ہموار ہوگئی اور یہ 31ڈسمبر 1991ء کو عملاً ختم ہوگیا۔سویت یونین کا زوال بیسویں صدی میں عالمی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سویت یونین نے ایک سرگرم توسیعت پسندانہ پالیسی کو اپناتے ہوئے مشرقی یوروپ کی چھوٹی چھوٹی مملکتوں کو اپنے اثر میں لے لیا اور وہاں پر بغاوتوں کے ذریعہ کمیونسٹ کٹھ پتلی حکومتیں قایم کیں۔چانچہ پولینڈ، ہنگری، بلغاریہ، رومانیہ، چیکوسلواکیہ،

مشرقی جرمنی اور آسٹریا وغیرہ سویت توسیعت پسندی کا شکار بنے۔ بہت جلد ہی سویت یونین منصوبہ بند ترقی کے ذریعہ معاشی وفوجی ترقی میں امریکہ کا ہم پلہ بن گیا اور 1949ء میں نیوکلیر تجربہ کرنے والا وہ دنیا کا دوسرا ملک بن گیا۔ 1954ء میں سویت صدر خرشچوف نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ سویت یونین کے پاس ہائیڈروجن بم بنانے کی صلاحیت بھی ہے اور یہ دھمکی دی کہ نیوکلیر جنگ کا مطلب سرمایہ داریت کا خاتمہ ہوگا۔ بہت جلد مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی یوروپ سویت یونین کی مٹھی میں تھا۔ اس کے جواب میں امریکہ اتحادات و معاہدات کی سیاست کو اپناتے ہوئے NATO، SEATO، اور CENTO، جیسے معاہدات کیا تا کہ مغربی یوروپ وسطی ایشیاء اور جنوب مشرقی ایشیاء کو سویت اثرات سے پاک رکھ سکیں۔ 1956ء میں صدر خرشچوف نے لینن کے اس تصور کو کہ سرمایہ دارانہ مملکتوں اور اشترا کی مملکتوں کے درمیان جنگ ناگزیر ہے ترک کرتے ہوئے اس تصور کو پیش کیا کہ سرمایہ دارنہ نظام کو پرامن طور پر بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سویت یونین نے قومی آزادی کی تحریکوں کی حمایت اور نئے ترقی پذیر ممالک کے ساتھ مکمل تعاون کی پالیسی کو اپنایا۔ اس طرح سویت یونین کا سخت گیر مخالف سرمایہ داریت موقف قدرے تبدیل ہوگیا۔ خرشچوف نے 1959ء میں پہلی مرتبہ امریکہ کا دورہ کیا ترقی پذیر ممالک سے تعاون کے اظہار کے لیے انھوں نے 1956ء میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ اسی طرح غیرکمیونسٹ ترقی پذیر ممالک کی مدد کے اظہار کے لیے 1956ء میں آسوان ڈیم کی تعمیر کے لیے مصر کی معاشی مدد کی۔ اس کے علاوہ سویت یونین اس بات کو بھی محسوس کیا کہ امریکہ کے ساتھ راست تصادم دونوں ہی کے لیے تباہ کن ہوگا۔ 1962ء میں کیوبا کے میزائل بحران کے دوران سویت یونین بحران کے حل کے لیے امریکہ سے گفت وشنید کے ذریعہ اس بحران کو حل کیا۔

1963ء میں دونوں ممالک کے درمیان راست تعلق کے لیے Hotline معاہدہ بھی طئے پایا۔

بعد کے برسوں میں امریکہ اور سویت یونین کے درمیان تناؤ وکشیدگی میں کمی آئی۔ جس کے نتیجہ میں دونوں ممالک کے درمیان اسلحہ کو کم کرنے کے لیے SALT معاہدات ہوئے لیکن 1979ء میں افغانستان میں سویت فوجی مداخلت کے نتیجے میں امریکہ اور سویت یونین کے درمیان تناؤ وکشیدگی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ 80 کے دہے میں سویت یونین داخلی مسائل سے

بھی دوچار رہا جس کی وجہ سے بالآخر 1991ء کے اختتام پر سویت یونین کا خاتمہ ہوگیا۔

مختلف ممالک میں سویت مداخلت کی تفصیل

سال	ملک	سال	ملک
1946	بلغاریہ	1969	جنوبی یمن
1947	ہنگری و پولینڈ	1975	انگولا، لاوس اور ویت نام
1948	چیکوسلواکیہ اور مشرقی جرمنی	1977	ایتھوپیا اور موزنبیق
1954	شمالی ویت نام	1978	کمپوچیا
1960	کیوبا	1979	افغانستان

ریاست ہائے متحدہ امریکہ (USA) کا عروج

عالمی سیاست میں امریکہ کی برتری کا آغاز پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ پیرس امن کانفرس 1919ء میں، امریکی صدر وڈرو ولسن کے چودہ نکات اور بعد میں مجلس اقوام کی شکل میں امریکی تدبر اور پالیسی عالمی سیاست پر حاوی تھی۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل دو جنگوں کے درمیانی وقفہ میں بھی امریکی اثر و رسوخ یوروپ میں جنگی قرضوں اور تاوان جنگ کے مسائل کے حل میں اہم ترین رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں امریکی نیوکلیر تجربات اور جاپانی شہروں پر امریکی بمباری اُسے ایک بڑی طاقت سے عظیم طاقت بنادی۔ اس طرح سویت یونین کے مقابلے میں امریکہ کا عظیم طاقت بننے کا عمل زیادہ آسان اور فوری تھا۔ برطانیہ اور فرانس کے پس منظر میں جانے سے یوروپ میں طاقت کا جو خلاء پیدا ہوا تھا اس کو امریکہ آسانی سے پر کرلیا۔ دوسری جنگ عظیم کے فوری بعد امریکہ ''کمیونزم کی مزاحمت'' (Containment of Communism) کی پالیسی کواپنایا۔ اس کا پہلا مظاہرہ امریکہ یونان اور ترکی میں کیا۔ یونان اور ترکی میں کمیونسٹ مداخلت و انقلاب کے امکانات کو روکنے کے لیے امریکی صدر Harry.S.Trueman نے ایک پالیسی کا اعلان کیا جو ٹرومن اصول یا Trueman Doctrine کے نام سے مشہور ہوئی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران یونان پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا تھا لیکن 1944ء میں جرمنی کے تخلیہ کے بعد یونان برطانیہ کے قبضہ میں چلاگیا۔ ملک میں ایک طرح کی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ یہاں کوئی 13,000 کمیونسٹ گوریلا تھے جنھیں یونان کے پڑوس کمیونسٹ ممالک یوگوسلاویہ،

بلغاریہ اور البانیہ کی تائید و مدد حاصل تھی۔ برطانیہ اس بغاوت کو نہیں کچل سکتا تھا چنانچہ وہ امریکہ سے مدد کی درخواست کیا اور وہ خود یونان سے تخلیہ کا خواہاں تھا۔ دوسری طرف ترکی میں سویت یونین کی مداخلت کے امکانات پیدا ہوگئے تھے۔ 1945ء میں سویت یونین ترکی سے مشرقی صوبے کے Kars اور Ardahan علاقوں کا مطالبہ کرنے لگا۔ اس کے علاوہ آبنائے Bosphorus میں اڈوں کا مطالبہ بھی کرنے لگا۔ Potsdam کانفرس میں سویت یونین اس مسئلہ کو اُٹھایا۔ لیکن برطانیہ اور امریکہ اس بات کے حامی تھے کہ آبنائے Bosphorus کو جہازرانی کے لیے کھلا ہونا چاہیے۔ ترکی کی حکومت امریکہ سے مدد چاہی امریکہ سویت یونین کو انتباہ دیا کہ ترکی پر حملہ کی صورت میں امریکہ اس مسئلہ کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اٹھائے گا۔ یہی وہ وقت تھا جب کہ یونان میں بھی حالات بدتر ہوگئے تھے۔ اس پس منظر میں امریکی صدر ٹرومن 12 مارچ 1947ء کو امریکی کانگریس سے رجوع ہوئے اور مشترکہ اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے 400 ملین ڈالر کی منظوری کا مطالبہ کیا تاکہ وہ اس رقم کو یونان اور ترکی کو کمیونسٹ غلبہ سے آزاد کرانے کے لیے استعمال کرسکیں۔ چنانچہ 250 ملین ڈالر یونان اور 150 ملین ڈالر ترکی میں کمیونزم کے صفائے کے لیے خرچ کیے گئے۔ ٹرومن اصول امریکہ کی خارجہ پالیسی میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ اس سے امریکی علیٰحدگی پسندی (Isolationism) کا خاتمہ ہوا اور امریکہ سیاسی، معاشی اور فوجی طور پر کمیونزم سے لڑنے والوں کی تائید اور مدد کے لیے آگے آیا۔ اس طرح امریکہ اور سویت یونین ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہوگئے۔ اس کے علاوہ اس بات کا اشارہ بھی تھا کہ امریکہ یوروپ یا عالمی سیاست میں مستقبل میں محض ایک تماشائی نہیں ہوگا۔ یہ اصول اس بات کا اعلان بھی تھا کہ امریکہ کسی بھی قیمت پر سویت یونین کے مزید پھیلاؤ کو روک کر رہے گا۔ یہ اصول اس بات کی طرف بھی اشارہ تھا کہ اب امریکہ یوروپ میں برطانیہ و فرانس کی جگہ لے رہا ہے۔

مارشل منصوبہ Marshall Plan

5 جون 1947ء کو امریکی سکریٹری آف اسٹیٹ مارشل کی مشہور ہارورڈ تقریر سے بحالیٔ یوروپ پروگرام (European Recovery Programme) کا آغاز ہوا۔ چونکہ جنگ سے تباہ حال یوروپ کو سیاسی مدد کے ساتھ ساتھ ٹھوس معاشی امداد کی بھی ضرورت تھی اس لیے امریکہ مارشل منصوبہ کی شکل میں یوروپ کی تعمیر نو کے اقدامات کا اعلان کیا۔ چونکہ یوروپ سخت معاشی

بحران سے دوچار تھا اور یہ محسوس کیا جارہا تھا کہ برطانیہ، فرانس، اٹلی و مغربی جرمنی جیسے ''آزاد ممالک'' میں کمیونزم کے جراثیم فروغ پائیں گے۔اور یہ محسوس کیا گیا کہ جب تک جنگ سے متاثرہ یوروپ میں غذا کی قلت اور معاشی بدحالی رہے گی سیاسی وسماجی بے چینی بھی بڑھتی رہے گی اور اس سے امریکہ کی قومی سلامتی کو شدید خطرہ لاحق رہے گا۔اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے امریکہ بلاتخصیص یوروپ کے تمام ممالک کے لیے معاشی امداد کا پیشکش کیا۔اس منصوبہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ خود ممالک کو اپنی طرف سے پیش قدمی کرتے ہوئے امداد کو حاصل کرنا تھا۔سویت یونین اس منصوبے کو یہ کہتے ہوئے رد کردیا کہ یہ اقوام متحدہ کے بنیادی اُصولوں کے خلاف ہے اور امریکہ یوروپ کے معاشی حالات کا استحصال کرتے ہوئے یوروپ پر اپنی معاشی حکمرانی کو قایم کرنا چاہتا ہے۔مارشل منصوبہ سے یوروپی اتحاد کی تحریک کو تقویت ملی۔مارشل منصوبہ بنیادی طور پر ایک معاشی منصوبہ تھا جس کا مقصد یوروپ میں کمیونزم کو پھیلنے سے روکنا تھا۔امداد حاصل کرنے والے مغربی یوروپ کے ممالک مین معاشی ترقی کا عمل تیز ہوا۔صنعتی ترقی ہوئی اور وہ ممالک معاشی طور پر خود مکتفی ہوئے۔اس پوری تبدیلی کا سیاسی فائدہ امریکہ کو ہوا۔ممالک امریکہ کے وفادار ہوگئے اور امریکہ یوروپی اقوام کی اٹوٹ دوستی کو حاصل کیا۔امریکہ نے کمیونزم کے بڑھتے اثرات کو روکنے کے لیے دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی فوجی معاہدات کیے اور ساری دنیا میں اپنے آپ کو آزادی و جمہوریت کے محافظ کے طور پر پیش کرتے ہوئے ایک عالمی ''پولیس'' کا رول اپنا لیا۔جو آج تک برقرار ہے۔

سرد جنگ Cold War

دوسری جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی منظر پر سرد جنگ کا گہرا اثر تھا۔دوسری جنگ عظیم کے بعد دو قطبی نظام (Bi-Polarity) کا جو نیا بین الاقوامی نظام اُبھرا اس میں امریکہ اورسویت یونین دو عظیم طاقتیں تھے۔اور یہ دو عظیم طاقتیں دنیا کو دو خیموں (Block) میں تقسیم کرلیے۔ایک ''مشرقی'' بلاک جو سویت یونین کے زیر اثر مشرقی یوروپ کے کمیونسٹ ممالک کا تھا تو دوسرا ''مغربی'' بلاک امریکہ کے زیر اثر غیر کمیونسٹ مغربی یوروپ، جاپان، کینڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ پر مشتمل تھا۔غیر کمیونسٹ بلاک کے لیے ''آزاد دنیا'' یا (Free World) کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی۔چنانچہ ان دو بلاکوں کے درمیان رقابت ورسہ کشی کو دو قطبی دنیا کا نام دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن بربریت کے خلاف امریکہ اور سویت یونین شانہ

سے شانہ ملا کر لڑے تھے۔لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران ان کی یہ دوستی عارضی ثابت ہوئی جسے پامر اور پرکنس نے "ہنی مون" دور سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ جنگ کے خاتمہ پر یہ حقیقت آشکارہ ہوئی کہ ان دونوں کے درمیان دوستی اور قربت نہ ممکن ہے چونکہ یہ دونوں دو انتہائی مخالف نظریات و تصورات کمیونزم اور سرمایہ داریت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سویت خارجہ پالیسی کا مقصد کمیونسٹ نظام کی توسیع اور استحکام تھا تو امریکہ کا مقصد سویت کمیونزم کی مخالفت اور مزاحمت تھا۔اس کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں انتہائی کشیدگی اور تناؤ پیدا ہوا جسے " سرد جنگ" کا نام دیا گیا۔ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں یہ کیفیت تقریباً چالیس سال تک جاری رہی۔جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان بھیانک نیوکلیر جنگ کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔اس طرح دونوں کے درمیان سرد تعلقات عالمی صیانت کے لیے ایک مسئلہ تھے۔

سرد جنگ کی اصطلاح کو پہلے پہل امریکی مدبّر **Bernard Baruch** نے استعمال کیا تھا۔ 16اپریل 1947ء کو جنوبی کیرولینا کی مقنّنہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ "آیئے ہم دھوکہ نہ کھائیں کہ آج ہم ایک سرد جنگ کے درمیان ہیں"۔1947ء میں اس اصطلاح کو مشہور امریکی صحافی **Walter Lippman** نے اس نام کی اپنی کتاب کے ذریعہ فروغ دیا۔**Florence Eliott** اور **Michael Summer Skill** نے **A Dictionary of Politics** میں سرد جنگ کی تعریف اس طرح کی ہے" ممالک کے درمیان تناؤ کی وہ کیفیت ہے جس میں ہر فریق اپنے آپ کو مضبوط کرنے اور دوسرے کو کمزور کرنے کی پالیسیاں اپناتا ہے اور یہ سب کچھ حقیقی جنگ سے نیچے کی سطح پر کیا جاتا ہے"۔چنانچہ سرد جنگ وہ جنگ ہوتی ہے جسے ہتھیاروں کے بغیر لڑا جاتا ہے۔یہ معاشی سیاسی اور نظریاتی مسابقت کی وہ کیفیت ہے جس میں ممالک مسلح تصادم کے بغیر دوسرے کو نقصان پہنچانے اور اپنے مفادات کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔سرد جنگ کے مختلف نام ہیں اسے اعصابی جنگ
(War of Nerves) ، پروپگنڈہ جنگ ، سفارتی جنگ اور ریڈیو جنگ بھی کہتے ہیں گویا یہ سب سرد جنگ کے طریقے ہیں۔

سرد جنگ کی ابتداء

سرد جنگ کی ابتداء کب ہوئی اس کے متعلق ماہرین میں اختلاف رائے پایا جاتا

ہے۔بعض کے نزدیک اس کی ابتداء 1917ء کے بالشویک انقلاب سے ہوئی۔ Desmond Domelly نے اپنی کتاب Struggle for the World میں کہا ہے کہ" سرد جنگ کی ابتداء انیسویں صدی میں وسطی اشیاء میں طاقت کے لیے برطانیہ اور روس کے درمیان سامراجی جدوجہد سے ہوئی۔ یہ تاریخ کا وہ عجیب دور تھا جسے تاریخ میں "عظیم کھیل" (Great Games) کے نام سے جانا جاتا ہے۔جب کہ سمرقند و بخارا 1917ء میں سرخ جھنڈے کے لہرانے سے قبل ہی باہمی شبہات کے روایتی مراکز تھے۔یہاں تک کہ Frederick L Schuman نے بھی کہا ہے کہ سرد جنگ دوسری جنگ عظیم کے بعد یالٹا اور Potsdam کانفرنسوں سے شروع نہیں ہوئی بلکہ وسیع معنوں میں اس کا آغاز 1917ء میں روس کے دوسرے انقلاب سے ہوتا ہے جب کہ روسی انقلاب کے دس ماہ کے اندر ہی سویت یونین اور مغرب ایک دوسرے کے خلاف حالت جنگ میں تھے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ 1917ء کے بالشویک انقلاب کے بعد روس یوروپ میں ایک طاقت بن گیا۔ابتداء میں مغربی طاقتیں روس میں بالشویک حکومت کوتسلیم کرنے سے انکار کیں۔دوسری جنگ عظیم سے قبل سویت یونین مغربی طاقتوں کومجلس اقوام کے چوکھٹے کے اندر یا باہر سلامتی کے نظام اور ترک اسلحہ پروگرام کے تحت مجتمع کرنے کے کئی ایک مواقع کھودیا۔سویت یونین ، جرمنی کے تئیں برطانیہ ، فرانس اور امریکہ کی خوشامدانہ پالیسی کے لیے مذمت کرتا رہا تھا۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرد جنگ کا آغاز اسی دور میں ہوا اگرچیکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران سویت یونین مغربی ممالک کے ساتھ جرمنی کے خلاف تعاون عمل دے رہا تھا۔اس کے باوجود دونوں جانب باہمی شکوک وشبہات تھے۔

سرد جنگ کی بنیادیں

1. سرد جنگ درحقیقت باہمی مخالفت کی پیداوار ہے۔باہمی عدم اعتماد اور خوف اس تصادم کی بنیادیں ہیں۔باہمی خوف اور عدم اعتماد سے دوممالک کے درمیان تناؤ اور کشیدگی بڑھتی ہے۔
2. دومخالف نظریات (کمیونزم اور سرمایہ داریت) کے درمیان آپسی تعلق اور سمجھوتہ ناممکن ہے چنانچہ ہر دو فریق اپنے اپنے نظام کو دنیا پر حاوی کرنا چاہتے تھے۔ایسی صورت میں ان دونوں کے درمیان تصادم وٹکراؤ ناگزیر ہے۔
3. عالمی امن کوسویت توسیعت پسندی سے خطرہ ہے اور امریکہ کو دنیا کے نجات دہندہ کے طور پر کام کرنا ہے اور عالمی امن کے قیام کی تمام تر ذمہ داری امریکہ پر ہے۔

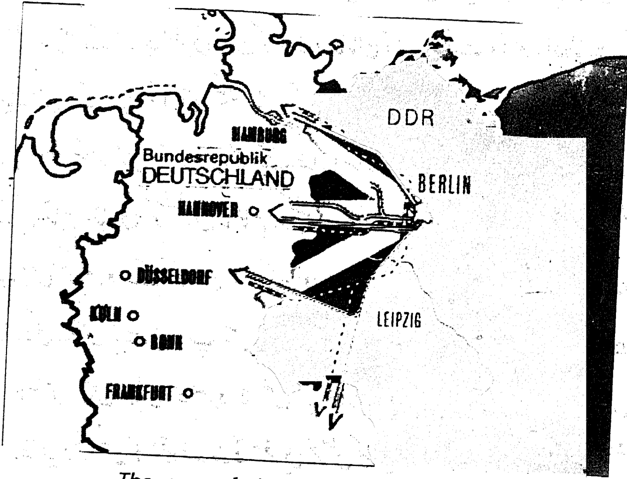
سرد جنگ کے اثرات

1. سرد جنگ سے دنیا میں خوف کی نفسیات پیدا ہوئی۔ مستقل تناؤ وکشیدگی سے اس بات کا ڈر تھا کہ ایک طاقت دوسری طاقت کو تباہ کرنے کی کوششوں میں کہیں دنیا ہی تباہ نہ ہوجائے۔ چنانچہ سرد جنگ کے چالیس برسوں کے دوران دنیا میں خوف کی نفسیات چھائی رہی۔
2. سرد جنگ کی وجہ سے بڑی طاقتوں کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک بھی اپنی سلامتی اور تحفظ کے نام پر اسلحہ کا بھاری ذخیرہ کرنے لگے۔ جس کے نتیجہ میں دنیا میں اسلحہ کی دوڑ شروع ہوگئی۔
3. سرد جنگ کی وجہ سے دنیا کی معیشت متاثر ہوئی۔ ممالک سلامتی کے نام پر اپنے معاشی وسائل کو اسلحہ کے حصول کے لیے خرچ کرنے لگے یعنی وہ اپنے قومی بجٹ کا ایک بڑا حصہ فوج اور اسلحہ کے لیے مختص کرنے لگے جس کے نتیجہ میں قومی معاشی ترقی متاثر ہوگئی۔
4. سرد جنگ سے متحدہ دنیا کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ دنیا دو مخالف کیمپوں میں منقسم تھی۔ دونوں عظیم طاقتوں نے اپنے مفادات کے لیے اقوام متحدہ کو کمزور بنادیا تھا۔ اور اقوام متحدہ ان کے مفادات کے تابع اور آلہ کار بن کر رہ گئی۔

سرد جنگ کے ادوار Phases of Cold War

پہلا دور **1946-1949** : پہلا دور باہمی شکوک وشبہات اور عدم اعتماد کا دور ہے۔ امریکہ اور مغربی اتحادیوں کو یہ شکایت تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی برسوں کے دوران سوویت یونین جرمنی کے خلاف فوری جنگ میں شامل نہیں ہوا بلکہ جرمنی کے ساتھ "ناجنگ" معاہدہ کرکے جنگ کو خاموش تماشائی کی طرح دیکھتا رہا تھا' شاید جنگ میں اتحادیوں کی شکست کو وہ کمیونزم کے فروغ کے لیے بہتر سمجھتا رہا ہو۔ دوسری طرف سویت یونین کو یہ شکایت تھی کہ جون 1942ء میں جرمنی کے سویت یونین پر حملہ کے باوجود اتحادی سویت یونین کی مدد کے لیے نہیں آئے بلکہ وہ اس حملہ کو کمیونزم کے خاتمہ کا ایک ذریعہ سمجھ کر خاموش تماشائی بنے رہے۔ دوسری طرف مغربی ممالک اس بھرم میں بھی تھے کہ اگر سویت یونین پر زبردست دباؤ ڈالا جائے تو اسکا کمیونسٹ نظام تاش کے پتوں کی طرح ڈھیر ہوجائے گا۔ اس دور میں امریکہ واحد ایٹمی طاقت کا حامل ملک تھا اور وہ سویت یونین پر دباؤ ڈال سکتا تھا۔ اس دور میں امریکہ سویت یونین پر دباؤ کے

لیے ٹرومن اصول اور مارشل منصوبہ کو اپنایا۔ دوسری طرف سویت صدر جوزف اسٹالین نے بھی فبروری 1946ء میں اپنی ایک تقریر میں ''سرمایہ دارانہ طاقتوں کے ساتھ تصادم کو ناگزیر'' قرار دیا اور سویت عوام سے جنگ کے خاتمہ کے بعد بھی تیار رہنے کے لیے کہا۔



The map of divided Germany showing the three air-corridors to the Western sector of Berlin of the Americans, British and French.

محاصرہ برلن 1948ء

برلن کا محاصرہ (ناکہ بندی) اس دور کا اہم واقعہ ہے درحقیقت دوسری جنگ عظیم کے بعد سرد جنگ کا آغاز جرمنی کے مسئلہ سے ہی ہوا تھا اور ایک عرصے تک سرد جنگ یوروپ تک ہی محدود تھی۔یالٹا اور Potsdam کانفرنسوں میں یہ طئے کیا گیا تھا کہ جرمنی پر چار طاقتوں امریکہ، سویت یونین، برطانیہ اور فرانس کا مشترکہ کنٹرول ہوگا۔اس طرح جرمنی چار مقبوضہ منطقوں میں تقسیم ہوا۔ایک Allied Control Council کے قیام سے امریکہ برطانیہ اور فرانس کے مقبوضہ علاقے یکجا ہوئے۔20جون 1948ء میں مارشل منصوبہ کے ذریعہ معاشی تعمیر نو پروگرام کے حصہ کے طور پر متحدہ مغربی سیکٹر میں کرنسی اصلاحات کو رائج کیا گیا۔سویت یونین شہر برلن کو سویت منطقہ بتاتے ہوئے اتحادیوں کو برلن سے دور رکھنا چاہتا تھا۔جواباً سویت یونین 23جون 1948ء

کو اپنے مقبوضہ علاقے میں ایک نئی کرنسی کو رائج کیا اور برلن کو بھی اس میں شامل کرلیا۔مغربی شہر کے کمانڈنٹ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے اتحادیوں کی نئی کرنسی **Deutsche Mark** کو رائج کرنے کی کوشش کی۔24 جون کو سویت افواج نے شہر برلن کی ناکہ بندی کرتے ہوئے اسے مغربی حصے سے الگ کردیا اور مغربی برلن کے لیے برقی سربراہی منقطع کردیا۔تب 25 جون 1948ء کو امریکی جنرل **Lucius D.Clay** نے فضائیہ کے ذریعہ اشیاء کی مغربی برلن کو منتقلی کا حکم دیا۔ فضائی اڑانوں کے ذریعہ مغربی برلن کو ساز و سامان آٹا، گوشت، آلو، ادویات، کوئلہ وغیرہ سربراہ کیا گیا۔اس کے لیے فرانسیسی سیکٹر میں تین ماہ کے اندر نئے ایرپورٹ تعمیر کیے گئے۔اس کے بعد سے ہر 90 سکنڈ میں اتحادیوں کا ایک طیارہ ساز و سامان لیکر اترتا تھا۔اس دوران محاصرہ کو ختم کرانے کی تمام سفارتی کوششیں ناکام ہوگئیں۔بالآخر 12 مئی 1949ء کو سویت یونین محاصرہ کو ختم کردیا۔اس محاصرہ کے دوران امریکہ اور سویت یونین کے درمیان راست ٹکراؤ کی صورتحال پیدا ہوگئی۔جس سے یوروپ میں جنگ کے خدشات بڑھ گئے تھے۔بون (Bonn) میں منعقدہ ایک کانفرس میں برلن محاصرہ کا حل یہ نکالا گیا کہ جرمنی کو دوحصوں میں تقسیم کیا گیا۔امریکہ برطانیہ وفرانس کا مقبوضہ علاقہ مغربی جرمنی کہلایا اور سویت منطقہ مشرقی جرمنی بنا۔

دوسرا دور 53-1949 : دوسرے دور میں بھی سویت یونین کے خلاف امریکہ کی پالیسی اور فوجی امداد جاری رہی۔اس دور میں امریکہ صیانتی معاہدات کے طریقوں کو اپناتے ہوئے 1951ء میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ساتھ ANZUS معاہدہ اور جاپان کے ساتھ ایک علیحدہ معاہدہ کیا۔اس دور کا اہم واقعہ 1950ء کی کوریا کی جنگ ہے۔امریکہ اور سویت یونین کے درمیان یہ ایک اہم تصادم تھا۔ڈسمبر 1945ء میں ماسکو میں منعقدہ سویت یونین، امریکہ اور برطانیہ کی وزراتی کانفرس میں یہ طئے کیا گیا تھا کہ سویت یونین کے زیر اثر شمالی کوریا اور امریکہ کے زیر اثر جنوبی کوریا کے نمائندہ پر مشتمل ایک مشترکہ کمیشن قایم کیا جائے۔جب کہ کوریا کے عوام کی اکثریت آزادی چاہتی تھی۔1946ء میں قایم شدہ امریکہ وسویت یونین کے مشترکہ کمیشن کو کامیابی نہیں ملی۔بالآخر کوریا کے مسئلہ کو اقوام متحدہ سے رجوع کیا گیا۔لیکن جون 1950ء میں شمالی کوریا اچانک جنوبی کوریا پر حملہ کردیا۔جولائی 1953ء میں جنگ بندی معاہدہ ہوا۔امریکہ کئی ملین ڈالر خرچ کرکے کمیونزم کے خلاف پروپگنڈہ شروع کیا۔1949ء میں سویت یونین کے نیوکلیر دھماکہ سے صورتحال میں تبدیلی آئی۔جنگ بندی کے باوجود کوریا میں دونوں جانب افواج

باقی رہیں۔کوریا کی جنگ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ عظیم طاقتیں پہلی مرتبہ ایک تیسرے فریق کے ذریعہ ایک دوسرے سے متصادم ہوئے۔

تیسرا دور 57-1953 : اس دور میں بھی امریکہ صیانتی معاہدات کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے SEATO اور CENTO کے معاہدات کیا۔ اس کے علاوہ امریکہ کوئی 43 ممالک کے ساتھ دفاعی معاہدات کے ذریعہ سویت یونین کے اطراف فوجی اڈے قایم کیا۔اسی دور میں امریکہ ویت نام کی جنگ میں ملوث ہوا جو سرد جنگ کا نقطہ عروج ثابت ہوئی۔سویت یونین بھی 12 ممالک کے ساتھ دفاعی معاہدہ کرتے ہوئے ناٹو کے مقابلے میں ایک مضبوط فوجی طاقت حاصل کرلیا جو معاہدہ وارسا کے نام سے جانا جاتا ہے۔امریکہ اور سویت یونین دونوں ہی اس دور میں ہائیڈروجن بم کا تجربہ کیے۔اس کے باوجود اس دور میں دونوں ممالک کے درمیان دوستی کے فروغ کا مثبت رجحان بھی دیکھنے میں آیا۔چنانچہ 1955ء میں امریکی وسویت صدر کی جنیوا میں چوٹی ملاقات ہوئی۔جس سے تناؤ میں قدرے کمی آئی۔دونوں کے درمیان دوستی کے اس رجحان کو دیتانت Detente کا نام دیا گیا۔

چوتھا دور 62-1957 : یہ دور متضاد رجحانات کو پیش کرتا ہے۔مذکورہ بالا جنیوا چوٹی ملاقات سے ایک طرف تناؤ میں کمی آ کر دوستی پروان چڑھنے لگی تو دوسری طرف اس دور کے آخر میں کیوبا کا میزائلی بحران جیسا شدید تناؤ پیدا ہوا۔ابتداء میں دونوں ممالک کے درمیان کچھ تہذیبی و سیاسی وفود کے تبادلے ہوئے حتی کہ 1960ء میں صدر کینڈی اور خرشچوف کے درمیان پیرس میں چوٹی ملاقات متوقع تھی لیکن U-2 واقعہ سے اسے منسوخ کردینا پڑا اور پھر ایک مرتبہ دونوں کے تعلقات میں کشیدگی میں اضافہ ہوا۔لیکن کیوبا کا میزائلی بحران اس دور کا اہم ترین واقعہ تھا۔

امریکی سرحدات سے قریب کیوبا میں 1960ء میں کمیونسٹ انقلاب آیا اور جنرل فیڈل کاسٹرو کی حکومت قایم ہوگئی۔1962ء میں اس اطلاع پر کہ کیوبا میں سویت میزائل کی تنصیب عمل میں آئی ہے امریکی صدر کینڈی نے کیوبا کے بحری محاصرہ کا حکم دیا۔اس کے جواب میں سویت یونین کے نیوکلیر اسلحہ سے لیس جہاز کیوبا کی طرف روانہ ہوئے اور اس بات کا امکان تھا کہ امریکہ وسویت یونین کے درمیان سمندر میں مسلح تصادم ہو۔ اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے امریکی صدر کینڈی نے سویت صدر خرشچوف سے راست ٹیلفونی رابطہ قایم کرتے ہوئے مسئلہ کے پرامن حل کی خواہش کی۔چنانچہ سویت جہاز واپس ہوئے کیوباء کا امریکی محاصرہ ختم ہوا اور

سویت یونین کیوبا سے میزائل کو ہٹا لینے کے لیے رضا مند ہوا۔

پانچواں دور 1962-1969 : اس دور میں امریکہ و سویت یونین کے درمیان نیوکلیر اسلحہ پر مصالحت کا رجحان پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں دونوں ممالک نے ترک اسلحہ سے متعلق اقوام متحدہ کے اقدامات کو مشترکہ طور پر آگے بڑھایا۔ چنانچہ 1963ء میں PTBT، Hot Line Agreement اور 1969ء میں NPT پر دستخط کیے۔ اس دور میں سویت یونین کے صدر خرشچوف اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے ترک اسلحہ کی وکالت کی۔ اس طرح یہ دور دونوں ممالک کے درمیان خوشگوار ثابت ہوا۔

چھٹا دور 1969-1978 : اس دور کو دیتانت کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں تصادم کی جگہ خوشگوار تعاون دونوں ممالک میں پروان چڑھا۔ اس دور کی سب سے بڑی کامیابی دونوں ممالک کے درمیان حکمت عملی کے ہتھیاروں کو کم کرنے کے لیے 1972 کے SALT اور ABM معاہدات تھے۔ فبروری 1972ء میں امریکی صدر نکسن ماسکو کا دورہ کیے اس کے جواب میں 1973ء میں سویت صدر برزنیف امریکہ کا دورہ کیے۔ اس طرح 1970ء کا دہا ''بات چیت'' کا دہا ثابت ہوا۔ 1974ء میں امریکہ مشرقی جرمنی کو تسلیم کرلیا۔ اسی سال امریکہ و سویت یونین کے درمیان تجارت تعاون و تبادلے کے لیے ایک مشترکہ کمیشن کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ 1975ء میں امریکہ کینڈا اور 25 یوروپی اقوام کے درمیان یوروپ کی سیکوریٹی اور تعاون کے لیے ہلسنکی معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ اس پر دستخط کرنے والے یوروپی ممالک میں سویت یونین بھی شامل تھا۔

ساتواں دور 1979 کے بعد سے : اگر چیکہ 1977ء میں امریکہ اور سویت یونین سالٹ II معاہدہ پر دستخط کیے' اس کے باوجود دونوں کے درمیان تناؤ کے نئے مسائل سامنے آنے لگے۔ امریکہ سویت یونین پر ہلسنکی معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انسانی حقوق کی پامالی کا الزام لگایا۔ جب کہ سویت یونین امریکہ و مغرب پر مشرقی یوروپ کے داخلی معاملات میں مداخلت کا الزام لگایا۔ اس طرح 1979ء تک دیتانت کا عمل ختم ہوا اور ایک نئی سرد جنگ کا آغاز ہوا۔

نئی سرد جنگ New Cold War

امریکہ اور سویت یونین کے درمیان تعلقات میں 1960ء کے دہے کے وسط سے پیدا ہونے والی گرمجوشی 1970ء کے بعد کے دہے کے اواخر میں رفو ہونے لگی۔ چنانچہ ڈسمبر 1979ء میں افغانستان میں سویت افواج کی مداخلت سے دونوں ممالک کے درمیان سرد جنگ کے ایک

نئے دور کا آغاز ہوا جسے نئی سرد جنگ کا نام دیا گیا۔Zbigniew Brezezinski امریکی نیشنل سیکوریٹی مشیر نے اپنی کتاب Power and Principle میں کہا ہے کہ 1978ء سے امریکہ سویت تعلقات میں بگاڑ شروع ہوا۔1975ء میں جنوبی ویتنام میں کمیونسٹوں کی جیت ہوئی۔انگولا میں موافق سویت عناصر اقتدار میں آگے اور بالآخر ڈسمبر 1979ء میں سویت یونین کی فوجی مداخلت ہوئی اور موافق سویت کٹھ پتلی حکومت کابل پر اقتدار میں آگئی۔یہ سب باتیں نئی سرد جنگ کے آغاز کے لیے کافی تھیں۔لیکن دوسری طرف سویت یونین نئی سرد جنگ کی شروعات کے لیے امریکہ کو ذمہ دار ٹہراتا ہے۔ڈیموکریٹک صدر جمی کارٹر کے اقتدار میں آنے سے اور برزنسکی کے قومی سلامتی مشیر مقرر ہونے سے حالات میں تبدیلی آئی۔چونکہ برزنسکی نے ڈاکٹر ہنری کیسنجر (سابق سکریٹری آف اسٹیٹ) کے اس نکتہ نظر سے اختلاف کیا تھا کہ دیتانت کا متبادل صرف جنگ ہی ہے۔ بلکہ برزنسکی نے صدر نکسن اور ہنری کیسنجر پر دیتانت پر بہت زیادہ انحصار کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ دیتانت کے لیے دوطرفہ رویہ کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ سویت یونین کا رویہ بالکلیہ طور پر غیرذمہ دارنہ ہے۔انگولہ، مشرقِ وسطیٰ اور اقوام متحدہ اور افغانستان میں سویت یونین جو کچھ کیا تھا وہ دیتانت کے مغائیر اور دوستی کے لیے غیرذمہ دارانہ تھا۔برزنسکی کو چین۔امریکہ تعلقات میں زیادہ دلچسپی تھی۔اس کی وجہ سے سویت یونین زبردست ردعمل کے لیے مجبور تھا۔اس طرح نئی سرد جنگ کے لیے ریکہ ہی ذمہ دار تھا۔

نئی سرد جنگ کا ارتقاء

امریکہ سویت یونین کے تیئں دیتانت کی پالیسی اپنایا اور سالٹ معاہدہ کیا۔اسے اس معاہدہ کی ضرورت تھی چونکہ اسے ویت نام میں نقصان اٹھانا پڑا تھا۔دوسری طرف وہ ہتھیاروں کے معاملے میں جوں کی توں حالت برقرار رکھنا چاہتا تھا ورنہ اندیشہ تھا کہ کہیں سویت یونین اسلحہ میں برتری حاصل نہ کرلے۔بہت سی باتیں امریکہ کے حق میں تھیں، جیسے سویت یونین اور چین کے درمیان کشیدگی، مصر کی سویت یونین سے دوری اور امریکہ کی طرف جھکاؤ، سعودی عرب اور ایران کا امریکی اثر میں آجانا۔نیوکلیر اسلحہ میں امریکہ کی تکنیکی برتری وغیرہ سے امریکہ جوں کی توں حالت (Statusquo) برقرار رکھنا چاہتا تھا۔لیکن 1970ء کے دہے کے وسط سے حالات میں تیزی سے تبدیلی آنی شروع ہوئی اور سویت یونین کا موقف مضبوط ہونے لگا۔خصوصاً فبروری 1979ء میں ایران میں اسلامی نقلاب سے امریکی اثرات کو بڑا دھکا لگا اور صدر جمی کارٹر امریکی

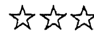
وقار کی بحالی کے اقدامات کی کوشش کرنے لگے۔لیکن ڈسمبر 1979ء میں افغانستان میں سویت یونین کی مداخلت سے امریکی وقار کو مزید دھکا لگا۔صدر کارٹر ایک طرف امریکی وقار کی بحالی کے لیے Rapid Deployment Force تشکیل دی تو دوسری طرف 1979ء میں ناٹو نے 1983ء سے مغربی یوروپ میں درمیانی فاصلے تک وار کرنے والے Pershing II میزائل کی تنصیب کا فیصلہ کرلیا۔ ناٹو کے مطابق مشرقی یوروپ کی سرحدات پر سویت یونین کے SS-20 میزائل کی تنصیب سے یوروپ کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ان تمام حالات کی وجہ سے امریکہ اور سویت یونین کے درمیان کشیدگی اس حدتک بڑھ گی تھی کہ دنیا کے بیشتر ممالک بشمول ہندوستان کو عظیم طاقتوں سے امن کی اپیلیں کرنی پڑیں۔

امریکہ سویت یونین تعلقات میں اب دو باتیں اہمیت اختیار کرگئیں تھیں' ایک تو افغانستان سے سویت افواج کی واپسی اور دوسرے یوروپ سے اسلحہ کو ہٹالینا۔اس تناؤ کے حالات میں 1985ء میں سات سال کے وقفہ کے بعد جنیوا میں امریکی صدر ریگن اور سویت صدر میخائیل گورباچوف کے درمیان پہلی چوٹی ملاقات ہوئی۔لیکن اس کانفرس میں کوئی خاص پیشرفت نہیں ہوئی۔سوائے اس کے کہ دونوں قائدین نے آئندہ سال 1986ء میں ریکجاوک (آئس لینڈ)میں دوبارہ ملاقات سے اتفاق کیا اورایک سطری اعلان نامہ جاری کرتے ہوئے کہاکہ ''چونکہ نیوکلیر جنگ جیتی نہیں جاسکتی اس لیے لڑنا بیکار ہے''۔اس اعلان نامہ سے دنیا نے سکون وچین کی سانس لی۔ 1986ء میں ریکجاوک چوٹی ملاقات کے نتیجہ میں جنیوا اور روم میں مسئلہٗ افغانستان' یوروپ میں ترک اسلحہ پر علیحدہ علیحدہ بات چیت کا آغاز ہوا۔ بالآخر مارچ 1988ء سے افغانستان سے سویت یونین کی افواج واپس ہونا شروع ہوئیں اور یوروپ سے اسلحہ کو ہٹانے کے لیے ڈسمبر 1987ء کو INF معاہدہ پر دستخط کیے گئے۔دوسری طرف سویت یونین کے داخلی سیاسی حالات دگر گوں ہوگئے اور بالآخر 31ڈسمبر 1991ءکوسویت یونین جیسی عظیم طاقت صفحہ ہستی سے معدوم ہوگئی۔یکم جنوری 1992ء کو امریکی صدر جارج بش سینیر (موجودہ صدر کے والد) نے امریکی عوام کو ریڈیو سے خطاب کرتے ہوئے بالآخر چالیس سالہ سرد جنگ کے جیت لینے کا مژدہ سنایا۔

دیتانت Detente

یہ سرد جنگ کا مخالف تصور ہے دیتانت ایک فرانسیسی لفظ ہے جس کے معنی تناؤ اور کشیدگی

کے تعلقات میں کمی کے ہیں۔دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکہ اور سویت یونین کے درمیان تعلقات میں بڑھتی کشیدگی وتناؤ کو سرد جنگ کا نام دیا گیا تھا۔لیکن 1960ء کے دہے کے اواخر سے امریکہ اور سویت یونین اور امریکہ و چین کے درمیان تعلقات میں بہتری پیدا ہونے لگی تو ماہرین نے اسے ''امن کے عمل'' سے تعبیر کرتے ہوئے دیتانت کا نام دیا۔دیتانت گویا مرکزی توازن طاقت میں شعوری طور پر تناؤ کو کم کرنے کا نام ہے۔لیکن چینی اس لفظ کا اطلاق اپنے اوپر کرنے سے انکار کرتے ہیں۔وہ اسے امریکہ وسویت یونین تعلقات کے لیے ہی بہتر سمجھتے ہیں۔اس طرح دیتانت سے مراد دونوں عظیم طاقتوں کی جانب سے اچھے تعلقات ،سوجھ بوجھ اور تعاون کو فروغ دینے کی کوشش ہے جس سے رفتہ رفتہ سرد جنگ کے تصادم کی شدت میں کمی ہوگی۔بقائے باہم اور آپسی سوجھ بوجھ اس کے اہم اجزاء ہیں۔چنانچہ 1962ء میں کیوبا کے میزائلی بحران کے بعد سے امریکہ اور سویت یونین کے درمیان باہمی سوجھ بوجھ میں اضافہ ہوا۔دراصل باہمی تباہی کے یقین **Mutual Asrured Destruction (MAD)** نے دونوں عظیم طاقتوں کو اس بات کے لیے مجبور کیا کہ اپنے بھاری نیوکلیر اسلحہ کے ساتھ اگروہ متصادم ہوں تو پھر دونوں ہی کی تباہی یقینی ہے۔کیوبا کے بحران سے یہ احساس پختہ ہوگیا جس کے نتیجہ میں 1963ء میں دونوں ملکوں کے درمیان **Hotline Agreement** ہوا۔اس کے بعد **PTBT** اور **NPT** کے علاوہ حکمت عملی کے ہتھیاروں کو دوطرفہ طور پر کمی کرنے کے لیے دونوں ملکوں کے درمیان سالٹ **SALT** معاہدہ پر دستخط بھی ہوئے اور دنیا نے سکون کا سانس لیا۔دیتانت بجائے خود امن نہیں ہے بلکہ یہ امن کی طرف پیشقدمی یا ایک عمل کا نام ہے اور یہ مستقل عمل ہے۔دیتانت کا عمل امن کی ضمانت ہے۔سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد دیتانت کا تصور بھی اپنی افادیت کھودیا ہے۔



باب 15

نوآبادیت کا خاتمہ۔ تیسری دنیا اور جدید نوآبادیت
The End of Colonialism-Third World and Neo-Colonialism

پندرہویں صدی سے جدید سامراجیت و نوآبادیت کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب کہ یوروپی طاقتیں جیسے برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، پرتگال اور اسپین وغیرہ ایشیاء آفریقہ و لاطینی امریکہ کے غریب و پسماندہ ممالک پر قبضہ جماتے ہوئے عظیم سلطنتیں کھڑی کی تھیں۔اٹھارویں صدی کے اختتام پر ہی برطانیہ کی 13 امریکی نوآبادیات آزاد ہوکر ایک نئی عظیم مملکت ریاستہائے متحدہ امریکہ کی بنیاد ڈالیں۔انیسویں صدی میں جنوبی امریکہ میں اسپین کی کئی نوآبادیات آزاد ہوگئیں۔اس طرح کینڈا، آسٹریلیاء اور نیوزی لینڈ بھی برطانوی غلامی سے آزادی حاصل کرلیے۔لیکن حقیقی معنوں میں ایشیاء، افریقہ و لاطینی امریکہ میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کا آغاز بیسویں صدی کے وسط سے خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ہوا۔ایشیاء، آفریقہ ولاطینی امریکہ کی آزادی سے بین الاقوامی تعلقات میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔چنانچہ کئی ایک سیاسی اور معاشی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔تیسری دنیا کی ابتداء غیرجانبدار تحریک کا قیام، علاقائی تصادم جدید نوآبادیت اور علاقائی تنظیموں وغیرہ کی ابتداء ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکی صدر وڈرو ولسن کے اصول خود اختیاری کی وجہ سے یوروپ میں چھ نئی مملکتیں چیکوسلواکیہ، رومانیہ، یوگوسلاویہ، پولینڈ، آسٹریا اور ہنگری پیدا ہوئیں۔مجلس اقوام کے انتدابی نظام (Mandatory System) کے نتیجہ میں سلطنت ترکی کی بیشتر نوآبادیات آزاد ہوئیں۔لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیاتی نظام تیزی سے بکھرنے لگا اور ایشیاء، آفریقہ و لاطینی امریکی نوآبادیات آزاد ہونے لگیں۔اگرچیکہ ان ممالک میں آزادی کی تحریکات پہلے سے ہی جاری تھیں لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد کے نئے عالمی ماحول نے نوآبادیاتی طاقتوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی نوآبادیات کو آزاد کردیں۔بعض نوآبادیات جیسے ہندوستان پرامن تحریک کے ذریعہ آزاد ہوئے تو بعض نوآبادیات جیسے الجیریا، نائجیریا اور دیگر آفریقی علاقوں میں آزادی کے لیے بھاری انسانی جانوں کی قربانیاں دینی پڑیں۔نوآبادیت کی

آخری نشانی رہوڈیشیا جو آج زمبابوے کہلاتا ہے 1980ء میں آزاد ہوا۔ چنانچہ 1919ء میں دنیا کا 77.2% رقبہ نوآبادیاتی قبضہ میں تھا جس میں دنیا کی 69.2% آبادی تھی۔ جب کہ 1970ء میں صرف رقبہ نوآبادیاتی قبضہ میں تھا جس میں دنیا کی صرف ایک تا دو فیصد آبادی تھی۔

نوآبادیت کے خاتمہ کی وجوہات

1. نوآبادیاتی طاقتوں کی باہمی مخاصمت

پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے پہلے نوآبادیاتی طاقتیں جیسے برطانیہ، فرانس، پرتگال، اسپین، بلجیم، ہالینڈ وغیرہ ایک دوسرے کی نوآبادیات میں حکمران ملک کو کمزور کرنے کے اقدامات کیے اور ایک دوسرے کی نوآبادیات میں قومی تحریکات کو ہوا دیے۔ مثلاً 1870ء کی Franco Prussian جنگ بڑھتی صنعتی طاقت اور قومی جذبات اور نوآبادیاتی طاقتوں میں بڑھتی معاشی رقابت اور مخاصمت کا اظہار تھی۔ 1871ء میں فرانسیسی علاقہ السک لورین پر جرمنی کے قبضہ سے 1914ء میں پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک دونوں ممالک کے درمیان تعلقات انتہائی کشیدہ تھے۔ اسی طرح جرمنی اور جاپان برطانیہ کو نقصان پہنچانے کے لیے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں برطانیہ کے خلاف جاری تحریکِ آزادی کی حمایت کیے۔

2. مغربی تہذیب کے اثرات

مغربی فلسفہ، تمدن، تہذیب، ادب اور تعلیم سے نوآبادیاتی عوام میں جمہوریت، آزادی مساوات و بھائی چارگی کے جذبات اجاگر ہوئے۔ روساء و امراء کے بچے اعلیٰ تعلیم کے لیے مغربی جامعات کا رخ کرنے لگے تو وہ یوروپ کی تہذیب و قدروں سے متاثر ہوئے اور واپس آکر اپنے ملک میں بھی اس کی تبلیغ کرنے لگے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ نوآبادیاتی حاکموں سے اپنے حقوق و آزادیوں کا بھی مطالبہ کرنے لگے۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم نے سیاسی اور سماجی شعور میں اضافہ کیا اور انگریزی فلسفہ عوامی بیداری میں اضافہ کا باعث بنا۔ ہندوستان میں کانگریس پارٹی کی تشکیل اور جدوجہد آزادی کے ابتدائی رہنما اس کی مثال ہیں۔

3. قوم پرستی اور اصول خود اختیاری

دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہی مختلف نوآبادیات میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہوچکا تھا اور لوگ اپنی قومی شناخت پر فخر محسوس کرنے لگے تھے۔ چنانچہ قوم کی خود اختیاری کے لیے مختلف

نوآبادیات میں فوجی تنظیمیں قایم ہوچکی تھیں جو قومی تحریکات کا باعث بنی جس کے نتیجہ میں ان نوآبادیات کو آزادی ملی۔ جب کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہی صدر ولسن کے 14 نکات سے قوموں کی خود اختیاری کے اصول کو اہمیت حاصل ہوگئی۔ قوموں کی خود اختیاری کا مطلب یہ تھا کہ ہر قوم کو خود اپنے آپ پر حکومت کرنے کا حق ہو اور وہ بیرون حکومت یا اثرات سے آزاد ہو۔ اپنی پسند کی حکومت کے انتخاب کا حق خود اختیاری کا ایک حصہ تھا۔جس کی وجہ سے نوآبادیوں میں آزادی کا مطالبہ جڑ پکڑنے لگا۔

4. عوامی مسائل

نوآبادیوں میں عوامی مشکلات جیسے استحصال ،غربت ، بھوک و فاقہ کشی ، ناخواندگی اور پسماندگی وغیرہ میں اضافہ ہوتا گیا۔چنانچہ ان تمام مسائل سے چھٹکارا پانے کا واحد طریقہ صرف آزادی تھی۔اس کے علاوہ حکمرانوں کی ظلم و زیادتی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔جس کی وجہ سے عوام مجموعی طور پر حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت کے لیے مجبور ہوئے۔جس کے نتیجہ میں آزادی کی تحریکات کو تقویت ملی اور وہ آزاد ہوگئے۔

5. نوآبادیاتی طاقتوں کا زوال

پہلی اور دوسری عالمی جنگوں سے نوآبادیاتی طاقتیں کمزور ہوگئیں پہلی جنگ عظیم کے بعد اٹلی اور جرمنی کی نوآبادیات ختم ہوگئیں اور دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس سیاسی و معاشی طور پر کمزور پڑگئے جس سے وہ اپنی نوآبادیات پر قابو رکھنے کے قابل نہیں رہے۔اور نوآبادیاتی عوام میں ان کا سابقہ وقار مجروح ہوا۔اس کے علاوہ اب نوآبادیاتی طاقتوں کے لیے نوآبادیات پر حکمرانی کا کوئی نظریاتی جواز نہیں تھا۔گورے آدمی کا بوجھ کا تصور اپنی اثر پذیری کھو چکا تھا۔اورنوآبادیاتی حکمرانی تاریخ کے اپنے دور کو مکمل کرچکی تھی۔یہی وجہ تھی کہ برطانیہ' فرانس اور دیگر یوروپی اقوام کی نوآبادیات یکے بعد دیگرے تیزی سے آزاد ہونے لگیں۔

6. امریکہ کا دباؤ

ولسن کے چودہ نکات نے عوام کے حق خود ارادیت کے اصول کو قایم کردیا تھا جو بعد میں امریکی پالیسی کا ایک مستقل جزو بن گیا۔دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ ایک عظیم طاقت بن کر ابھرا۔نوآبادیاتی طاقتیں چونکہ پہلے ہی کمزور ہوچکی تھیں اس لیے امریکہ نوآبادیات کو آزاد

کرنے کے لیے ان پر دباؤ ڈالنے لگا۔چنانچہ منشور بحرہ اوقیانوس جس پر امریکہ و برطانیہ نے دستخط کیے تھے میں قوموں کی خود اختیاری پر زور دیا گیا تھا۔جس کی رو سے برطانیہ جنگ کے بعد نوآبادیات کو آزاد کرنے کے لیے مجبور تھا۔

7. کمیونزم کا فروغ

کمیونزم کے فروغ سے اکثر نوآبادیات میں آزادی کی تحریکات کمیونسٹ زیر اثر تحرکات میں تبدیل ہوگئیں۔کمیونزم چونکہ سرمایہ داریت اور سامراجیت کا مخالف ہے اس لیے کمیونسٹ فلسفہ آزادی کی قومی تحریکات کے لیے وِجدان کا باعث بنا۔اس کے علاوہ آزادی کی تحریکات کو کمیونسٹ سویت یونین کی اخلاقی مادی و سیاسی تائید وحمایت حاصل تھی۔

8. اقوام متحدہ کا رول

اقوام متحدہ نے نوآبادیات کے خاتمہ میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔اقوام متحدہ کے تصوراتی نظریات ، اصول اور منشور نوآبادیاتی عوام کے لیے آزادی کا پیغام لائے۔نوآزاد قومیں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں قوموں کی آزادی کے لیے آواز اٹھانے اور جدو جہد کرنے لگے جس کی وجہ سے نوآبادی طاقتوں پر اخلاقی دباؤ میں اضافہ ہوا۔اس کے علاوہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قوموں کی آزادی کے لیے کئی قراردادیں منظور کیں۔بالآخر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں نوآزاد ایشیائی ، آفریقی و لاطینی امریکی ممالک کی اکثریت ہوگئی۔

نوآبادیت کے خاتمہ سے بین الاقوامی سماج میں وسعت ہوئی۔دوسری جنگ عظیم تک بین الاقوامی تعلقات صرف یوروپ تک ہی محدود تھے۔لیکن ایشیاء آفریقہ و لاطینی امریکہ کی آزادی کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات حقیقی معنوں میں بین الاقوامی نوعیت اور وسعت اختیار کرگئے۔چنانچہ آج بڑھتے بڑھتے اقوام متحدہ کے اراکین کی تعداد 189 ہوچکی ہے۔جب کہ اس کے قیام کے وقت اراکین کی تعداد صرف 51 تھی۔ایشیاء وآفریقہ کی آزادی کی وجہ سے سامراجیت اور نسل پرستی (Racialism) کو سخت دھکا لگا۔آزاد ممالک نوآبادیات کی آزادی کے لیے اقوام متحدہ کے اندر اور باہر جدوجہد کرنے لگے۔جس کے نتیجہ میں دنیا سے سامراجیت اور نسل پرستی کا خاتمہ ہوگیا۔لیکن نوآزاد مملکتوں کا استحصال عظیم اور بڑی طاقتیں کرنے لگیں اور ان پر اثرانداز ہونے کے لیے عظیم طاقتیں سیاسی ،معاشی ، سفارتی کے ساتھ ساتھ فوجی طریقے

اپنانے لگیں۔ بالآخر یہ ممالک دو عظیم طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوگئے جس سے دو قطبی نظام کو تقویت ملی۔ جس کہ نتیجہ میں سرد جنگ دنیا کے ہر کونے میں پہنچ گئی۔ سرد جنگ اور عظیم طاقتوں کے شکنجے سے آزاد رہنے کے لیے ایشیاء، آفریقہ و لاطینی امریکہ کے ممالک غیر جانبدار تحریک کی شکل میں ایک تیسری طاقت بن کر ابھرے۔ چنانچہ 1960ء سے 1990ء تک غیر جانبدار تحریک ایشیاء، آفریقہ و لاطینی امریکہ کے کمزور ممالک کی ایک طاقت تھی۔ نو آزاد ممالک اپنی معاشی پستی اور روایتی سماجوں کی وجہ سے تیسری دنیا کہلائے۔ ان کے اپنے مسائل تھے۔ یہ استحصال کا شکار غلامی کا ورثہ رکھنے والے نو آزاد ممالک کی دنیا تھی۔

تیسری دنیا Third World

بین الاقوامی تعلقات میں تیسری دنیا کی اصطلاح گذشتہ صدی کے وسط کی ایجاد ہے۔ جب کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا دو متحارب اور مخالف امریکی و سویت خیموں میں منقسم تھی جو دو مختلف و مخالف نظریات کی نمائندگی کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب نو آبادیاتی نظام کے تانے بانے ٹوٹنے لگے تو ایشیاء، آفریقہ، و لاطینی امریکہ کے مظلوم عوام تیزی سے حق خودارادیت کے جذبے کے تحت آزاد اور مقتدر اکائیاں بن کر بین الاقوامی افق پر نمودار ہونے لگے۔ جس سے بین الاقوامی پردہ سیاست پر نہ صرف قومی اداکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ یہ نو آزاد ممالک اپنی اجتماعیت کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

اس پس منظر میں تیسری دنیا کا لفظ سب سے پہلے ایک الجیریائی مصنف Frantz Fanon نے اپنی تصنیف The Wretched of the Earth (دنیا کی بدنصیبی) میں استعمال کیا تھا۔ اس نے نظریاتی بنیادوں پر امریکی سرمایہ دارنہ نظام پر مشتمل پہلی دنیا اور روسی اشتراکیت کی حامل دوسری دنیا کے درمیان جدید نو آبادیات، اور تمام قسم کی سامراجیت کے خلاف جدوجہد کرنے والے اور مشترکہ نو آبادیاتی ورثہ کی حامل نو آزاد قومی مملکتوں کو تیسری دنیا قرار دیا تھا۔ یہ ممالک پہلی دو دنیا کے مقابلے میں کسی مبسوط نظریہ حیات کی نمائندگی نہیں کرتے تھے بلکہ یہ تضادات کے حامل ممالک ہیں جو مشترکہ طور پر نو آبادیاتی ورثہ رکھتے ہیں۔

عالمی معاشی تقسیم کو بنیاد بناتے ہوئے Irving Horowitz نے اپنی تصنیف Three World of Development میں تیسری دنیا کو ترقی کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ چنانچہ اس

کے مطابق پہلی دنیا مسابقتی سرمایہ دارانہ خصوصیات کے ساتھ مغربی یوروپ امریکہ کینڈا اور جاپان پر مشتمل ہے تو دوسری دنیا مشرقی یوروپ کے سویت بلاک پر مشتمل تھی جس میں سویت و چینی نمونوں کے اشتراکی نظام شامل تھے۔تیسری دنیا نوآبادیاتی ماضی سے ابھرنے والے ان ممالک پر مشتمل ہے جو ترقی کے لیے اپنا ایک جداگانہ طریقہ اپنائے ہیں اور جنھیں ترقی کے لیے یکساں و مشترکہ مسائل کا سامنا ہے۔اس طرح براعظم آفریقہ، ایشیاء ولاطینی امریکہ کے نوآزاد معاشی طور پر پسماندہ و کمزور ممالک کو تیسری دنیا کہا گیا۔تیسری دنیا کے ان ممالک کے لیے عالمی بینک نے اپنی ایک رپورٹ میں فی کس آمدنی کے اعتبار سے ممالک کے درمیان خط امتیاز کھینچ کر اس کو معاشی معنی عطا کیے۔چنانچہ پانچ سو امریکی ڈالر یا اس سے زائد فی کس آمدنی والے ممالک ترقی یافتہ اور اس سے کم فی کس آمدنی والے ممالک کو غیر ترقی یافتہ یا پھر بتدریج ترقی کی طرف مائل غریب ممالک کو تیسری دنیا قرار دیا گیا تھا۔

چین کے انقلابی رہنما ماوزے تنگ (Mao-Tse-Tung) نے تیسری دنیا کی اصطلاح کو ایک نئے زاویے سے پیش کیا تھا۔چونکہ ماوزے تنگ سویت یونین کو ایک اشتراکی ملک نہیں بلکہ وہ چینی اشتراکیت کو ہی حقیقی اشتراکیت سمجھتے تھے، اس لیے ان کے نزدیک امریکہ اور سویت یونین دو بڑے سامراجی ملک تھے اور وہ ان کو پہلی دنیا کے ممالک سمجھتے تھے۔وہ برطانیہ اور فرانس کو دوسرے درجے کے سامراجی اور دوسری دنیا، اشتراکی ممالک بشمول چین، ایشیاء، آفریقہ و لاطینی امریکہ کے کچلے ہوئے مظلوم ممالک کو تیسری دنیا قرار دیا تھا۔دنیا کی 75% آبادی تیسری دنیا پر مشتمل ہے۔لیکن دنیا کی صرف 20% اشیاء اور خدمات ہی پیدا کرتی ہے۔تیسری دنیا کی سالانہ فی کس آمدنی 2000 ڈالر سے بھی کم ہے۔اس طرح تیسری دنیا غریب، ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک پر مشتمل ہے جو اپنی معاشی آزادی اور ترقی کی جدوجہد میں لگے ہیں۔

تیسری دنیا کے مسائل اور خصوصیات

تیسری دنیا کے ممالک کوئی متجانس سیاسی اکائی نہیں ہیں اور نہ ہی یہ سویت اشتراکی و امریکی سرمایہ دارانہ بلاکوں کے درمیان ایک منظّم بلاک ہے بلکہ تیسری دنیا ایک تصوراتی عالم ہے جو عملی طور پر نوآبادیاتی ورثہ، غربت، بیروزگاری اور استحصال کی شکار ہے۔یہ کوئی سیاسی وحدت نہیں۔تیسری دنیا کے ممالک مختلف سیاسی و معاشی نظاموں کے حامل ہیں۔یہاں فوجی آمریت

سے لے کر مطلق العنان بادشاہت اور پارلیمانی جمہوریت بھی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام سے لے کر اشتراکی نظام اور مخلوط معیشت کے حامل ممالک بھی ہیں۔ اس طرح تیسری دنیا کے ممالک نہ تو ایک جغرافیائی وحدت کی نمائندگی کرتے ہیں اور نہ ہی سیاسی فلسفہ وعمل کی۔ بلکہ یہ ایک ایسا غیر متجانس اکائیوں کا مجموعہ ہے جو کرہ ارض کے جنوب پر پھیلا ہوا ہے۔ ان میں اکثر ممالک غیر جانبدار تحریک کے اراکین ہونے کے باوجود بڑی طاقتوں کے اثر سے آزاد نہیں۔ یہ بات اہم ہے کہ یوگوسلاویہ غیر جانبدار تحریک کا سرگرم رکن ہونے کے باوجود بھی تیسری دنیا کا جز نہیں قرار پایا اور چین غیر جانبدار تحریک کا رکن نہ ہوتے، اور ایک اشتراکی ملک ہونے کے باوجود تیسری دنیا کا ہی ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

تیسری دنیا کے ممالک اپنے سماجی ومعاشی حالات کے مطابق اپنے نظریات کو ڈھالے ہیں۔ اشتراکیت آزادی، مساوات، انصاف' جدیدیت اور صنعت یانہ کے جدید تصورات کو اپنے حالات کے مطابق ڈھالے ہیں۔ اس لیے ہر ملک کا سیاسی نظام مختلف ہے۔ دوسرے یہ کہ تیسری دینا کے ممالک کی اکثریت بڑی طاقتوں کی رقابتوں سے دور رہ کر اپنے آپ کو غیر جانبدار تحریک میں مجتمع کیے۔ تیسری دنیا کے ممالک کی بنیادی ضرورت سیاسی آزادی اور معاشی ترقی تھی۔ سماجی و معاشی استحصال کے خلاف جدوجہد ان کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک اپنے سابقہ نوآبادیاتی آقاؤں کے خلاف کسی راست تصادم سے گریز کیے۔ سابقہ برطانوی نوآبادیات اپنے آپ کو دولت مشترکہ (Common Wealth) میں مجتمع کیے اور تاجِ برطانیہ ان کا روحانی سربراہ ہے۔

تیسری دنیا کے ممالک میں معاشی اور داخلی اختلافات اور تصادم بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے اکثر ممالک کے درمیان سرحدی تنازعات ہیں۔ ہندوستان اور چین' ہندوستان اور پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے درمیان سرحدی مسائل ہیں اسی طرح مصر اور یمن، نائجریا اور کانگو، وغیرہ کے درمیان سرحدی تنازعات رہے ہیں۔ ایران اور عراق کے درمیان آٹھ سالہ طویل جنگ تیسری دنیا کا سب سے نازک مسئلہ رہی ہے۔

تیسری دنیا اپنے سماجی و معاشی مسائل سے بہتر طور پر جانی جاتی ہے۔ آبادی کی کثرت، اونچی شرح پیدائش اور اموات، بیروزگاری اور کم تر معیار زندگی کے ساتھ ساتھ ناخواندگی تیسری دنیا کے اہم معاشی وسماجی مسائل ہیں۔ چنانچہ صرف ہندوستان اور چین ہی دنیا کی زائد از 35%

آبادی کا بوجھ رکھتے ہیں۔ ہندوستان دنیا کے رقبہ کا محض 2.4% ہے لیکن دنیا کا ہر چھٹا آدمی ہندوستانی ہے[1]۔ ترقی یافتہ ممالک دنیا کی آبادی کا صرف چھٹا حصہ ہیں۔لیکن عالمی آمدنی میں انکا حصہ 78 فیصد ہے اور یومیہ 70 امریکی ڈالرفی کس آمدنی رکھتے ہیں۔جب کہ دنیا کی آبادی کا 3/5 حصہ 61 غریب ممالک میں رہتا ہے اور عالمی آمدنی کا صرف چھ فیصد یا یومیہ دو ڈالر سے کم فی کس آمدنی رکھتا ہے۔غریب ممالک کی ترقی کی رفتار 1.6 فیصد ہی ہے اور اگر ان ممالک میں سے ہندوستان و چین کو الگ کرلتے ہیں تو یہ فیصد اور بھی کم ہوجاتا ہے[2]۔ تیسری دنیا کے ممالک سالانہ 200 تا 250 بلین ڈالر ترقی یافتہ ممالک کو بطور قرض ادار کرتے ہیں۔1991ء میں تیسری دنیا کے ممالک نے مجموعی طور پر 300 بلین ڈالر کا قرض ادا کیا ہے۔ سال 2001ء میں تیسری دنیا کا جملہ قرض 2,100 بلین ڈالر تھا۔جو دنیا کے 45,000 بلین ڈالر قرض کا پانچ فیصد ہے[3]۔دنیا کی 900 ملین غریب آبادی میں سے 450 ملین غریب ہندوستان میں رہتے ہیں۔تیسری دنیا میں آبادی کی اکثریت دیہات میں رہتی ہے اور اس کا پیشہ زراعت ہے۔لاطینی امریکہ کی آدھی آبادی اور ہندوستان کی قریب 60% آبادی اور آفریقہ کی آبادی کا بڑا حصہ اپنا روزگار زراعت سے حاصل کرتی ہے۔نوآبادیاتی نظام کی وجہ سے شہری اور دیہی آبادی کے درمیان بڑا خط فاصل ہے۔محنت کی پیداواری صلاحیت بہت کم ہے۔سماجی عدم مساوات بہت زیادہ ہے۔زمین کی منصفانہ تقسیم کے لیے کئی ممالک میں اصلاحات اراضی کا آغاز کیا گیا۔

ان تمام مسائل کے علاوہ تیسری دنیا کا ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ وہ آج بھی جدید نوآبادیت (Neo-Colonialism) کے شکنجہ میں ہے۔عالمی معاشی ترقی میں تیسری دنیا کی حصہ داری میں ناکامی ترقی یافتہ امیر ممالک کے بڑھتے تجارتی و معاشی اثرات ، تیسری دنیا کو دی جانے والی امداد اور اسلحہ کی فراہمی، یہ سب باتیں تیسری دنیا کو امیر ممالک کا محتاج بناتی ہیں جس کی وجہ سے وہ ان کے شکنجہ میں کسی جارہی ہے۔سیاسی عدم استحکام اور بیرونی مداخلتیں تیسری دنیا کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ ایشیاء ، افریقہ، و لاطینی امریکی ممالک میں اکثر فوجی بغاوتیں ہوتی رہتی ہیں۔پاکستان ، بنگلہ دیش ، نائجیریا ، افغانستان اور دیگر ممالک میں گذشتہ برسوں میں ہوئی

1.دی ہندو 11 جولائی 2000ء صفحہ 10 2.ڈاکٹر عبدالقیوم'21ویں صدی اور عالمی غربت' روزنامہ سیاست 11 مارچ 2000ء(سنڈے سپلمنٹ) 3.دی ہندو 18 اگست 2001ء صفحہ 10

فوجی بغاوتیں اس کی مثالیں ہیں۔اس لیے بڑی طاقتوں کی مداخلتیں ان ممالک میں عام بات رہی ہے۔ افغانستان میں سویت یونین کی مداخلت اس کی ایک مثال ہے۔تیسری دنیا کے متضاد نظام بھی ان کے انتشار کی ایک وجہ ہیں اور اس فائدہ ترقی یافتہ ممالک اٹھاتے ہیں۔

جدید نوآبادیت Neo Colonialism

جدید نوآبادیت 1960ء کے دہے کی ابتدا میں پیدا ہوا ایک تصور ہے۔اس وقت تیسری دنیا میں ایک عام احساس یہ پیدا ہوا کہ اگر چیکہ نوآبادیت کا خاتمہ ہوا اور دنیا آزاد ہوگئی ہے اور ممالک اقتدار اعلیٰ کے ساتھ اقوام متحدہ کے رکن بھی بنے ، اس کے باوجود یہ ابھی معاشی آزادی حاصل نہیں کیے اور ان کی ڈور بیرونی طاقتوں کے ہاتھوں میں ہے۔چنانچہ 1965ء میں آفریقی ملک گھانا کے صدر کوامے ینکروما (Kwame Nkrumah) اپنی تصنیف Neo-Colonialism the Last Stage of Imperialism میں کہا تھا کہ'' جدید نوآبادیت یہی ہے کہ ایک مملکت نظری طور پر تو آزاد ہوتی ہے لیکن عملی طور پر بین الاقوامی اقتدار اعلیٰ کے چنگل میں ہوتی ہے۔حقیقت میں اس کے معاشی نظام اور سیاسی پالیسیوں کو باہر سے چلایا جاتا ہے'' دوسرے الفاظ میں جدید نوآبادیت سے مراد ممالک رسمی طور پر سیاسی آزادی تو حاصل کرلیتے ہیں لیکن معاشی ، سماجی ، سیاسی اور تکنیکی اعتبار سے بالواسطہ طور پر بیرونی طاقتوں کے چنگل میں ہوتے ہیں۔اسی لیے جدید نوآبادیت کو سامراجیت کی انتہائی خراب شکل سمجھا گیا ہے۔اس کو چلانے والوں کے لیے کسی ذمہ داری کے بغیر اقتدار ہے اور اس کا شکار ممالک کے لیے یہ کسی داد رسی کے بغیر استحصال ہے۔جدید نوآبادیت میں سابقہ نوآبادیات سرمایہ کاری ،قرضوں، امداد غیر مساوی تبادلہ تجارت کے ذریعہ سے اپنے سابقہ نوآبادیاتی آقاؤں کے شکنجہ میں ہوتی ہیں۔اس طرح جدید نوآبادیت ،نوآبادیاتی طاقتوں کی اپنی سابقہ نوآبادیوں پر نہ دکھائی دینے والی بالواسطہ حکمرانی اور قبضہ ہے۔طاقتور ممالک بالواسطہ حکمرانی کے حربوں کو استعمال کرتے ہوئے نوآزاد ممالک کو اپنی معاشی ،سیاسی اور تہذیبی آزادی کو مستحکم بنانے سے روکتے ہیں۔

جدید نوآبادیت کے طریقے

جدید نوآبادیت مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے اور یہ مختلف طریقے اپناتی ہے۔اس کی ایک انتہائی شکل یہ ہے کہ نوآبادیاتی طاقتوں کی افواج جدید نوآبادیت کے شکار ملک کی

سرحدات اور علاقہ کی حفاظت کرتی ہیں اور وہاں کی حکومت کو کنٹرول کرتی ہیں۔ یہ علاقے سیاسی طور پر آزاد نہیں ہوتے۔ عوام کی سماجی، معاشی اور تعلیمی سرگرمیاں حکومت کرنے والے ملک کے مفادات کے تابع ہوتی ہیں۔ جدید نوآبادیت کا سب سے عام طریقہ معاشی کنٹرول ہے۔ نوآزاد ممالک معاشی طور پر خود مکتفی نہیں ہوتے اس لیے ترقی یافتہ ممالک ان غریب ممالک کو معاشی و تکنیکل مدد دیتے ہوئے انھیں پھانستے ہیں۔ امداد دینے کے لیے یہ کئی شرائط رکھتے ہیں جن سے ان کے مفادات کی تکمیل ہوتی ہے۔ کوشش اس بات کی بھی کرتے ہیں کہ دی جانے والی امداد اور قرض دوبارہ پھر انہیں کو واپس ہو۔ چنانچہ اپنی اشیاء و خدمات قرض حاصل کرنے والے ملک پر زبردستی تھوپتے ہیں۔ اس طرح کمزور ممالک کی معیشت کو ایک انحصاری معیشت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ فوجی امداد اور ہتھیاروں کی فراہمی کے ذریعہ امیر ممالک غریب ممالک کی حفاظت و سلامتی کی ذمہ داری خود لیتے ہیں اور جب ضرورت ہو اس کا استحصال کرتے ہیں۔

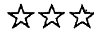
ملٹی نیشنل کارپوریشن (MNC) اور بیرونی سرمایہ کاری جدید نوآبادیت کا ایک اہم ترین ہتھکنڈہ ہے۔ مختلف ممالک کے سرمایہ کار مل کر جوائنٹ اسٹاک کمپنی میں ملٹی نیشنل کارپوریشن قایم کرتے ہیں جو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں کاروبار کرتے ہیں۔ ان کا اہم مقصد منافع کمانا اور دنیا پر غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اپنے اثرات کی وجہ سے مقامی ٹیکس ٹیرف وغیرہ دینے سے گریز کرتے ہیں اور اپنے منافع میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ اپنے ہر ایک ڈالر سرمایہ کاری پر کم از کم تین ڈالر کا منافع حاصل کرتے ہیں اس لیے ان کا مجموعی منافع سوائے امریکہ کے کسی بھی ملک کی خام قومی پیداوار GNP سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ کمپنیاں مقامی حکومتوں پر اثر انداز ہو کر اپنا فائدہ حاصل کرتی ہیں۔ بروک بونڈ، لپٹن، کوکا کولا، پیپسی وغیرہ ملٹی نیشنل کارپوریشن ہیں۔ عالمیانہ (Globalisation) کے نئے رجحان سے تیسری دینا کے ممالک میں ان کارپوریشن کی تجارتی سرگرمیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ مقامی پیدا کنندے (Producers) بازار میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح ممالک کے اندرونی بازاروں میں تک ان کی رسائی ہوگئی ہے اور حکومتیں ان کو سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے مجبور ہیں۔

چوتھی دنیا

1980ء کے دہے میں ایک چوتھی دنیا کا تصور بھی پروان چڑھا تھا لیکن یہ تصور عام نہیں ہوا۔ غربت زدہ تیسری دنیا میں بعض ممالک (خصوصاً عرب ممالک) اپنے قدرتی وسائل کی وجہ

سے معاشی ترقی و خوشحالی حاصل کرلیے۔چنانچہ تیل پیدا کرنے والے OPEC ممالک بڑھتی تیل کی آمدنی کی وجہ سے معاشی خوشحالی کی بلندیوں پر پہنچ کر تیسری دنیا کے غریب ممالک میں ایک ممتاز موقف و مقام کے حامل بن گئے۔ان ممالک کو چوتھی دنیا کہا جانے لگا۔اگرچیکہ یہ ممالک ٹکنالوجی اور مہارت کے لیے ترقی یافتہ ممالک پر انحصار کرتے ہیں'اس کے باوجود وہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک باثر رول ادا کرنے کے موقف میں ہیں۔آمدنی کے لحاظ سے سعودی عرب کو معاشی سوپر پاور کہا جاتا ہے۔سال 99-1998ء میں اس کی فی کس آمدنی 7040 ڈالر تھی جب کہ سال 2000-1999 میں سعودی عرب کے پاس 14.8 بلین ڈالر فاضل آمدنی تھی[4]۔

سویت یونین کے خاتمہ سے دنیا معدوم ہوگئی ہے۔ایسے میں مابعد دوسری جنگ عظیم کی تقسیم اب اپنی اہمیت کھودی ہے۔اس لیے تیسری اور چوتھی دنیا کا تصور اب ازکار رفتہ ہے۔ممالک کی نئی معاشی صف بندی میں شمال اور جنوب کو اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔شمال کے صنعتی اور ترقی یافتہ ممالک جنوب کے غریب و کمزور ممالک کے مقابلے میں زیادہ خوشحال ہیں اور عالمی معیشت پر ان ہی کا قبضہ ہے۔دوسری طرف تیسری دنیا کے غریب ممالک میں انتہائی غریب ممالک کا ایک نیا درجہ بھی ہے جو Least Developed Countries یا انتہائی کم ترقی یافتہ ممالک پر مشتمل ہے جن کی سالانہ فی کس آمدنی 200 امریکی ڈالر سے بھی کم ہے۔



4۔دی اکانومسٹ 17 نومبر 2001ء (اشتہاری صفحات)

باب 16

معاشی مسائل، تیسری دنیا اور بین الاقوامی تعلقات

Economic Problems, the Third World and International Relations

دوسری جنگ عظیم کے بعد تین طرح کے ذیلی معاشی نظام وجود میں آئے 1. باہمی انحصار کا مغربی نظام 2. انحصار کا شمال جنوب نظام اور 3. انحصار کا مشرق مغرب نظام۔ لیکن ذیلی نظاموں کی یہ تقسیم مصنوعی تھی چونکہ تمام نظام دیئے گئے عالمی نظام میں کام کرتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح سے ان کا ایک دوسرے پر انحصار رہتا ہے۔ موجودہ معاشی نظام میں شمال کے امیر ممالک اور جنوب کے غریب ممالک کے درمیان تصادم ہے اور یہ نظام شمال کے امیر ممالک کے مفادات کا محافظ ہے۔ شمال کے امیر ممالک امتیاز کی آزادانہ تجارت کی پالیسی کے اصول کو اپناتے ہیں لیکن جنوب کے غریب ممالک اپنی پسماندگی اور کم تر اشیاء کی وجہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ شمال کے ترقی یافتہ ممالک اپنے موافق شرائط تجارت کے ساتھ ترقی پذیر ممالک کی منڈیوں میں رسائی حاصل کر لیتے ہیں جس سے غریب ممالک کا نقصان ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک جنوب میں رہنے والے تیسری دنیا کے غریب ممالک میں اپنی سرمایہ کاری کے ذریعہ بھاری تجارتی منافع کماتے ہیں۔ تیسری دنیا کی صنعتی پیداوار اور تجارت ملٹی نیشنل کارپوریشنس کے ہاتھوں میں ہے۔ اس طرح موجودہ معاشی نظام عدم مساوات، استحصال، عدم استحکام اور ماحولیاتی عدم توازن پر مشتمل ہے۔

بین الاقوامی تعلقات میں امیر اور غریب ممالک جغرافیائی طور پر شمال اور جنوب میں منقسم ہیں۔ چنانچہ شمال کے غیر کمیونسٹ صنعتی ممالک امریکہ، کینڈا، جاپان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور مغربی یوروپ کے ممالک برطانیہ، فرانس، اٹلی جرمنی وغیرہ انتہائی دولت مند اعلی فی کس آمدنی رکھتے ہیں جب کہ جنوب کے ممالک تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک ایشیاء آفریقہ اور لاطینی امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دنیا کی 1.2 بلین غریب آبادی انھیں ممالک میں رہتی ہے جن کی یومیہ فی کس آمدنی ایک ڈالر سے بھی کم ہے۔ ممالک کے درمیان شمال اور جنوب کی تقسیم کا تصور جنوری 1949ء میں امریکی کانگریس کو مخاطب کرتے ہوئے صدر ٹرومن نے دیا تھا۔

گذرتے وقت کے ساتھ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان عدم مساوات بڑھتی ہی گئی۔ ترقی یافتہ ممالک کی ترقی میں بے انتہا اضافہ ہوا لیکن ترقی پذیر ممالک کی حالت میں مزید گراوٹ آ گئی۔ ترقی پذیر ممالک اپنی اس حالت کے لیے دوسری جنگ عظیم کے بعد قایم عالمی معاشی نظام کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور دوسری جنگ عظیم کے بعد قایم ہونے والے معاشی ادارے جیسے GATT، IMF، IBRD وغیرہ کو اپنی خراب معاشی حالت کے لیے ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں جیسے جیسے تیسری دنیا کے ممالک کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ایک نئے عالمی معاشی نظام کا مطالبہ بڑھنے لگا۔ 1962ء میں غیر جانبدار تحریک کی بلگریڈ میں منعقدہ پہلی چوٹی کانفرنس میں پہلی مرتبہ جدید بین الاقوامی معاشی نظام کا مطالبہ کیا گیا۔ چنانچہ ترقی پذیر ممالک کے بڑھتے مطالبہ کے نتیجہ میں اقوام متحدہ نے 1964ء میں UNCTAD، کا قیام عمل میں لایا۔ اس کا پہلا اجلاس اسی سال جنیوا میں منعقد ہوا۔ جس میں تیسری دنیا کی پیداوار کے لیے موافق ٹیرف (Tariff) کے قیام اور خام مال کی قیمتوں کو روکنے کے اقدامات کی سفارش کی گئی۔ 1967ء میں الجیرس میں UNCTAD کی دوسری کانفرنس منعقد ہوئی جس میں صنعتی ممالک کی جانب سے تیسری دنیا کو دی جانے والی بدد میں اضافہ اور تیسری دنیا کی پیداوار کے لیے عالمی مارکٹ میں رسائی کسٹم، ٹیرف اور تجارت میں مراعات کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ ممالک کے موافق شرائط تجارت کی مذمت کرتے ہوئے اس میں تبدیلیوں کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ اس کے باوجود ترقی یافتہ ممالک ان مطالبات پر کوئی توجہ نہیں دیئے۔ جس کے نتیجہ میں تیسری دنیا کے ممالک میں خود انحصاری کا احساس پیدا ہونے لگا جو آگے چل کر تیسری دنیا کی اجتماعیت G-15 کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

1972ء میں Santiago میں منعقدہ تیسری کانفرنس میں ترقی پذیر ممالک نے موجودہ باہمی تجارت اور ترقی یافتہ ممالک کی امداد پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا اور زیادہ موثر امداد اور اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کا ترقی یافتہ ممالک سے مطالبہ کیا گیا۔ جب کہ ان مطالبات پر ترقی یافتہ ممالک نے کوئی توجہ نہیں دی۔ چنانچہ 1976ء میں نیروبی میں منعقدہ چوتھی UNCTAD کانفرنس نے تیسری دنیا کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے ترقی کے لیے متحدہ اقدامات کی تجویز رکھی۔ اس کے نتیجہ میں شمال اور جنوب کے ممالک کے درمیان تصادم کی صورتحال پیدا ہوئی۔

پچیس سال یعنی 1950-1975ء کے دوران بڑھتی ہوئی آمدنی کا 76% ترقی یافتہ ممالک کی 24% آبادی کے حصہ میں تھا۔ اس کے برعکس بڑھتی ہوئی آمدنی کا 24% ترقی پذیر ممالک کے 76% آبادی کے حصہ میں تھا۔ ترقی پذیر ممالک میں کم آمدنی والے ممالک (LDCS) کا جو کچھ حصہ تھا وہ تقریباً نا کے برابر تھا۔ یعنی صرف 3%۔

عالمی پیداوار میں مختلف ممالک کا حصہ 1980ء کے دہے میں

ایشیاء	عالمی آبادی کا نصف	8%	
آفریقہ		1.3%	
اوپیک ممالک		3.4%	تیل کے غیر معمولی منافع کے باوجود
جاپان (اکیلا)		8.1%	
امریکہ روس و یوروپ		71.6%	

یہ اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ گذشتہ صدی کے 70 اور 80 کے دہے میں ایشیاء و آفریقہ کے ممالک عالمی آبادی کے بڑے حصہ پر مشتمل ہونے کے باوجود عالمی معیشت و تجارت میں اس کا حصہ بہت معمولی تھا۔ جب کہ مغربی ممالک بہت ہی قلیل عالمی آبادی کے باوجود عالمی پیداوار میں بھاری حصہ رکھتے تھے۔

اسی طرح 1973ء کی قیمتوں کے مطابق ترقی یافتہ ممالک کی حقیقی فی کس آمدنی (Real Per Capita Income) 1952ء تا 1975ء کے درمیان 2000 ڈالر سے بڑھ کر 4000 ڈالر ہوئی جب کہ LDCS کی حقیقی فی کس آمدنی میں صرف 124 ڈالر کا ہی اضافہ ہوا یعنی یہ 175 ڈالر سے بڑھ کر 300 ڈالر ہوئی۔

جدید بین لاقوامی معاشی نظام (NIEO) کا مطالبہ

بالآخر اپریل / مئی 1974ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چھٹے خصوصی اجلاس نے ایک جدید بین الاقوامی معاشی نظام (New International Economic Order) کے قیام کا مطالبہ کیا اور ترقی یافتہ ممالک سے اخلاقی بنیادوں پر مطالبہ کیا گیا کہ وہ غیر ترقی یافتہ ممالک کو بھی معاشی وسائل حاصل کرنے کی اجازت دیں اور عالمی معاشی وسائل پر اپنی اجارہ داری کو ختم کرتے ہوئے انصاف پر مبنی ایک نئے عالمی معاشی نظام کو قبول کریں۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنے ستائیسویں اجلاس منعقدہ 12 ڈسمبر 1974ء میں مملکتوں کے معاشی حقوق

کے منشور کو اپنایا' جسکا مقصد قوموں کے درمیان مساوات پر مبنی معاشی تعلقات کو فروغ دینا اور عالمی معیشت کے ڈھانچے میں تبدیلیاں لانا تھا۔ اس طرح NIEO کا مطالبہ رفتہ رفتہ زور پکڑنے لگا۔ ابتدا میں ترقی یافتہ ممالک اس جانب کوئی خصوصی توجہ دینا ضروری نہیں سمجھے، لیکن بدلے ہوئے عالمی حالات میں قوموں کے درمیان نئے معاشی تعلقات کی ضرورت کے مدنظر اس پر توجہ دینے لگے۔ NIEO کے اپنے مطالبہ پر زور دینے کے لیے تیسری دنیا کے ممالک اس دوران کئی ایک کانفرنسیں منعقد کیے۔ فبروری 1975ء میں جنوب کے ممالک کی ایک کانفرنس ڈاکار (سینگال مغربی آفریقہ) میں منعقد ہوئی۔ یہاں پر اپنائی گئی تجاویز کو بعد میں مارچ 1975ء میں پیرو میں منعقدہ UN Industrial Development Organization(UNIDO) کی کانفرنس کے اعلان نامہ میں شامل کیا گیا۔ ڈسمبر 1975ء میں کانفرنس برائے معاشی تعاون (Conference on International Economic Co-operation) کا آغاز پیرس میں ہوا جس میں 19 ترقی پذیر ممالک، 7اوپیک ممالک (الجیریا، انڈونیشیاء، ایران، عراق، نائیجیریا، سعودی عرب اور وینزویلا) اور ترقی یافتہ ممالک امریکہ، جاپان، کینیڈا، آسٹریلیا، اسپین، سویڈن، سویزرلینڈ وغیرہ حصہ لیے۔ تاہم اس کانفرنس سے خاطرخواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے اور اس کانفرنس کو جون 1997ء میں ختم کیا گیا۔ 18 ماہ چلنے والی اس طویل کانفرنس کا فائدہ صرف یہ ہوا کہ دونوں جانب ممالک ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھ سکے۔ 1979ء میں ہوانا میں منعقدہ غیر جانبدار چوٹی کانفرنس نے شمال۔ جنوب بات چیت کے تمام مسائل کا احاطہ کرنے ایک نئے دور کی بات چیت کے آغاز کا مطالبہ کیا۔ NIEO کے مطالبہ میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب کہ 1979ء میں جنرل اسمبلی نے NIEO کے لیے قرارداد منظور کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے چوکھٹے میں توانائی، خام مال، تجارتی ترقی، کرنسی اور مالی امور پر عالمی بات چیت کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ لیکن امریکہ اقوام متحدہ کے چوکھٹے میں NIEO پر مباحث کی مخالفت کیا۔

Brandt Commission اور شمال۔ جنوب بات چیت

شمال اور جنوب کے ممالک کے درمیان معاشی مسائل پر غور کرنے عالمی بینک نے جرمنی کے سابق چانسلر Willy Brandt کی صدارت میں ایک کمیشن قایم کیا۔ اس کمیشن نے 1980ء میں پیش کردہ اپنی رپورٹ میں ترقی پذیر ممالک کے جائز مطالبات پر سیاسی توجہ دیتے ہوئے ان کی ترقی کے لیے امیر ممالک کے وسائل کے بڑے پیمانے پر غریب ممالک کو تبادلے کی تجویز پیش کی، تاکہ اس طرح عالمی غربت میں کمی ہوسکے۔ اس کے علاوہ کمیشن نے اقوام

متحدہ کے چوکھٹے میں شمال اور جنوب کے باہمی مسائل کے حل کے لیے شمال جنوب بات چیت پر زور دیا۔ اس کمیشن کی تجاویز کے مطابق اکتوبر 1981ء میں چودہ ترقی پذیر ممالک اور آٹھ ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے رہنماؤں کی ایک کانفرنس کانکن (Concun) میکسیکو میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں زیادہ تر عالمی بات چیت کی تجاویز کو طئے کرنے پر توجہ دی گئی۔ اس کانفرنس میں ترقی پذیر ممالک نے اقوام متحدہ کے مختلف اداروں جیسے IMF اور عالمی بینک وغیرہ پر اقوام متحدہ کی نگرانی کو قایم کرنے پر زور دیا۔ جب کہ امریکہ کو یہ بات منظور نہیں تھی۔ امریکی صدر رونالڈ ریگن نے واضح کیا کہ ان اداروں کے انفرادی فیصلوں کو اپنے حدود میں حرف آخر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اس طرح یہ کانفرنس شمال اور جنوب کے درمیان مثبت فیصلوں کے بغیر ہی ختم ہوئی اور شمال جنوب بات چیت کا مسئلہ تعطل سے دوچار ہوگیا۔ ڈسمبر 1981ء میں ترقی پذیر ممالک کے نمائندوں نے جنرل اسمبلی میں عالمی معیشت کی ازسر نو ترتیب کے لیے شمال جنوب بات چیت کو آگے بڑھانے ایک قرارداد پیش کی۔ تاہم امریکہ نے اس قرارداد کی یہ کہتے ہوئے مخالفت کی کہ اس سے عالمی بینک (World Band) اور ائی۔ ایم۔ ایف جیسے معاشی اداروں کی آزادی کو خطرہ لاحق ہوگا۔

فبروری 1983ء میں برانڈٹ کمیشن نے اپنی دوسری رپورٹ شائع کی۔ اس رپورٹ میں کمیشن نے توازن ادائیگی، قرض بینکی بحران اور ترقی پذیر ممالک کی مالی امداد کے لیے کئی مالی اقدامات کی تجویز پیش کیے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا خصوصی اجلاس 23 اپریل 1990ء کو نیویارک میں شروع ہوا جس میں ترقی پذیر ممالک کی بڑھتی ہوئی معاشی بدحالی کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور معاشی تعاون کے سلسلہ میں ان ملکوں کو درپیش مشکلات پر غور کیا گیا۔ اس اجلاس میں بشمول ہندوستان 158 ممالک کے نمائندے حصہ لیے۔ سابقہ برسوں میں ترقی پذیر ممالک کو قرضوں کے بوجھ سے چھٹکارا دلانے کے لیے ترقی یافتہ متموّل اقوام نے جو نیم دلانہ اقدامات کیے۔ وہ مقاصد کے حصول میں پوری طرح ناکام ثابت ہوئے تھے۔

1980ء کے دہے کے دوران، جو خسارہ کا دہا ثابت ہوا، ترقی پذیر ممالک کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کے ازالہ کے لیے موثر تدابیر کا ایک واضح لائحہ عمل مرتب کیا جانا ضروری تھا۔ 1980ء کے دہے کے دوران ترقی پذیر ممالک قرض کے بوجھ تلے دبے رہے جس نے انھیں اپنی معاشی ترقی کے اقدامات کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ عالمی بینک کے اعداد و شمار کے بموجب تمام ترقی پذیر ممالک مجموعی طور پر 1290 بلین ڈالر کے مقروض تھے۔ 19 ممالک ایسے ہیں جو

520 بلین ڈالر کے مقروض تھے اور جو متوسط آمدنی کی اقوام تصور کی جاتی ہیں ان میں ارجنٹینا، برازیل، چلی، کاسٹاریکا، ہنڈراس، ہنگری، میکسیکو، مراقش، نکاراگوا، پیرو، فلپائین، پولینڈ، سینگال اور وینزویلا وغیرہ شامل ہیں۔علاقائی اعتبار سے لاطینی امریکہ اور کیریبین علاقہ کے ممالک مجموعی طور پر 434 بلین ڈالر کے مقروض تھے شمالی آفریقہ اور مشرق وسطی کے ممالک 121 بلین ڈالر مشرقی ایشیاء کے ممالک سو بلین ڈالر کی حدتک مقروض تھے۔ دوسری طرف متمول اور ترقی یافتہ ممالک کی معاشی ترقی کی رفتار میں اضافہ ہوا اور اپنی اس ترقی کو پسماندہ اقوام کے استحصال کے لیے استعمال کئے۔آفریقہ اور لاطینی امریکہ کے بعض ممالک جو گذشتہ دہے کے اوائل تک بڑی حدتک خوشحال تصور کئے جاتے تھے1980ء کے دہے کے دوران معاشی بدحالی میں مبتلا ہوگئے۔جب کہ مشرقی ایشیاء کے ممالک نے اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں ٹھوس اقدامات کئے اور وہ مقصد کے حصول میں بڑی حدتک کامیاب بھی رہے۔ چنانچہ ہندوستان اور چین نے جنھیں ترقیاتی میدان میں مختلف قسم کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا حیرت انگیز طریقہ پر حالات پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کیے۔

صنعتی ترقی یافتہ اقوام خاص طور پر امریکہ اس اجلاس کے انعقاد اور اس کے مباحث کے سلسلہ میں کسی قسم کے جوش وخروش کا اظہار نہیں کئے۔77 ترقی پذیر ممالک کی برادری نے اس اہم اجلاس کا اہتمام کیا تھا۔ان مباحث کا بنیادی مقصد ترقی پذیر اقوام کی معیشت کو نئی زندگی عطا کرنے کے سلسلہ میں باہمی تعاون واشتراک کے فروغ کے امکانات کا جائزہ لینا تھا۔ترقی پذیر ممالک کو جو سب سے بڑی دشواری ہے وہ یہ کہ عالمی منڈی میں انکی پیداوار کی نکاسی کے مناسب مواقع حاصل نہیں ہیں اور اس معاملہ میں متمول ترقی یافتہ اقوام نے اپنی اجارہ داری قایم کرلی ہے۔ جب تک یہ اجارہ داری اور ترقی پذیر اقوام کا استحصال ختم نہ ہو عالمی معاشی نظام میں کسی انقلابی یا حوصلہ افزاء تبدیلی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

ایک ہفتہ طویل اس خصوصی اجلاس میں ایک جامع 38 نکاتی اعلان نامہ جاری کرتے ہوئے تیسری دنیا کو قرض میں راحت دینے کا امیر ممالک سے مطالبہ کیا اور کہا کہ امیر صنعتی ممالک تیسری دنیا کی امداد کے لیے اپنی خام قومی پیداوار (GNP) کا کچھ فیصد حصہ مختص کردیں۔چنانچہ % 0.7 سرکاری طور پر ترقیاتی امداد اور %0.15 LDCS کی ترقی کے لیے مختص کرنے کو کہا گیا۔

جنوب۔جنوب تعاون South-South Co-operation , G-15

شمال۔جنوب بات چیت کی ناکامی کے نتیجہ میں تیسری دنیا کے ممالک نے ترقی یافتہ ممالک کے اثر سے آزاد اپنے طور پر معاشی ترقی کے اقدامات کرنے شروع کئے جسے جنوب جنوب تعاون کا نام دیا گیا۔ کانکن کانفرنس کے بعد دہلی میں گروپ 77 کے ممالک نے بین الاقوامی معاشی تعاون کو موثر بنانے کے لیے ایک 9 نکاتی منشور منظور کیا۔نومبر 1983ء میں دہلی میں منعقدہ دولت مشترکہ چوٹی کانفرنس نے بھی نئے بین الاقوامی معاشی نظام اور عالمی مالیاتی نظام کی اصلاح کا مطالبہ کیا۔

گروپ 15 کا ستمبر 1989ء میں بلگریڈ میں منعقدہ غیرجانبدار ممالک کی چوٹی کانفرنس کے موقع پر گروپ 8 کے طرز پر ہندوستان کی تحریک پر قیام عمل میں آیا۔جس کا مقصد یکساں نوعیت کے معاشی مسائل سے دوچار ترقی پذیر اقوام کے ایک مختصر فورم کی دیرینہ ضرورت کی تکمیل کرنا تھا۔G-15 کے ارکان میں ہندوستان انڈونیشیاء، ملائیشیاء، یوگوسلاویہ، مصر، الجیریا، سینگال، نائجیریا، زمبابوے، میکسیکو، برازیل، ارجنٹینا، پیرو، وینزولا اور جمیکا شامل ہیں۔مختلف براعظموں سے تعلق رکھنے والے ممالک محض معاشی اعتبار سے مشترکہ مقاصد کے تحت اس گروپ کی شکل میں متحد ہوئے ہیں۔بظاہر اس گروپ کا غیرجانبدار تحریک سے کوئی راست ربط نہیں لیکن مشترکہ مقاصد نے اس گروپ کو ان تنظیموں سے منسلک کر رکھا ہے۔گروپ 15 کے ممالک متذکرہ بالا تنظیموں سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔اس گروپ کی تشکیل کا بنیادی مقصد ترقی یافتہ ممالک اور ان کی زیر سرپرستی ممالک کی معاشی اور تجارتی حکمت عملی سے متاثر ہونے والے ترقی پذیر ملکوں کے مفادات کے تحفظ کی راہیں ہموار کرنا ہے۔ بین الاقوامی معاشی صورتحال میں تیز رفتار تبدیلیوں اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان باہمی تجارتی اور معاشی معاہدوں کے نتیجے میں عالمی معیشت میں ہونے والی انقلابی تبدیلیوں نے ترقی پذیر ممالک کو تعاون پر مجبور کردیا ہے۔

G-15 کے دو اہم اور بنیادی مقاصد تھے۔ایک تو یہ کہ عالمی معاشی صورت حال سے متعلق اہم مسائل اور امور کے بارے میں مشترکہ انداز فکر اور حکمت عملی اور ایسے امور میں بین الاقوامی کانفرنسوں اور اجتماعات میں مشترکہ موقف کو اختیار کرنا تھا۔دوسرا یہ کہ باہمی تعاون کو فروغ دینے ٹھوس تدبیر اختیار کرنا اور ایسے پروگرام مرتب کرنا جن کی مدد سے باہمی تعاون کو زیادہ موثر بنانے کی راہیں ہموار ہوسکیں۔معاشی مفادات کے تحت متحد ہونے والے ان ممالک میں سیاسی تعاون کے امکانات بھی روشن ہوگئے ہیں اور یہ تمام ممالک خود کفالت اور خاص طور پر غذائی اجناس کی پیداوار میں ترقی یافتہ ممالک پر انحصار کو ختم کرنے کوشاں ہیں۔ G-15 کی پہلی

چوٹی کانفرنس 1990ء میں ملائشیاء میں ہوئی تھی۔ دوسری کراکس (وینزویلا) میں 1991ء میں ہوئی تیسری کانفرنس 1992ء ڈاکار (سینگال) اور چوتھی کانفرنس مارچ 1993ء میں نئی دہلی میں کورم کی تکمیل کے بغیر ہی شروع ہوئی۔ پانچویں کانفرنس ارجنٹینا میں ہوئی۔اس کے بعد کی کانفرنسیں اراکین کی عدم دلچسپی کے باعث ناکام ثابت ہوئیں اور 1998ء کے بعد سے اس کے اجلاس غیر یقینی ہو گئے۔

کوالالمپور ملائیشیاء میں منعقدہ پہلی چوٹی کانفرنس میں عالمی معاشی صورت حال کا جائزہ لیا گیا، قرض، تجارت دوسرے متعلقہ امور میں شمال کے ترقی یافتہ ممالک کے بڑھتے ہوئے اثر سے نمٹنے کی حکمت عملی طے کی گئی۔ اس کے علاوہ مستقل سکریٹریٹ کے قیام کا بھی فیصلہ کیا گیا تاکہ آپسی اقدامات میں ہم آہنگی پیدا کر سکے اور سالانہ اجلاسوں کو قطعیت دی جاسکے۔اس کے علاوہ باہمی مفاد کے بارہ معاشی پراجکٹوں کی بھی منظوری دی گئی۔ ڈسمبر 1991ء میں وینزویلا کے صدر مقام کراکس میں منعقدہ دوسری کانفرنس میں باقی ارکان مصر اور چند دوسرے ممالک نے شرکت نہیں کی۔ ارجنٹینا اور برازیل نے بھی عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ یہ کانفرنس جنوب۔جنوب تعاون کو فروغ دینے میں ناکام ثابت ہوئی۔ گذشتہ کانفرنسوں میں جن پراجکٹوں کے آغاز سے اتفاق کیا گیا تھا انکی عمل آوری میں بعض ارکان پس و پیش کئے۔اس کانفرنس میں ساوتھ ٹریڈ ڈیولپمنٹ اور ٹکنالوجی ڈاٹا ایکسچینج کے قیام کا فیصلہ کیا گیا جس سے ترقی پذیر ممالک کے درمیان باہمی تعاون کو فروغ حاصل ہوگا۔نومبر 1992ء میں سینگال کے صدر مقام ڈاکار میں منعقدہ کانفرنس میں 7 نئے پراجکٹوں کی منظوری دی گئی جن میں نئی دہلی میں کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر کا قیام اور پٹرولیم، گیاس اور پٹروکیمیکل اشیاء کے ڈیزائین، عمل آوری اور انتظام کے علاوہ توانائی کے فروغ جنوب۔جنوب میکانزم کی تشکیل شامل ہے۔لیکن جنوب۔جنوب تعاون کا جذبہ بہتر طور پر آگے نہ بڑھ سکا چونکہ گروپ 15 کے ممالک اپنے انفرادی مسائل میں الجھے ہیں۔جسکی وجہ سے انکے سالانہ اجلاسوں کا انعقاد مشکل ہوگیا۔اکثر اجلاسوں میں رکن ممالک کی اعلی قیادت شریک نہیں ہوئی بلکہ صرف ضابطے کی تکمیل کے لیے نچلی سطح کے ذمہ داروں کو اس میں شرکت کے لیے روانہ کیا گیا۔ جسکی وجہ سے جنوب۔جنوب تعاون کا جذبہ ماند پڑ گیا۔دوسری طرف عالمی غربت، بھوک و افلاس میں بے حد اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ سال 2000ء کے ختم تک سطح غربت سے نیچے زندگی گذارنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوکر 1.2 بلین پہنچ گئی۔جب کہ ہر سال دنیا کی آبادی میں 90 ملین کا اضافہ ہورہا ہے۔ دنیا کی 20% آبادی سطح غربت سے نیچے زندگی

گذار رہی ہے۔ دنیا کے غریب ترین ممالک کا مجموعی قرض 220 بلین ڈالر سے متجاوز ہے۔ کیوبا کے صدر فیڈل کاسٹرو نے تیسری دنیا کے قرض کو معاف کرنے کا امیر صنعتی ممالک سے مطالبہ کیا تھا۔ سکریٹری جنرل اقوام متحدہ کوفی عنان نے بھی غریب ترین ممالک کو راحت دینے کی وکالت کی تھی۔ 1999ء میں Cologne میں ہوئی گروپ۔7 کی چوٹی کانفرنس صرف 70 ملین ڈالر کی حد تک ہی قرض کو معاف کرنے کا اعلان کی۔ امیر و غریب ممالک کے درمیان خلیج بڑھتی جارہی ہے۔ تیسری دنیا میں غربت کا معیار عالمی بینک کے مطابق یومیہ ایک امریکی ڈالر فی کس آمدنی ہے جب کہ امریکہ میں یومیہ گیارہ ڈالر فی کس آمدنی رکھنے والوں کو سطح غربت سے نیچے تصور کیا جاتا ہے۔ فبروری 2000ء بنکاک میں UNCTAD کی دسویں کانفرنس نے عالمی معیشت کے عالمیانے کے عمل میں اضافہ اور مارکٹ کی ترقی پر توجہ مرکوز کی۔ سکریٹری جنرل اقوام متحدہ کوفی عنان نے اس کانفرنس میں ترقی کی دوڑ میں شامل دو طرح کے ممالک کی نشاندہی کی ہے۔ ایک وہ ''جو اپنے تمام شہریوں کو محفوظ ماحول میں آزاد اور صحت مند زندگی سے استفادہ کے مواقع فراہم کرتا ہے'' دوسرا ترقی پذیر ملک وہ ہے ''جس میں شہری سماج نہ صرف مادی بہتری بلکہ انسانی حقوق کے بہتر معیارات اور ماحولیاتی تحفظ کا بھی مطالبہ کرتا ہے''[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں بنیادی انفراسٹرکچر اور زندگی کی بنیادی سہولتوں کی کمی اس حد تک ہے کہ شہریوں کے حقوق بھی پورے نہیں ہوتے۔ اس معیار کے مطابق ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان تفاوت بہت زیادہ ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک دنیا کی آبادی کا صرف چھٹا حصہ ہیں، لیکن عالمی آمدنی میں ان کا حصہ آج 78% ہے اور یومیہ 70 ڈالر فی کس آمدنی رکھتے ہیں۔ جب کہ دنیا کی آبادی کا 3/5 واں حصہ جو 61 غریب ممالک میں بستا ہے، عالمی آمدنی کا صرف چھ فیصد یومیہ دو ڈالر سے کم فی کس آمدنی رکھتا ہے۔ غریب ممالک کی ترقی کی رفتار 1.6 فیصد ہی ہے۔ بیسویں صدی کے آخری دہے میں دنیا نے زبردست معاشی ترقی دیکھی ہے۔ اس کے باوجود بھی تیز تر معاشی ترقی رکھنے والے ممالک بھی ترقی معکوس کا شکار ہوئے ہیں۔ عالمی مالی بحران جو گذشتہ دہے کے اواخر میں مشرقی ایشیاء سے شروع ہوا تھا بڑھتے بڑھتے روس اور لاطینی امریکہ کی سب سے بڑی معیشت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جاپان کی معیشت دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلی مرتبہ 1998ء سے سالانہ کوئی 2.6 فیصد کے حساب سے گراوٹ کا شکار ہے۔ امریکی معیشت بھی زوال پذیر ہے۔ سال 01-2000ء میں اس کی معاشی

---

1. دی ہندو 13 فبروری 2000ء صفحہ 14

ترقی کی رفتار میں پچاس فیصد کی گراوٹ یعنی پانچ فیصد سے گھٹ کر 2.5% درج ہوئی۔

عالمیانہ Globalisation

عالمیانہ کا تصور بیسویں صدی کے آخری دہے میں شروع ہوا۔ عالمی سیاسی ماحول میں تبدیلی کے نتیجہ میں فوج و اسلحہ کی اہمیت میں کمی آ گئی اور اس کی جگہ قوموں کے درمیان تعلقات میں معاشی مسائل اور امور نے لے لی۔ خصوصاً 1993ء میں یوروگوائے میں GATT کے آخری دور کی بات چیت کے بعد 1995ء میں WTO کے قیام سے عالمیانہ کے عمل میں تیزی آئی۔ عالمیانہ کا مطلب ملکی معیشت کو عالمی معیشت سے جوڑنا ہے۔ یعنی ملکی معیشت کو راست بیرونی سرمایہ کاری کے لیے کھول دینا اور بیرونی کمپنیوں کو ملک کی معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت دینا ہے۔ اس طرح عالمیانہ کے نتیجہ میں اشیاء و خدمات اور سرمایہ و مالیہ، ٹکنالوجی، مینجمنٹ اور کاروبار کی آزادانہ نقل و حرکت ہوگی۔ اس میں محنت (Labour) کے نقل مقام کو بھی شامل کیا گیا ہے چونکہ جرمنی اور برطانیہ جیسے بعض ممالک میں میان پاور کی کمی ہے۔ پہلے یہ ممالک اپنی امیگریشن پالیسی میں بڑے سخت تھے۔ لیکن اب انھوں نے اپنی پالیسی میں نرمی لاتے ہوئے پابندیوں میں کمی کی ہے۔ UNCTAD نے عالمیانہ کی تعریف کرتے ہوئے اسے ''عالمی بین انحصاری'' کا غریب دوست تصور قرار دیا ہے۔ جب کہ عالمیانہ کا مغربی تصور'' خیال کے رفتار سے کاروبار'' ہے جس میں ای۔ کامرس کو معاشی خوشحالی کا ذریعہ سمجھا گیا[2]۔ WTO تجارتی رکاوٹوں میں کمی کو عالمیانہ کا جز مانتا ہے جس میں دانشورانہ ملکیتی حقوق بھی شامل ہیں۔ عالمیانہ کے نتیجہ میں معاشی اقتدار اعلی اور قومی جغرافیائی سرحدات بے معنی ہوگئے ہیں۔ کمپیوٹر کی ٹکنالوجی اور مواصلات نے عالمیانہ کے عمل میں مزید سہولت پیدا کردی ہے۔ تاہم عالمیانہ سے چند ایک خطرات بھی ہیں۔ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ملٹی نیشنل کمپنیاں (MNCS) ترقی پذیر ممالک پر اپنی مرضی چلاسکتے ہیں۔ ان کے پاس ایسا کرنے کی طاقت اور صلاحیت ہے چونکہ اکثر ترقی پذیر ممالک کا GNP ان کمپنیوں کے منافع سے کم ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ اپنی طاقت کا غلط استعمال کرتے ہوئے ترقی پذیر ممالک کا استحصال کرسکتے ہیں اور ان کے قدرتی وسائل کو اپنے قبضہ میں لے سکتے ہیں۔ جس سے دوبارہ پیدا نہ ہونے والے وسائل کے خاتمہ سے حیاتیاتی توازن بگڑسکتا ہے اور قابل پیدا قدرتی وسائل جیسے جنگلات کو دوبارہ پیدا ہونے برسوں لگ جائیں گے۔



---

2. دی ہندو 21 فبروری 2000 صفحہ 14

باب 17

دنیا کا بدلتا نظام- دو قطبی سے ہمہ قطبی کی طرف

Changing World Order-From Bi-Polarity to Multipolarity

بیسویں صدی کا آخری دہا اس اعتبار سے اہم تھا کہ اس میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے قایم عالمی نظام تیزی سے بدلنے لگا۔ اکتوبر 1990ء میں جرمنی کے دوبارہ اتحاد سے یوروپ میں سرد جنگ کی دیواریں ڈھے گئیں اور دنیا ایک نئے عالمی نظام کی طرف آگے بڑھنے لگی۔ سویت یونین داخلی کمزوریوں اور اختلافات کا شکار ہو گیا اور دنیا یک قطبی نظام (Uni-polarity) کے زیر اثر آ گئی۔ بدلتی دنیا کے حالات کا ذیل میں مختصر جائزہ لیا جائے گا۔

1. خلیجی جنگ Gulf War 1991

خلیجِ فارس (Persian Gulf) دوسری جنگ عظیم کے بعد سے بڑی طاقتوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ لیکن 1980ء میں خلیج فارس کی علاقائی کشیدگی عالمی امن کے لیے خطرہ کا باعث بنی۔ فبروری 1979ء میں ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد ایران اور عراق کے درمیان سرحدی کشیدگی میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ شطّ العرب کے مسئلہ کو لے کر دونوں ممالک تین ہزار دن کی طویل جنگ لڑے۔ 22 ستمبر کو ایران اور عراق کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا، جو بالآخر اگست 1988ء میں ختم ہوئی۔ لیکن اس جنگ کی وجہ سے امریکہ کو خلیج میں با اثر رول ادا کرنے کا موقع مل گیا۔ دوسری طرف ایران عراق جنگ کے خطرات کے پیش نظر خلیج فارس کی چھ عرب مملکتیں سعودی عرب، کویت، قطر، بحرین، متحدہ عرب امارات اور عمان فوجی سلامتی اور سماجی و معاشی ترقی کے لیے ایک علاقائی اتحاد میں منظّم ہو گئے اور خلیج تعاون کونسل Gulf Co-operation Council (GCC) کا قیام مئی 1981ء میں عمل میں لائے۔

عراق اور کویت کے درمیان اختلافات کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ آزاد کویت کی تاریخ ہے۔ 19 جون 1961ء کو برطانیہ کی جانب سے کویت کی مکمل آزادی کے اعلان کے ایک ہفتہ کے اندر ہی عراق نے کویت پر اپنا ادعا پیش کیا۔ عراق کا یہ استدلال تھا کہ، چونکہ کویت ترکی کی سلطنت عثمانیہ کا ہی ایک حصہ تھا، چنانچہ نسلی، جغرافیائی اور سماجی طور پر عراق اور کویت ایک ہی ملک تھے جسے برطانیہ نے اپنے مفادات کے لیے تقسیم کیا ہے۔ عراق کے اس ادعا کے ساتھ ہی کویت کی نئی حکومت نے برطانیہ سے فوجی

مدد طلب کی۔ تب سے 1971ء میں برطانیہ کے خلیج فارس کے تخلیہ تک کویت برطانیہ کی حکمت عملی میں ترجیحی مقام رکھتا تھا۔ اسکے بعد سے یہ ذمہ داری امریکہ نے سنبھال لی ہے۔ 1961ء میں عرب لیگ نے اپنی افواج کو کویت کی سرحدات پر متعین کر کے دونوں کے درمیان ثالثی کا رول ادا کیا۔ اور آخر کار عراق کے ادعا کو رد کرتے ہوئے کویت کی آزادانہ حیثیت کو تسلیم کرلیا اور عرب لیگ کی رکنیت دی۔ 1963ء میں کویت کو اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل ہونے کے بعد عراق بھی کویت کو تسلیم کرلیا۔ لیکن 1973ء میں عراق کویت کی سرحدات پر اس وقت حملہ کیا جب کہ کویت عراق کو اس کی پٹرولیم کمپنی کو قومیانے سے ہونے والے نقصانات کی پابجائی کے طور پر پچاس ملین دینار دینے سے انکار کیا۔ اس وقت عراق یہ چاہتا تھا کہ کویت اس کثیر رقم کے عوض خلیج فارس کے شمال مغرب میں واقع جزیرہ بوبیان اور وربا اس کے حوالے کردے یا انھیں استعمال کی اجازت دے جو کہ عراق کے لیے تجارتی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتے ہیں۔ کویت عراق کے ان ہی عزائم سے متاثر ہو کر عراق کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایران عراق جنگ کی آٹھ سالہ طویل مدت کے دوران عراق کی بھرپور معاشی مدد کرتا رہا۔

لیکن 17 جولائی 1990ء کو عراقی انقلاب کی 22ویں سالگرہ تقاریب کے موقع پر صدر صدام حسین نے کویت پر اس کے علاقہ سے گذشتہ دس سال سے تیل کے سرقہ کا الزام عائد کیا۔ اس کے ساتھ ہی کویت اور متحدہ عرب امارات پر امریکہ کے اشاروں پر بین الاقوامی منڈیوں میں تیل کی قیمتوں میں کمی کرنے کا الزام عائد کیا جس سے جنگ سے متاثرہ عراقی معیشت کو سالانہ ایک بلین ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ عراق اور کویت کے درمیان متنازعہ سو میل سرحد پر موجود رومیلا تیل کا چشمہ دو میل کویت کے علاقہ کا بھی احاطہ کرتا ہے' عراق نے یہ الزام لگایا کہ کویت 1980ء سے عراق کی ایران کے ساتھ جنگ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس چشمے سے تیل چوری کرتا رہا ہے جس سے عراق کو 2.4 بلین ڈالر کا الگ نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس طرح وہ عراق کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا مرتکب ہوا۔ اس مسئلہ کے پر امن حل کی مصر اور سعودی عرب کی ناکام کوششوں کے بعد 2 اگست 1990ء کو عراقی افواج نے کویت پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کرلیا۔ ایک ''آزاد عبوری حکومت'' کے قیام کا صدام حسین نے اعلان کیا اور بالآخر کویت کے عراق میں انضمام کا اعلان کیا گیا۔

ساری دنیا نے عراق کے اس حملہ کی مذمت کی۔ علاقائی سطح پر اس بحران کے حل میں عرب ممالک اور غیر جانبدار تحریک کی ناکامی سے امریکہ بین الاقوامی صورت حال کا استحصال کرتے ہوئے ''عالمی پولیس'' کا رول ادا کرتے ہوئے 16 جنوری 1991ء کویت کی آزادی کے لیے عراق پر حملہ

کردیا۔اس حملہ کو Operation Desert Storm کا نام دیا گیا۔اس میں 28 ممالک کے تقریباً 6,90,000 افواج حصہ لیے۔اس 42 روزہ جنگ کے دوران امریکہ عراق کے شہروں اور فوجی تنصیبات کو اپنے خطرناک میزائل کے ذریعہ نشانہ بنایا۔آخری سو گھنٹوں کی زمینی جنگ کے بعد امریکہ عراق کو کویت سے نکال باہر کرکے کویت کی آزادی و سالمیت کی بحالی میں کامیاب ہوا۔

اس جنگ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ امریکہ اقوام متحدہ کو اپنا آلہ کار بنا کر کویت سے عراق کو نکال باہر کرنے کی مہم کی سرپرستی کیا۔اقوام متحدہ کی تمام قراردادیں امریکہ کی مرضی ومنشاء کے مطابق تھیں۔اقوام متحدہ کی قرارداد 678 نہ تو اقوام متحدہ کی فوجی کمان میں افواج کو رکھنے اور نہ ہی اس کی فوجی کمیٹی کو کسی طرح کی جارحیت کا کوئی اختیار دی تھی۔اس کے باوجود امریکہ اس کا استحصال کرتے ہوئے عراق کے خلاف فوج کشی کیا۔جنگ کے بعد کی قرارداد 687 محض کویت کی آزادی کو تسلیم کرنے کے لیے تھی۔اس قرارداد کی تیاری کے وقت عراق سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا اور نہ ہی کویت کے خلاف عراقی شکایات کو سنا گیا۔1963ء کی عراق کویت سرحد کے مطابق، سرحدات کی ازسرنو حد بندی کی سلامتی کونسل نے سفارش کی اور عراقی انکار کی صورت میں اسے عواقب ونتائج کی دھمکی دی گئی۔

اس جنگ نے یہ ثابت کردیا کہ امریکہ میں اقوام متحدہ کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر اقدامات کرنے اور اقوام متحدہ کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کی صلاحیت ہے اور ساری دنیا کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے لیے مستقبل کی منصوبہ بندی میں مصروف ہے۔جس کا اظہار امریکی صدر کے اعلان کردہ ''نئے عالمی نظام'' کے تصور سے بھی ہوا۔کویت کے تخلیہ کے بعد اقوام متحدہ کی جانب سے عراق کی معاشی ناکہ بندی کی گئی اور قرارداد نمبر 688 اور 715 کے ذریعہ جنوبی عراق کو عراقی طیاروں کے لیے ''غیر اڑان منطقہ'' (No Fly Zone) قرار دیا گیا۔جب کہ قرارداد 687 کے ذریعہ شمالی عراق کو جہاں کُرد اکثریت ہے' No Fly Zone قرار دیا گیا تھا۔جنوری 1993ء میں اس قرارداد کی خلاف ورزی پر امریکہ، برطانیہ وفرانس کی فوجوں نے عراقی میزائلی ٹھکانوں پر بمباری کی۔1991ء میں منظورہ سلامتی کونسل کی قرارداد 715 کے ذریعہ عراق کے نیوکلیر اور کیمیاوی اسلحہ پر پابندی کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ کی جانب سے وقتاً فوقتاً معائنہ اور ترک اسلحہ کے اقدامات کی گنجائش فراہم کی گئی جسے عراق اپنے اقتدار اعلیٰ میں مداخلت کہتے ہوئے رد کردیا اور 1992ء میں امریکی معائنہ کرنے والی ٹیم کو عراق میں داخل ہونے سے روک دیا۔لیکن بالآخر نومبر 1993ء میں اسے اقوام متحدہ کے طویل مدتی ترک اسلحہ کے اقدام کو قبول کرنا پڑا۔

اقوام متحدہ کی خصوصی معائنہ کمیٹی UNSCOM 1994ء سے عراقی اسلحہ کا معائنہ اور اسے

ضائع کرنے کا کام کر رہی ہے۔ لیکن سال 1998ء میں اس کام میں پیدا ہوئے تعطل کو بنیاد بنا کر امریکہ عراق پر پھر ایک بار ڈسمبر 1998ء میں حملہ کیا اور اسے آپریشن ڈیزرٹ فاکس کا نام دیا۔ عراقی عوام پر عائد تحدیدات کی وجہ سے عوام سنگین مسائل سے دوچار ہیں۔ 1996ء سے اقوام متحدہ نے تیل برائے غذا پروگرام کے تحت عراق کو تیل برآمد کرنے کی محدود اجازت دی ہے۔ بشمول کویت اور سعودی عرب کئی عرب ممالک عراق کے خلاف عائد تحدیدات کی برخواستگی کے حامی ہیں۔ یکم ڈسمبر 2001ء سے شروع ہونے والے چھ ماہی پروگرام تیل برائے غذا پروگرام کے 30 مئی 2002ء میں خاتمے کے بعد یکم جون 2001ء سے امکان ہے کہ عراق کے خلاف تحدیدات اٹھالی جائیں گی۔

نیا عالمی نظام New World Order

1990ء میں تیزی سے بدلتی دنیا اور سویت یونین کے کمزور موقف کو دیکھتے ہوئے امریکی صدر جارج بش سینئر نے 11 ستمبر 1990ء کو امریکی کانگریس کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ایک ''نئے عالمی نظام'' کا نعرہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سرد جنگ ختم ہو چکی ہے اور اب عالمی طاقت کی مسابقت میں امریکہ کا کوئی ثانی نہیں۔ چنانچہ دو قطبی نظام ختم ہو چکا ہے اور اب دنیا امریکہ کے یک قطبی نظام کی گرفت میں ہے۔ بین الاقوامی ادارے امریکہ کی مرضی کے تابع ہوں گے اور ڈالر کی برتری ہوگی۔ خلیجی جنگ کے بعد جو صورت حال سامنے آئی' اس سے یہی تاثر ملتا ہے کہ ایک نئے عالمی نظام کا آغاز نہیں ہوا بلکہ ایک نئی عالمی بدنظمی پیدا ہوئی ہے جس میں امریکہ کو اپنی من مانی کرنے کی چھوٹ ہے۔ امیر اور غریب ممالک میں نئی دوریاں پیدا ہوں گی اور امریکہ اور اس کے حلیف' عالمی مالیاتی اداروں کو اپنے استحکام اور خوشحالی کے لیے استعمال کریں گے۔ دو قطبی نظام کے خاتمہ سے یوروپ کا ''طویل امن'' بھی ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ بوسنیا، سربیا، البانیہ، مقدونیہ وغیرہ میں بے چینی اس کی مظہر ہے۔

نئے عالمی نظام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حکمت عملی کے نیوکلیر ہتھیاروں کی جگہ روایتی ہتھیاروں کی اہمیت ہوگی۔ سرد جنگ کے دوران باہمی تباہی کا یقین **Mutual Assured Destruction(MAD)** دو عظیم طاقتوں کو اسلحہ کے استعمال سے روکے رکھا تھا۔ لیکن اب سویت یونین کے خاتمہ سے نیوکلیر اسلحہ کی دوڑ میں کمی آگئی اور اس کی جگہ پھر ایک بار روایتی اسلحہ نے لے لی ہے۔ اس کے علاوہ، نئے عالمی نظام میں ممالک کے درمیان سیاسی صف بندی کی جگہ نئی عالمی معاشی صف بندیاں ہونے لگی ہیں اور اب سیاسی وفوجی معاملات کی جگہ معاشی امور و مسائل اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔

یک قطبی نظام Uni-polarity

سویت یونین کے خاتمہ سے بین الاقوامی تعلقات میں طاقت کا توازن مکمل طور پر امریکہ کے پلڑے میں جا چکا ہے۔ پوری دنیا پر امریکی غلبہ ہے۔ اب امریکہ ہی عالمی معاملات کی عملاً نگرانی کر رہا ہے۔ اقوام متحدہ اور اس کے ادارے امریکی مفادات کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ امریکہ اپنی مرضی کو منوانے کی برتر اہلیت کا عملی مظاہرہ عراق اور افغانستان میں کیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امریکہ کے مدمقابل کوئی طاقت نہیں ہے۔ یک قطبی نظام میں طاقت کا ایک ہی مرکز ہوتا ہے اور اسے متوازن کرنے کے لیے کوئی دوسری طاقت نہیں ہوتی۔ چونکہ امریکہ کے مدمقابل کوئی طاقت نہیں ہے اس لیے آج بین الاقوامی تعلقات میں یک قطبی نظام کا دور دورہ ہے۔ اگرچیکہ امریکی طاقت کے مدمقابل کوئی واحد برتر طاقت نہیں ہے، لیکن چین اور جاپان امریکی حکمرانی کے راستے میں ایک رکاوٹ ہیں، ہندوستان بھی واحد طاقت کی عالمی حکمرانی کو اصولاً تسلیم نہیں کرتا۔ اسی لیے بعض ماہرین کے مطابق یک قطبی نظام ایک مختصر سی کیفیت کا نام ہے اور دنیا تیزی سے ہمہ قطبی نظام (Multi-Polarity) کی طرف جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ امریکی غلبہ تیسری دنیا کے کمزور ممالک پر ہے جب کہ یوروپ امریکی تسلط سے آزاد ہے۔ اسی لیے دہشت گردی کے خلاف افغانستان میں امریکی اقدامات میں برطانیہ کے سوا کوئی دوسرا یوروپی ملک حصہ نہیں لیا۔ فرانس اور جرمنی امریکی اقدامات کی اکثر مخالفت کرتے آئے ہیں۔ 1991ء میں عراق کے خلاف امریکی اقدامات کی دنیا اس لیے حمایت کی گئی تھی کیوں کہ کویت پر عراق کا قبض غیر قانونی اور غیر اصولی تھا۔ اس کے علاوہ اس علاقہ میں نکلنے والے تیل پر ساری دنیا کا دار و مدار ہے۔ اسی لیے عراق کے خلاف بعد کے امریکی اقدامات کی ساری دنیا حامی نہیں ہے۔ فرانس اور روس عراق کے خلاف تحدیدات کو ختم کرنے کے لیے امریکہ پر دباؤ ڈال رہے ہیں اور وہ عراق کے خلاف مزید کسی جارحیت کے خلاف ہیں۔

امریکی حکمرانی کے خلاف عالمی رائے عامہ دن بدن وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی، غیر جانبدار تحریک اور دوسرے بین الاقوامی فورم امریکی حکمرانی کے خلاف ہیں اور اس کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ خود امریکی رائے عامہ دنیا میں امریکی اقدامات کے خلاف ہے۔ عراق اور افغانستان میں امریکی اقدامات کو امریکی عوام نے پسند نہیں کیا۔ ساری دنیا میں امریکی جارحیت اور برتری کے خلاف اکثر احتجاجی مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ مشہور امریکی مفکر نوم چومسکی (Noam Chomsky) نے افغانستان پر امریکی حملوں کو "طاقتور کی دہشت گردی" سے تعبیر کیا ہے[1]۔ امریکہ کی

1. ٹائمس آف انڈیا' 12 نومبر 2001ء حیدرآباد۔ صفحہ 12

گرتی معیشت امریکی برتری کے لیے ایک چیلنج ہے۔ چنانچہ سال 2000ء میں امریکی معیشت کی ترقی کی رفتار سالانہ 5% سے گھٹ کر 2.5% ہوگئی۔ تیزی سے گرتی اسلحہ منڈی کی وجہ سے امریکہ کا اسلحہ بازار ٹھنڈا پڑ گیا جس سے اس کی معیشت پر دوررس اثرات پڑ رہے ہیں۔ امریکہ کے بھاری دفاعی اخراجات بھی مستقبل میں اس کی برتری کے لیے ایک چیلنج ہیں۔ چنانچہ افغانستان میں امریکی آپریشنس کے پہلے ایک ماہ کے دوران امریکہ کو ایک بلین ڈالر کا خرچ برداشت کرنا پڑا۔ اس آپریشن سے امریکی معیشت پر پڑنے والے ذیلی منفی اثرات اس کے علاوہ ہیں۔

امریکی عالمی حکمرانی کے خلاف سب سے بڑی طاقت اور رکاوٹ عالمی دہشت گردی ہے۔ خلیجی جنگ کے بعد سے مسلسل امریکہ دہشت گردوں کے نشانہ پر ہے۔ چنانچہ فبروری 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر (WTC) کے پارکنگ گیرج میں ہوئے بم دھماکے میں چھ لوگ مارے گئے اور ایک ہزار زخمی ہوئے۔ اپریل 1995ء میں اوکلاہاما شہر میں ایک فیڈرل عمارت میں بم دھماکہ میں 168 لوگ مارے گئے اور پانچ سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اس دھماکہ کے لیے ذمہ دار سابق امریکی سپاہی Timothy Mcveigh کو سال 2001ء میں سزائے موت دیدی گئی۔ نومبر 1995ء میں سعودی عرب کے شہر ریاض میں امریکی فوجی ہیڈ کوارٹر میں کار بم دھماکے میں پانچ امریکی مارے گئے۔ جون 1996ء میں سعودی عرب دہران میں ٹاور کے باہر سڑک بم دھماکے میں 19 امریکی مارے گئے۔ 7 اگست 1998ء میں کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں کے باہر ہوئے کار بم دھماکوں میں 24 لوگ مارے گئے اور ان حملوں کے لیے اسامہ بن لادن کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا۔ 12 اکتوبر 2000ء کو یمن کی بندرگاہ عدن پر امریکی جہاز پر بمباری کے نتیجے میں 17 امریکی مارے گئے اور ان حملوں کے لیے بھی اسامہ بن لادن کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا۔ 11 ستمبر 2001ء کو نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن میں محکمہ دفاع کے صدر دفتر ''پنٹگان'' پر ہوائی جہاز کو ٹکرا کر کیے گئے دہشت گرد حملے تاریخ کے سب سے بھیانک حملے تھے۔ اس طرح امریکی طاقت و برتری کو غیر مملکتی دہشت گرد گروہوں سے مقابلہ درپیش ہے امریکہ گروہوں کو ہی جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کمر بستہ ہو کر افغانستان کو نشانہ بنایا اور دنیا میں ہر دہشت گرد ٹھکانوں کو نشانہ بنانے کا اعلان کیا۔

ہمہ قطبی نظام Multipolarity

اس سے مراد وہ بین الاقوامی نظام ہے جس میں طاقت کے کئی مراکز ہوتے ہیں۔ اس میں طاقت کے لیے رسہ کشی مساوی قوتوں کے درمیان ہوتی ہے۔ چنانچہ عصری بین الاقوامی صورت حال کا

تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ مستقبل کی دنیا کے فیصلے پانچ بڑی قوتوں امریکہ، روس، متحدہ یوروپ، جاپان اور چین کے ہاتھوں میں ہونگے اور یہ پانچ باہمی تعلق وتعاون کے ذریعہ کام کرینگے ۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور سویت یونین کے درمیان وسیع تر ہم آہنگی پائی جارہی ہے اور چین امریکہ کے تعلقات میں بھی استحکام پیدا ہوگیا ہے۔ دوسری طرف یوروپ' یوروپین یونین کی شکل میں تجارت معیشت اور عالمی سیاست کے میدانوں میں امریکہ کے لیے سب سے بڑا حریف ثابت ہوگا۔ جب کہ جاپان پہلے ہی معاشی طاقت کے طور پر عالمی سیاست میں اثر رکھتا ہے اور اب وہ اپنی فوجی طاقت کی طرف بھی بھر پور توجہ دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ عالمی اقدامات کے لیے طاقتور قوموں خصوصاً روس، چین، یورپ اور جاپان کی تائید اور حمایت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ افغانستان پر حملوں کے لیے ان طاقتوں کی اخلاقی تائید اور برطانیہ کی عملی مدد حاصل کیا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ امریکہ اب اپنی طاقت کے حدود سے واقف ہوگیا ہے اور اپنے اقدامات میں عالمی رائے عامہ کی وسیع تر تائید حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اپارتھائیڈ کا خاتمہ The End of Aparthied

رنگ ونسل کے امتیاز کی پالیسی کو اپارتھائیڈ کہا جاتا تھا جسے جنوبی آفریقہ کی سفید فام حکومت سیاہ فام آبادی کے خلاف روا رکھی تھی۔ برطانیہ کی چار نو آبادیات کو ملا کر یونین آف ساوتھ آفریقہ کا قیام 1910ء میں عمل میں آیا تھا۔ 1961ء سے اسے ریپبلک آف ساوتھ آفریقہ کہا جانے لگا۔ ملک کی 74% آبادی مختلف قبائل پر مشتمل سیاہ فام آفریقیوں پر مشتمل تھی جب کہ سفید فام حکمراں طبقہ صرف 15% تھا۔ سیاہ فام آبادی کے ساتھ امتیازی سلوک کی وجہ سے جنوبی آفریقہ عالمی سماج سے الگ تھلگ تھا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنی کئی ایک قراردادوں کے ذریعہ جنوبی آفریقہ کی سفید فام حکومت سے اپارتھائیڈ کی پالیسی کو ختم کرنے کی اپیل کی۔ چنانچہ فبروری 1990ء میں جنوبی آفریقہ کی سفید فام حکومت نے آفریقن نیشنل کانگریس (ANC) پر عائد 30 سالہ امتناع کو ختم کرتے ہوئے اس کے سربراہ نیلسن منڈیلا کو قید سے رہا کیا۔ ڈسمبر 1991ء سے ایک نئے جمہوری جنوبی آفریقہ اور اس کے نئے دستور کی تیاری کے لیے سفید فام حکومت اور تمام نسلی گروہوں کے درمیان بات چیت کا آغاز ہوا' اور پہلی مرتبہ مارچ 1992ء میں ایک ہمہ نسلی عبوری حکومت قایم ہوئی۔ آفریقن نیشنل کانگریس اور حکومت کے درمیان مارچ 1993ء سے بات چیت کے نتیجہ میں 27 اپریل 1994ء کو نومبر 1993ء کے نئے دستور کے مطابق پہلے عام انتخابات منعقد ہوئے اور ANC اقتدار پر آئی۔ نیلسن منڈیلا آزاد جنوبی آفریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر منتخب ہوئے جس سے 300 سالہ سفید فام اقتدار کا خاتمہ ہوا اور جنوبی آفریقہ عالمی برادری میں

دوبارہ شامل ہو گیا۔اس سے نسلی امتیازات کے دور کا خاتمہ ہوا۔

دہشت گردی Terrorism

بین الاقوامی تعلقات میں دہشت گردی کا عنصر کوئی نیا نہیں ہے۔ اگرچیکہ اس کی شدت میں گذشتہ ایک دہے کے دوران اضافہ ہوا ہے۔ عالمی سیاست میں یہ گذشتہ ایک صدی سے جاری عمل ہے۔ یہ عالمی و داخلی سیاست میں زوال پذیر قدروں کی نمائندگی کرتی ہے۔ دہشت گردی کی کوئی خاص شکل اور وضع نہیں ہوتی بلکہ صرف تشدد اس کی اہم و مرکزی خصوصیت ہوتی ہے۔ دہشت گردی مسلح گروہوں کی جانب سے معصوم انسانوں کے خلاف اسلحہ کا استعمال کرتے ہوئے حکومتوں پر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دباؤ ڈالنا ہے۔ اس طرح دہشت گردی مقصد کے حصول کا ایک غیر اصولی، غیر شریفانہ اور ناجائز طریقہ ہے۔ اس کے پیچھے کارفرما مقاصد میں سیاسی، سماجی اور معاشی ناانصافیوں کے خلاف عوام اور حکومتوں کو توجہ دلانا ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ اس کی نوعیت انتقامی کارروائی کی ہوتی ہے اور یہ انتہائی بدترین اور سفاکانہ ہوتی ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے سرگرداں مسلح گروہ وقفہ وقفہ سے اپنی بے رحمانہ کارروائیوں کے ذریعہ نفس مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں۔ امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے مطابق دہشت گردی ''سیاسی مقاصد پر مبنی منصوبہ بند تشدد ہے جسے غیر مسلح ٹھکانوں (Targets) کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے جسے ذیلی قومی گروہ (Sub-National Groups) یا خفیہ مملکتی ایجنٹ انجام دیتے ہیں جس کا مقصد عوام کی توجہ حاصل کرنا اور ان پر اثر انداز ہونا ہوتا ہے''۔ دہشت گردی کے ماہر Brian Jenkins کا کہنا ہے کہ ''دہشت گرد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مارنا نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں''[2]۔ وہ جانتے ہیں کہ ہزاروں شہری آبادی کے مارے جانے سے انکی سیاسی و طبعی بقاء کے امکانات موہوم ہو جاتے ہیں اور وہ عوامی تائید سے محروم ہو جاتے ہیں۔ دہشت گردی ایک چھپی جنگ ہے جس میں دشمن سامنے اور واضح نہیں ہوتا۔ اس میں بڑے پیمانے پر دہشت گردی کا خوف ہمیشہ لگا رہتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کہاں کیا اور کیسے ہوگا۔ دہشت گردی ظاہری علامتوں سے زیادہ ذہنی و دماغی کیفیت اور احساس محرومی ہے[3]۔ دہشت گردی انسانیت کے خلاف ایک گھناؤنا جرم ہے جسے ماہرین دوسرے طریقوں سے جاری سیاست قرار دیتے ہیں۔ امریکی سرکاری دستاویزات کے مطابق ''تخریب، جبر یا خوف'' کے ذریعہ سیاسی مذہبی یا نظریاتی مقاصد کے حصول کے لیے تشدد کا شماریاتی (Calculated) استعمال یا تشدد کی دھمکی دہشت گردی

---

2. سلیم قدوائی ''امریکہ اور بین الاقوامی دہشت گردی'' Journal of Peace Studies' جولائی/اگست 1999ء صفحات 32-26
3. ڈاکٹر عبدالقیوم ''بین الاقوامی دہشت گردی اور امریکہ'' روزنامہ سیاست حیدرآباد 21 اکتوبر 2001ء (سنڈے ایڈیشن) صفحہ 3

ہے[4]۔ گذشتہ ایک صدی کے دوران دہشت گردی کی لہر بتدریج بڑھتی گئی اور آج یہ عالمی سیاست میں اہم ترین عنصر بن گئی ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل جون 1914ء میں آسٹریا ہنگری کے شہزادہ اور اس کی بیوی کا شہر ساراجیو (Sara Jevo) میں قتل، جرمنی میں نازی بربریت اور اس کے گیس چیمبر، 1947ء میں برطانوی کابینی وزراء کو بھیجے گئے لفافہ بم (Letter Bombs)، فلسطینیوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے 11 ڈسمبر 1947ء کو حیفہ میں کیے گئے بم حملے، یروشلم میں عربوں کی ایک ہوٹل کو بموں سے اڑا دینا، اپریل 1948ء میں یروشلم کے قریب فلسطینی دیہات Deir Yassin کا قتل عام، 17 ستمبر 1948ء کو اقوام متحدہ کے فلسطینی مصالحت کار Bernadette اور ان کے مددگار کرنل انڈرے کا قتل، 1950ء میں عراق میں اسرائیلی ایجنسیوں کی جانب سے بغداد میں کیے گئے سلسلہ وار بم دھماکے عرب ممالک میں اسرائیلی انٹلی جنس ایجنسی موساد کی کارروائیاں، 1979ء میں اسلامی طلبہ ایران کا امریکی سفارتخانے کو یرغمال بنالینا، اپریل 1983ء میں بیروت میں امریکی سفارت خانہ کو کار بم سے اڑا دینا، ڈسمبر 1988ء میں Pan Am بوئینگ 747 لاکربی اسکاٹ لینڈ کی فضاؤں میں دھماکہ سے پھٹ پڑنا وغیرہ اہم دہشت گرد کارروائیاں ہیں۔ لیکن سب سے بدترین دہشت گرد کاروائی منگل 11 ستمبر 2001ء کی جس میں دہشت گرد امریکی مسافر بردار ہوائی جہازوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے نیویارک کے World Trade Centre سے ٹکرائے اور ایک جہاز امریکی محکمہ دفاع کے ہیڈکوارٹر پنٹگان پر گرایا گیا جب کہ ایک جہاز پنی سلوانیا میں گر پڑا۔ ان تمام کارروائیوں میں ہزاروں لوگ مارے گئے اور امریکی معیشت بری طرح متاثر ہوئی۔

سابق امریکی وزیر خارجہ (سکریٹری آف اسٹیٹس) محترمہ میڈیلین البرائیٹ نے دہشت گردی کو ''مستقبل کی جنگ'' قرار دیا ہے۔ نظریاتی طور پر دہشت گردی چار طرح کی ہوتی ہے 1. عام تباہی کی دہشت گردی 2. مملکتی دہشت گردی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کی دہشت گردی 3. چھوٹے پیمانے پر حیاتیاتی دہشت گرد حملے اور 4. سوپر دہشت گردی۔ بڑے پیمانے پر کیمیائی و حیاتیاتی ہتھیاروں کے استعمال کے ذریعہ انسانی جانوں کے اتلاف کی کوشش سوپر دہشت گردی ہے۔ جب کہ مملکت اور اس کی پولیس و مشنری کی جانب سے کی جانے والی انسانی حقوق کی پامالی مملکتی دہشت گردی ہے۔



4. محمود بن محمد "The Anatomy of Terrorism" روزنامہ دی ہندو Open Page' 4 ڈسمبر 2001ء صفحہ 1

حصہ پنجم

عالمی امن کے مسائل اور خارجہ پالیسی

Problems of World Peace and Foreign Policy

باب 18

ترکِ اسلحہ اور تخفیفِ اسلحہ
Disarmament and Arms Control

گذشتہ ایک صدی کے دوران انسان نے سائنس وٹکنالوجی میں جو ترقی کی ہے اس کے نتیجہ میں جنگی آلات و اوزار اور جنگ کے طریقوں میں بھی تبدیلی آئی ہے جس سے کرہ ارض پر انسانیت کے وجود کو خطرات لاحق ہوگئے ہیں۔ بدلتے وقت کے ساتھ نئے نئے آلات حرب انسانی وجود کے لیے مزید خطرات پیدا کرتے جارہے ہیں۔ ایک طرف ممالک اپنی سلامتی و حفاظت کے نام پر ہتھیار پیدا کرتے اور خریدتے جاتے ہیں تو دوسری طرف وہی ہتھیار سلامتی اور بقاء کے لیے خطرات کا باعث بنتے جارہے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں خصوصاً ایٹمی اسلحہ کے استعمال سے جو تباہی ہوئی ہے اس سے اسلحہ کو ترک کرنے اور امن کے لیے مساعی جاری رکھنے کی ضرورت پر انسانی توجہ مرکوز ہوگئی۔ مجلس اقوام اور اقوام متحدہ دونوں بین الاقوامی اداروں نے ترکِ اسلحہ کے لیے اقدامات کیے۔

اسلحہ انسانی ضروریات کا ایک حصہ ہیں۔ ہر دور میں انسان ان کی ضرورت محسوس کیا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے تباہ کن ہتھیاروں نے ترکِ اسلحہ کی ضرورت واحساس کو اجاگر کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کو ہتھیاروں کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی ہے۔ مفکرین کے مطابق انسان کی جھگڑالو فطرت ہتھیاروں کی متقاضی ہوتی ہے۔ جب کہ ایک دوسرے مکتب فکر کے مطابق انسان ہتھیاروں کی موجودگی کی وجہ سے جنگ لڑتا ہے۔ چنانچہ ہتھیار ہی نہ ہوں تو جنگ کے امکانات بھی ختم ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ صحیح نہیں ہے جنگ ہتھیاروں کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ انسان جنگ کے لیے ہتھیاروں کو تیار کرتا ہے چونکہ جنگ انسانی ذہن و دماغ کی پیداوار ہوتی ہے۔ بہرکیف جنگ اور ہتھیار ایک دوسرے کا لازمہ ہیں اور سائنسی ترقی نے ہتھیاروں کو تباہ کن شکل دیدی ہے اس لیے آج ترکِ اسلحہ کی ضرورت کو زیادہ محسوس کیا جارہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران 16 جولائی 1945ء کو امریکہ دنیا کا پہلا نیوکلیر تجربہ کیا تھا اس کے بعد 1949ء میں سویت یونین، 1953ء میں برطانیہ، 1960ء میں فرانس اور 1964ء میں چین نے نیوکلیر تجربات کیے۔ 1974ء میں ہندوستان کے پہلے نیوکلیر تجربہ کے بعد پاکستان

نیوکلیر صلاحیت کے حصول میں مسلسل لگا رہا اور بالآخر مئی 1998ء میں وہ بھی نیوکلیر ملک بن گیا۔ اس طرح اب سات نیوکلیر ممالک ہیں جب کہ نیوکلیر دہلیز (Nuclear Threshold) پر کھڑے ممالک کی فہرست لمبی ہے جو مستقبل میں کبھی بھی نیوکلیر تجربات کر کے نیوکلیر ملک بن سکتے ہیں۔ اس طرح نیوکلیر صلاحیت کے پھیلاؤ اور دشمن پر فتح پانے کے لیے ان کے استعمال کے بڑھتے رجحان سے عالمی امن اور انسانی وجود کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔

دنیا کا فوجی خرچ (بلین / ملین ڈالر میں)

سال:	1999*	1990	1980	1978	1948
	808,546m$	1000b$	500b$	380b$	64.7b$

*ملٹری بیلنس 2000-2001ء صفحہ 302

بڑی طاقتوں کے نیوکلیر اسلحہ

سال	تعدادِ اسلحہ	ممالک
1945ء	2	صرف امریکہ
1949ء	303	امریکہ اور سویت یونین
1964ء	37,015	پانچ بڑی طاقتیں
1986ء	69,478	پانچ بڑی طاقتیں
2000ء	31,535	پانچ بڑی طاقتیں

Surce : Bulleten of Atomic Scientsts 2000

عموماً ترکِ اسلحہ (Disarmament)، تخفیفِ اسلحہ (Arms Control) یا تحدیدِ اسلحہ (Arms Limitation) کے الفاظ کو ایک دوسرے کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ ترکِ اسلحہ سے مراد اسلحہ کو ختم کرنا ہے۔ امن کے لیے ترکِ اسلحہ کا تصور ایک قدیم تصور ہے جس میں ہتھیاروں کی تخفیف تحدید اور ان کو ختم کرنا شامل ہے۔ روزویلٹ کے مطابق "ترکِ اسلحہ عالمی سطح پر اسلحہ کو اس حد تک کم کرنا ہے کہ کوئی بھی قوم اپنے پڑوس کے خلاف یا دنیا میں کہیں بھی جارحیت کے موقف میں نہ ہو"۔ اس سے مراد عام طور پر فوجی اسلحہ اور ان کی تیاری پر امتناع ہے اور اس میں روایتی و نیوکلیر اسلحہ دونوں شامل ہیں۔ اپنے مجموعی اور مطلق معنوں میں ترکِ اسلحہ سے مراد عالمی سطح پر تمام قسم کے اسلحہ اور افواج کو ترک کرنا ہے۔ چنانچہ مارگنتھو کے

مطابق ترکِ اسلحہ سے مراد اسلحہ کو ترک یا ختم کرنا ہے جب کہ تخفیف اسلحہ سے مراد فوجی استحکام کو حاصل کرنے کے لیے اسلحہ کی دوڑ کو منضبط (Regulate) کرنا ہے۔ چنانچہ تخفیف اسلحہ ایک وسیع پالیسی ہے جس کا مقصد اسلحہ کی تیاری، تعیناتی، خرید و فروخت اور استعمال کو منضبط کرنا ہے۔ Charles W.Kegley کے الفاظ میں ترکِ اسلحہ کے مقابلہ میں تخفیف اسلحہ کم جوشیلا تصور ہے چوں کہ اس میں اسلحہ کو ختم کرنے کی بات نہیں کی جاتی بلکہ اس کا مقصد اسلحہ کو قواعد و طریقہ میں ڈھالتے ہوئے ان پر نگرانی رکھنا ہے۔ ممالک باہمی طور پر معاہدات کے ذریعہ اپنے اسلحہ کو یا تو محدود رکھتے ہیں یا ان کے استعمالات پر پابندیوں کے لیے رضامند ہوتے ہیں۔ ترکِ اسلحہ کے اقدامات کے مقابلے میں تخفیف یا تحدید اسلحہ کو زیادہ کامیابی ملی ہے۔ مکمل ترکِ اسلحہ کا تصور محض ایک وہم ہے۔ یہ ایک ایسا مثالی تصور ہے جو عملاً ناممکن ہے۔

ترکِ اسلحہ کی قسمیں Types of Disarmament

1. رضاکارانہ اور لازمی Voluntary and Compulsory

ترکِ اسلحہ رضاکارانہ یا لازمی ہوسکتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ترکِ اسلحہ کے لیے کی گئی کوششیں رضاکارانہ تھیں جس میں ترکِ اسلحہ کے لیے دیے گئے پروگراموں کو قوموں نے یا تو قبول کیا یا پھر رد کیا۔ ترکِ اسلحہ سے متعلق سویت پروگراموں کو امریکہ اور امریکی پروگراموں کو سویت یونین رد کرتے رہے۔ جب کہ بعض معملات میں ترکِ اسلحہ لازمی ہوجاتا ہے۔ جیسے پہلی جنگ عظیم کے بعد 1919ء میں کیے گئے معاہدہ ورسلیز میں جرمن افواج اور اسلحہ کی تعداد کو گھٹا دیا گیا تھا۔ اسی طرح 1922ء کے واشنگٹن معاہدہ کے بعد امریکہ و برطانیہ نے جاپان کو ترکِ اسلحہ کے لیے مجبور کردیا تھا۔

2. قِسمی اور عددی Qualitative and Quantitative

قِسمی ترکِ اسلحہ کا تعلق ایک خاص قسم کے اسلحہ کو ترک کرنے سے ہے۔ جیسے PTBT، NPT، SALT، INF معاہدات کا مقصد خصوصی نیوکلیر اور تباہ کن قسم کے اسلحہ میں کمی کرنا تھا۔ جب کہ عددی ترکِ اسلحہ کا مقصد تمام قسم کے اسلحہ کو ختم کرنا ہے۔ اس میں اسلحہ کی تخصیص کے بغیر تمام قسم کے اسلحہ کو ترک کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔

3. مقامی اور عام Local and General

جب چند ایک اقوام اسلحہ میں کمی کے اقدامات کرتے ہیں تو یہ مقامی یا محدود ترکِ اسلحہ

ہے اس کے برعکس عام ترکِ اسلحہ میں اقوام کی بڑی تعداد شامل ہوتی ہے۔ چنانچہ 1817ء میں امریکہ اور کینیڈا کے درمیان طئے پایا ترکِ اسلحہ کا Rush-Bagot معاہدہ[1] مقامی یا محدود ترکِ اسلحہ کی مثال ہے۔ جب کہ مجلس اقوام اور اقوام متحدہ کی جانب سے کیے گئے ترکِ اسلحہ کے اقدامات اور عالمی کانفرس عام ترکِ اسلحہ کی مثالیں ہیں۔

4. عمومی یا مکمل General or Comprehensive

عمومی ترکِ اسلحہ وہ ہے جس میں تمام یا زیادہ تر بڑی طاقتیں اس میں شریک تو ہوتی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ تمام اسلحہ کو ختم کرنے کے لیے راضی ہوں۔ اس کے برعکس مکمل ترکِ اسلحہ میں جنگ کے تمام طریقوں کو ترک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مکمل ترکِ اسلحہ کے بعد یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا افواج اور تمام قسم کے اسلحہ سے پاک ہوجائے گی اور پھر عالمی امن کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

5. رسمی اور غیر رسمی Formal and Informal

جب اقوام تفصیلی بحث یا مباحثہ کے بعد ترکِ اسلحہ کے لیے کسی معاہدہ پر پہنچتے ہیں تو اسے رسمی ترکِ اسلحہ کہتے ہیں۔ PTBT، NPT، SALT I&II، INF، START، اور CTBT وغیرہ سب رسمی ترکِ اسلحہ کی مثالیں ہیں۔ لیکن غیر رسمی یا خود عائد کردہ (Self Imposed) ترکِ اسلحہ وہ ہے جس میں ممالک اسلحہ رکھنے کے باوجود انھیں دشمن کے خلاف استعمال نہیں کرتے۔ اسلحہ کے استعمال سے ہونے والے نقصانات، تباہی اور اخلاقی وعوامی دباؤ وغیرہ کے نتیجے میں وہ اپنے پاس موجود خطرناک اسلحہ کو استعمال کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے دوران محوری طاقتیں اور اتحادی کوئی بھی خطرناک زہریلی گیس کو استعمال نہیں کیے۔ 1950-53 میں لڑی گئی جنگ کوریا کے دوران بھی مخالف فریقین نیوکلیر اسلحہ حتی کہ روایتی اسلحہ کے استعمال میں حد درجہ احتیاط سے کام لیے۔ 1991ء میں خلیجی جنگ کے دوران بھی امریکہ اور عراق کیمیائی ہتھیاروں یا نیوکلیر ہتھیاروں کا استعمال نہیں کیے' حالانکہ اس کا بڑا خدشہ تھا۔

ترکِ اسلحہ کے مسائل Problems of Disarmament

ترکِ اسلحہ یا تخفیفِ اسلحہ چونکہ ایک مشکل امر ہے اس لیے اس میں حسب ذیل رکاوٹیں اور مسائل درپیش ہیں۔

---

1. 1817ء میں امریکہ وکینیڈا کی سرحد کو غیر فوجی (Demilitarize) بنانے کے لیے امریکہ و برطانیہ کے درمیان یہ معاہدہ طئے پایا تھا۔ اس معاہدہ پر عمل آوری آج بھی جاری ہے۔

1. خوف اور عدم سلامتی Fear and Insecurity

اسلحہ اور سلامتی کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے۔ ممالک اپنی سلامتی کے لیے اسلحہ خریدتے ہیں، جب تک اسلحہ کے بغیر یا کم سے کم اسلحہ کے ذریعہ قوم کی سلامتی کا کوئی طریقہ دریافت نہیں ہوجاتا ترکِ اسلحہ کا تصور محض ایک خواب ہوگا۔ عدم سلامتی کے خوف و احساس کے ساتھ ترکِ اسلحہ ممکن نہ ہوگا اور ممالک اس کے لیے تیار نہیں ہونگے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ترکِ اسلحہ خود قوموں کے درمیان احساس تحفظ کو بڑھائے گا چونکہ اقوام ایک دوسرے کے وجود کو خطرے میں ڈالنے کے قابل نہ ہونگے اور وہ ایک دوسرے پر حملہ نہیں کریں گے۔ جب کہ بعض دوسرے ماہرین کے خیال میں ممالک اس وقت تک ترکِ اسلحہ کے لیے تیار نہیں ہونگے جب تک کہ اجتماعی سلامتی کے کسی نظام کے ذریعہ انھیں تحفظ کی ضمانت نہ دی جائے۔ چنانچہ ممالک میں خوف اور عدم سلامتی کے احساس کو ختم کیے بغیر ترکِ اسلحہ ناممکن ہے۔

2. باہمی عدم اعتماد Mutual Distrust

پروفیسر سیلچر کے مطابق اقوام کے درمیان اگر مکمل اعتماد ہوتو ہتھیار غیر ضروری ہوں گے اور ترکِ اسلحہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ممالک ایک دوسرے کی فوجی تیاریوں کو دیکھ کر اپنے آپ کو اسلحہ سے لیس کرتے ہیں۔ ہر ملک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اُسے یہ امید نہیں ہوتی کہ دوسرے ممالک بھی ترکِ اسلحہ کو اپنائیں گے۔ ترکِ اسلحہ کی کانفرنسوں میں فوجی تنصیبات اور اسلحہ کی تیاری کے مراکز کے معائنہ ونگرانی کی تجاویز پیش کی گئیں لیکن ان کی عمل آواری ممکن نہ ہوسکی۔ امریکہ اور سویت یونین نے اس کو ایک دوسرے کی جاسوسی کے لیے استعمال کیا۔ اس طرح قوموں میں باہمی عدم اعتماد کی کمی ترکِ اسلحہ کے لیے ایک مسئلہ ہے۔

3. سیاسی تنازعات Political Disputes

قوموں کے درمیان سیاسی جھگڑوں اور تنازعات کی وجہ سے ترکِ اسلحہ ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایک مرتبہ جب قوموں کے درمیان برتری کے لیے رقابت شروع ہوجاتی ہے تو ان کے درمیان اسلحہ کی دوڑ شروع ہوجاتی ہے۔ علاقائی عزائم دو پڑسیوں کے درمیان اسلحہ کی دوڑ کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح عالمی برتری کے لیے جدوجہد عالمی طاقتوں کے درمیان اسلحہ کی دوڑ پیدا کردیتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکہ اور سویت یونین کے درمیان عالمی بالادستی کی جدوجہد سرد جنگ کا ماحول پیدا کی تھی جس سے ان دونوں کے درمیان ایک نہ رکنے

والی اسلحہ کی دوڑ شروع ہوگئی تھی۔ ممالک اپنے اپنے عزائم کے حصول کے لیے اسلحہ حاصل کرتے ہیں اس طرح اسلحہ کی دوڑ شروع ہوجاتی ہے سیاسی مسائل کو پرامن طور پر حل کرنے میں قوموں کا یقین ترکِ اسلحہ کو یقینی بناتا ہے۔

4. فوجی ٹکنالوجی کی ترقی Advancement of Technology

ہر روز فوجی ٹکنالوجی میں نئی نئی ترقیاں ہوتی رہتی ہیں، نئے اسلحہ بنتے رہتے ہیں اور ممالک اپنے آپ کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دشمن پر ان کی برتری قائم ہوسکے۔ چنانچہ اس وجہ سے ترکِ اسلحہ ممکن نہیں ہوتا۔ ہر نئے اسلحہ کے سامنے پرانے اسلحہ بیکار اور ناقابل بھروسہ ہوجاتے ہیں۔ ایسے میں کوئی بھی ملک اپنی سلامتی کا جوکھم لینا نہیں چاہتا اور وہ بھی جدید ترین اسلحہ سے لیس ہونے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں علاقائی و عالمی سطح پر اسلحہ کی دوڑ شروع ہوتی ہے۔ 1980ء کے دہے میں ''ستاروں کی جنگ'' (Star War) کا امریکی منصوبہ یا 2001ء کا امریکی NMD پروگرام عصری اسلحہ کو حاصل کرنے کی خواہش کو ظاہر کرتا ہے جب کہ اس سے عالمی سطح پر تشویش پیدا ہوگئی ہے اور مسابقتی دوڑ میں شامل ممالک برابری کی جستجو میں نئے قسم کے اسلحہ پیدا کرنے کے لیے اپنی تحقیقی سرگرمیوں کو تیز کردیتے ہیں۔ اس سے اسلحہ کی ایک نئی دوڑ کا آغاز ہوتا ہے۔ ممالک جدید ترین، خصوصاً نیوکلیر اسلحہ کے حصول کو باعث افتخار اور وقار سمجھتے ہیں اور غریب ترین ممالک میں بھی اسلحہ کی دوڑ شروع ہوجاتی ہے۔

5. قومی مفاد National Interest

ممالک ترکِ اسلحہ کے مسئلہ کو قومی مفاد کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ترکِ اسلحہ کی بات چیت میں ایسے شرائط پیش کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے قابل قبول نہیں ہوتے جس کے نتیجے میں ترکِ اسلحہ کانفرنسیس ناکام ہوجاتی ہیں۔ اسلحہ کا سودا لو اور دو کا کھیل ہوتا ہے۔ لیکن عملاً ہر ملک زیادہ لینا اور کم دینا چاہتا ہے۔ چوں کہ ہر ایک کے لیے اس کی سلامتی اہم ہوتی ہے۔

6. تناسب کا مسئلہ Problem of Ratio

ترکِ اسلحہ میں ایک اہم ترین تکنیکی مسئلہ تناسب کا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مختلف ممالک کے درمیان اسلحہ کی کمی کس تناسب سے ہو۔ ممالک کے پاس پائے جانے والے اسلحہ کی نوعیت، خاصیت، صلاحیت و طاقت مختلف ہوتی ہے۔ کس ملک کا کونسا ہتھیار دوسرے ملک کے

کونسے ہتھیار کے برابر یا مساوی ہے یہ طئے کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ چنانچہ مختلف قسم کے اسلحہ کے درمیان تناسب کا تعین مشکل ترین کام ہے۔ اسی نکتہ پر آ کر ترکِ اسلحہ کی بات چیت اور کانفرنسیں ناکام ہوجاتی ہیں۔ اگر سب کے پاس ہتھیاروں کی یکساں تعداد ہوتو بھی ان کی صلاحیت اور طاقت مختلف ہوتی ہے۔ عددی طور پر اسلحہ میں کمی بعض ممالک کو طاقتور تو بعض کو کمزور بنادیتی ہے۔ چنانچہ کوئی بھی ملک دوسرے کو اپنے پر برتری دینا نہیں چاہتا۔

7. تقسیم کے معیارات Standard of Allocation

تناسب کا مسئلہ اگر حل کرلیا بھی جائے تو تقسیم کے معیارات کا دوسرا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مختلف قسم کے اسلحہ کا تقابل کرنا ان کی صلاحیت کا تعین کرتے ہوئے اُسی نوعیت کے دوسرے اسلحہ کے مقابلے میں اس کی تعداد کا تعین کرنا ایک مشکل امر ہے۔ امریکہ اور سابقہ سویت یونین کے درمیان ترکِ اسلحہ کی بات چیت خصوصاً SALT معاہدات کے دوران یہ مسئلہ حاوی تھا۔

ترکِ اسلحہ کے اقدامات - ایک جائزہ

ترکِ اسلحہ کے لیے اب تک کیے گئے اقدامات کی ایک طویل تاریخ ہے۔ ذیل میں اس کا ایک مختصر جائزہ لیا جائے گا۔

ہیگ کانفرنس 1899 اور 1907

انیسویں صدی کے اختتام پر 1899ء میں پہلی بین الاقوامی ترکِ اسلحہ کانفرنس ہیگ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں اسلحہ کو کم کرنے کے اقدامات کا جائزہ لیا گیا۔ لیکن کوئی قابل قدر نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کانفرنس میں چند ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے طریقوں کو طئے کیا گیا تاکہ جنگوں میں کم سے کم تباہی ہو۔ اس کانفرس میں 26 ممالک نے شرکت کی تھی اور اس میں فوجی اخراجات کو کم کرنے اور عوام کی مادی واخلاقی فلاح کو بڑھانے پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے دو قرار دادیں منظور کی گئیں۔ 1907ء میں دوسری ہیگ کانفرنس پہلی کانفرنس سے کم کامیاب تھی اس میں شرکاء ممالک نے اس بات پر قرار داد منظور کی کہ موجودہ ہتھیاروں کی دوڑ کی وجہ سے ترکِ اسلحہ ناممکن بن گئی ہے۔

واشنگٹن بحری کانفرنس Washington Naval Conference 1922

پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکہ کی تحریک پر 1922ء میں یہ کانفرنس واشنگٹن میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں جنگی جہازوں کی تعداد اور ان کی تیاری پر دس سال کے لیے امتناع عائد

کیا گیا۔ اس کے علاوہ بحر الکاہل میں بحری اڈوں کے قیام پر بھی محدود پابندی عائد کی گئی۔

عالمی ترکِ اسلحہ کانفرس 1932

ترکِ اسلحہ کے لیے کی گئیں مجلس اقوام کی کئی کوششوں میں یہ ایک اہم کوشش تھی۔ یہ کانفرس 1932ء میں جنیوا میں منعقد ہوئی اس میں 61 ممالک نے شرکت کی تھی لیکن کانفرنس کسی اہم معاہدے پر پہنچنے میں ناکام ہوئی۔ اس کانفرنس میں کیمیائی اور حیاتیاتی اسلحہ کے استعمال کی مذمت کی گئی اور فوجی بجٹ میں کمی کرنے پر زور دیا گیا۔ اس کے علاوہ مستقبل کے ترکِ اسلحہ کے اقدامات کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی ادارہ کے قیام پر بھی زور دیا گیا۔

اقوامِ متحدہ اور ترکِ اسلحہ UNO and Disarmament

دوسری جنگ عظیم میں ایٹمی اسلحہ کے استعمال سے ترکِ اسلحہ کے لیے عالمی خواہش میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ 1946ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے پہلے اجلاس میں اٹامک انرجی کمیشن (UNAEC) کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا کام عام تباہی کے نیوکلیر اور دوسرے ہتھیاروں کو ختم کرنے کے لیے خصوصی تجاویز پیش کرنا تھا۔ تاہم یہ کمیشن صرف نیوکلیر ہتھیاروں پر توجہ مرکوز رکھا۔

بروچ منصوبہ Baruch Plan

14 جولائی 1946ء کو امریکی حکومت نے ایٹمی توانائی کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک منصوبہ شائع کیا جو بروچ منصوبہ کہلاتا ہے۔ اس منصوبے میں انٹرنیشنل ایٹمک ڈیولپمنٹ اتھاریٹی (IADA) کے قیام کی سفارش کی گئی اور اس کے لیے حسب ذیل فرائض تجویز کیے گئے تھے۔

1. ایٹمی توانائی کی سرگرمیوں (چاہے وہ پرامن مقاصد کے لیے ہو یا تباہی کے لیے) پر نگرانی رکھنا۔ 2. ایٹمی توانائی میں استعمال ہونے والے خام مال کو نگرانی میں لینا۔ 3. عالمی سلامتی کے لیے خطرناک ایٹمی توانائی کی تمام سرگرمیوں کی ملکیت اور انتظام پر نگرانی رکھنا۔ 4. ایٹمی توانائی کی تمام سرگرمیوں کے معائنہ اور لائسنس کے اختیار کو استعمال کرنا۔ 5. پرامن مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی کے استعمال کو فروغ دینا اور تحقیق و ترقی کی سرگرمیوں کو اپنی نگرانی میں چلانا۔

اس منصوبے میں امید کی گئی تھی کہ ایک مرتبہ نگرانی کے طریقہ کار پر رضامندی ہو جائے تو نیوکلیر بموں کی تیاری رک جائے گی اور پہلے سے موجود بموں کو تباہ کیا جاسکے گا۔ اس منصوبے میں خلاف ورزی پر سزا کی گنجائش بھی رکھی گئی تھی۔ اس منصوبے کی ایک اہم بات یہ تھی کہ

IADA کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے حق ویٹو سے آزاد رکھا گیا تھا۔ لیکن سویت یونین بروچ منصوبے کو مسترد کردیا۔ اس کے مطابق اس منصوبے کا مقصد سویت یونین کو نیوکلیر جانکاری کے حصول سے باز رکھنا تھا اور پھر IADA کو سلامتی کونسل کے ویٹو سے آزاد رکھا گیا تھا جو کہ سویت یونین کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ اس کے بجائے سویت یونین کا استدلال یہ تھا کہ تمام ایٹمی اسلحہ غیر قانونی ہیں ان کو پہلے ختم کیا جانا چاہیے۔

گرومیکو منصوبہ Gromyko Plan

بروچ منصوبے کے کچھ دنوں بعد اس وقت کے سویت وزیر خارجہ گرومیکو نے اقوام متحدہ کے ایٹمی توانائی کمیشن کو ایک منصوبہ پیش کیا۔ یہ منصوبہ بروچ منصوبہ کی ضد تھا۔ اس کی اہم تجاویز اس طرح تھیں۔

1. ایک بین الاقوامی کنونشن طلب کرنا۔ اس میں شریک دستخط کنندگان اس بات کا عہد کریں کہ وہ کسی بھی صورت میں ایٹمی اسلحہ کو استعمال نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ ان ممالک کو ایٹمی اسلحہ کی تیاری اور ذخیرہ اندوزی سے باز رکھنا۔ اس کنونشن میں منظورہ معاہدہ کے نفاذ کے تین ماہ کے اندر ممالک ایٹمی اسلحہ کے اپنے تمام ذخائر تلف کردیں۔ 2. مجوزہ کنونشن اسی وقت قابل عمل درآمد ہوگا جب کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اس کی منظوری دے اور مستقل اراکین اس کی تصدیق کریں۔ 3. اقوام متحدہ کا ایٹمی توانائی کمیشن (UNAEC) خود سائنسی معلومات کے تبادلہ کا انتظام کرے اور ایٹمی و عام تباہی کے اسلحہ پر امتناع کی سفارش کرے۔ اور اس کنونشن کی نگرانی و مشاہدہ کرے۔ 4. ایٹمی توانائی کمیشن کی تمام کمیٹیاں ایٹمی اسلحہ سے متعلق تمام اہم سوالات پر بڑی طاقتوں کی یکسانیت کے اصول کا تحفظ کرے۔

امریکہ اس منصوبہ کو رد کردیا۔ چوں کہ اس منصوبہ کے نفاذ کی صورت میں ایٹمی اسلحہ میں امریکی برتری ختم ہوجاتی تھی۔ اس طرح امریکہ و سویت یونین کے درمیان ترکِ اسلحہ کے مسئلہ پر گہرے اختلافات رہے۔

ترکِ اسلحہ کمیشن Disarmament Commission

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے جنوری 1952ء میں ترکِ اسلحہ کمیشن کا قیام عمل میں لایا۔ یہ کمیشن سلامتی کونسل کے تمام اراکین اور کینیڈا پر مشتمل تھا۔ 1958ء میں اقوام متحدہ کے تمام اراکین کو اس میں شامل کیا گیا۔ اس کمیشن کے قیام کا مقصد "تمام مسلمہ افواج اور اسلحہ" کو

متوازن طور پر ہٹانے انہیں محدود و منضبط کرنے کے لیے ایک معاہدہ کے مسودہ کو قطعیت دینا تھا۔ کمیشن کو سلامتی کونسل کی نگرانی میں کام کرنا تھا۔ لیکن وقت، معائنہ اور نگرانی کے مسائل سے اس کے کام میں تعطل پیدا ہوگیا۔ سویت یونین کا مطالبہ یہ تھا کہ کمیشن سب سے پہلے ''ایٹمی ہتھیاروں پر غیر مشروط امتناع'' عائد کرے۔ اس طرح کمیشن اور اس کے کام کو سویت یونین نے رد کردیا۔

''کھلے آسمانوں'' کا منصوبہ The "Open Skies" Plan

1955ء میں امریکی صدر آئزن ہوور نے اچانک حملے (Surprise Attaek) کے خطرے کو کم کرنے کے لیے کھلے آسمانوں کا منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبہ کے مطابق دونوں بڑی طاقتوں' امریکہ اور سویت یونین کو ایک دوسرے کے علاقوں کا سروے کرنے کی آزادی ہوگی۔ دونوں طاقتیں ایک دوسرے کی فوجی تنصیبات کے بلو پرنٹ کا تبادلہ کریں گے اور مبصرین برسر موقع معائنہ کریں گے۔ لیکن سویت یونین اس بیناد پر اس منصوبہ کو رد کردیا کہ یہ منصوبہ ایٹمی ہتھیاروں کو کم کرنے کی بات نہیں کرتا۔

18 قومی ترکِ اسلحہ کمیٹی

ترکِ اسلحہ کے میدان میں ایک اہم کامیابی 1962ء میں 18 قومی ترکِ اسلحہ کمیٹی کے قیام سے ملی ۔ یہ کمیٹی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قایم کی تھی۔ یہ کمیٹی جس میں ہندوستان بھی شامل تھا غیر جانبدار ممالک کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ لیکن یہ کمیٹی ناکام ہوگئی چوں کہ فرانس اس کمیٹی میں یہ کہتے ہوئے شامل ہونے سے انکار کردیا کہ ترکِ اسلحہ کی بات چیت صرف چار نیوکلیر طاقتوں تک ہی محدود ہونی چاہیے۔ اس کانفرنس میں امریکہ اور سویت یونین نے اپنے اپنے منصوبے پیش کیے۔ امریکہ نے نیوکلیر ڈیلیوری وہیکلس اور اہم روایتی اسلحہ میں تین سال میں 30 فیصد کٹوتی کا منصوبہ پیش کیا۔ نیوکلیر اسلحہ کی تیاری پر امتناع بھی اس منصوبے میں شامل تھا۔ جب کہ سویت یونین نے اپنے منصوبے میں چار سال کی مدت میں تین مرحلوں میں سخت بین الاقوامی نگرانی نیں مکمل ترکِ اسلحہ کا منصوبہ پیش کیا۔

تجربات پر جزوی امتناع کا معاہدہ PTBT 1963

چار سال کی بات چیت کے بعد نیوکلیر ہتھیاروں کے تجربات پر جزوی امتناع (Partial Test Ban Treaty) کا معاہدہ اگست 1963ء میں ماسکو میں طئے پایا۔ اس پر

برطانیہ، امریکہ اور سویت یونین دستخط کیے تھے۔ جب کہ فرانس اور چین اس پر دستخط کرنے سے انکار کیے۔ اس معاہدہ کی پانچ دفعات تھیں اس معاہدہ کی اہم خصوصیات یہ تھیں۔

1. دستخط کنندہ ملک فضاء خلاء اور پانی میں نیوکلیر تجربات نہیں کریں گے۔ 2. دستخط کنندہ ملک علاقائی پانیوں (Territorial Waters) آبی سرحدوں اور آبی شاہراہوں (High Seas) میں نیوکلیر تجربات نہیں کریں گے۔ 3. دستخط کنندہ ہر ملک غیر دستخط کنندہ ممالک کو راست یا بالواسطہ طور پر نیوکلیر تجربات کرنے کے لیے ہمت افزائی نہیں کریں گے۔

یہ معاہدہ تجربات پر جزوی امتناع کا تھا چونکہ اس میں زیرزمین نیوکلیر تجربات پر کوئی امتناع نہیں تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ پر دستخط کے بعد بھی بڑی طاقتیں خصوصاً امریکہ وسویت یونین زیرزمین کئی نیوکلیر تجربات کیے۔ دوسرے یہ کہ فرانس اور چین اکٹوبر 1963ء میں اس معاہدہ کے نفاذ کے بعد کھلی فضاء میں نیوکلیر تجربات کیے۔ اسی لیے یہ جزوی امتناع کا معاہدہ کہلاتا ہے۔

ہاٹ لائین معاہدہ The Hotline Agreement

ایٹمی ہتھیاروں میں ہونے والی ترقی اور ان کے پھیلاؤ کے نتیجہ میں کسی انسانی غلطی غلط فہمی یا حاثہ سے ان کے استعمال کے امکانات بڑھ گئے تھے۔ خصوصاً 1962ء میں کیوبا کے میزائل بحران کے نتیجہ میں اس کے امکانات زیادہ تھے۔ چنانچہ غلطی، غلط فہمی اور غلط اندازوں کی وجہ سے نیوکلیر جنگ کے امکانات کو کم کرنے کے لیے 1963ء میں امریکہ اور سویت یونین نے ہاٹ لائین معاہدہ پر دستخط کیے۔ اس معاہدہ کے تحت دونوں عظیم طاقتیں فوری ربط پیدا کرنے کے لیے واشنگٹن اور ماسکو کو راست ٹیلی فونی رابطہ سے مربوط کیے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دونوں کے صدراتی محل میں یہ سہولت فراہم کی گئی تا کہ کسی بحران کی صورت میں راست رابطہ کے ذریعے غلط فہمیوں کا ازالہ کرسکیں۔ اس طرح دونوں عظیم طاقتیں جہاں اسلحہ کو کم کرنے تیار نہیں ہوئیں وہیں امکانی تصادم سے بچنے کے اقدامات پر متفق تھیں۔

نیوکلیر عدم پھیلاؤ معاہدہ Nuclear Non-Proliferation Treaty

تین سال کی گفت وشنید کے بعد نیوکلیر عدم پھیلاؤ معاہدہ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے جون 1968ء میں منظوری دی۔ اس پر قطعی دستخط یکم جولائی 1968ء کو ہوئے اور اس کا نفاذ 5 مارچ 1970ء سے اس وقت ہوا جب کہ 44 غیر نیوکلیر ممالک اور تین نیوکلیر طاقتوں نے اس کی منظوری دی۔ اس پر دستخط کرنے والے ممالک کی تعداد بڑھ کر 153 ہوگئی۔ چین، ہندوستان،

پاکستان اور چند دوسرے ممالک نے اس پر دستخط نہیں کیے تھے۔ فرانس 1992ء میں اس معاہدہ پر دستخط کیا۔ اس معاہدہ کی اہم باتیں یہ تھیں۔

1. نیوکلیر ہتھیار رکھنے والے ممالک نیوکلیر جانکاری کو نہ پھیلائیں اور تیار نیوکلیر اسلحہ کا غیر نیوکلیر ممالک کو تبادلہ نہیں کریں گے۔ 2. نیوکلیر ممالک پر امن مقاصد کے لیے اس معاہدے پر دستخط کرنے والے ممالک کو نیوکلیر توانائی کے میدان میں مادی مدد و جانکاری فراہم کریں گے۔ 3. نیوکلیر ممالک غیر نیوکلیر ملک کو حملہ یا حملہ کے خطرے کی صورت میں فوری امداد بہم پہنچائیں گے۔ 4. غیر نیوکلیر ممالک نیوکلیر توانائی کے پرامن مقاصد سے فوجی مقاصد میں استعمال کو روکنے کے لیے انٹرنیشنل اٹامک ایجنسی (IAEA) کے قایم کردہ نگرانی، تحفظ کے اقدامات اور جانچ پڑتال کو قبول کریں گے۔ 5. یہ معاہدہ 25 سال (یعنی 1995ء تک) قابل عمل ہوگا اور اس کی کارکردگی کے جائزہ کے لیے پانچ سال میں ایک مرتبہ جائزہ کانفرنسیں ہونگی۔

ین پی ٹی سے دو مقاصد پورے ہوئے ہیں۔ 1. نیوکلیر ہتھیار رکھنے والے ممالک راست یا بالواسطہ طور پر دوسروں کو نیوکلیر جانکاری منتقل نہ کرنے کا عہد کیے۔ 2. غیر نیوکلیر ممالک نیوکلیر صلاحیت کو حاصل نہ کرنے کے لیے دستخط کیے۔ اس معاہدہ کے مطابق صرف پانچ ممالک امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین نیوکلیر کلب کے اراکین ہوں گے جو 1970ء سے پہلے نیوکلیر تجربات کیے تھے۔ ین۔پی۔ٹی سے ترکِ اسلحہ کا مقصد محدود طور پر ہی پورا ہوا۔ اس معاہدے کے باوجود ہندوستان اور پاکستان نیوکلیر تجربات کیے اور مزید کئی ممالک نیوکلیر تجربات کی دہلیز پر ہیں۔

SALT معاہدات

ترکِ اسلحہ میں معاہدہ SALT ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکہ اور سویت یونین کے حکمت عملی کے برتر ہتھیاروں سے عالمی صیانت کو خطرہ لاحق ہو چکا تھا اور ضرورت اس بات کی تھی کہ ان اسلحہ میں کمی کرنے کے اقدامات کیے جائیں۔ چنانچہ امریکہ اور سویت یونین کے درمیان جنیوا میں طویل مدت تک اسلحہ کو کم کرنے کے لیے بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد ہلسنکی چوٹی کانفرنس میں امریکی و سویت قائدین اصولی طور پر ہتھیاروں کی دوڑ میں کمی کرنے اور تباہ کن ہتھیاروں کو محدود کرنے سے اتفاق کیے۔ بالآخر چار سال کی کاوشوں کے بعد جس کے دوران تقریباً 127 ابتدائی اجلاس منعقد ہوئے 26 مئی 1972ء کو امریکی صدر نکسن اور سویت صدر برزنیف کے درمیان ماسکو میں SALT معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ دراصل یہ معاہدہ دو معاہدات پر مشتمل تھا۔ ایک

معاہدہ ABM نظام کو محدود کرنے اور دوسرا حکمت عملی کے حملہ آور ہتھیاروں کو محدود کرنے پر مشتمل تھا۔ پہلا معاہدہ غیر محدود مدت کے لیے تھا جب کہ دوسرے معاہدہ کی مدت پانچ سال تھی۔

ABM نظام معاہدے کے تحت بڑی طاقتوں (امریکہ و سویت یونین) کو صرف دو مقامات یعنی صدر مقام اور ICBM تنصیبات کے مقامات پر ہی ABM میزائل کو رکھنے کی اجازت تھی۔ اس کے علاوہ اس معاہدہ میں ABM نظام کے سمتوں کا بھی تعین کیا گیا چنانچہ اس کے تحت ہر مقام پر چھ ABM لانچرس اور سو ABM مداخلتی میزائیلز کو ہی چھوڑے جانے والے مقامات پر ہی رکھنے کی اجازت تھی۔ صدر مقام پر 133 سے زیادہ ABM راڈرس نہ ہوں اور ہر ایک کا قطر تین کلومیٹر سے زائد نہ ہو۔ اس کے علاوہ میزائل چھوڑنے کے مقام پر 18 ABM راڈر اور دو طویل مرحلہ کے راڈرس ہوں۔ امریکہ و سویت یونین نے اس بات سے بھی اتفاق کیا کہ وہ ایک وقت میں ایک سے زائد مداخلتی ABM میزائیلس کے چھوڑے جانے کا تجربہ نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ یہ معاہدہ دونوں عظیم طاقتوں کو تیزی سے دوبارہ بھرتی کرنے والے خودکار ABM لانچرس کے تجربے سے بھی روکتا ہے۔ لیکن دونوں طاقتوں کو اپنے کوٹے کے اندر ABM نظام میں جدیدیت کو اپنانے کی اجازت تھی۔

حکمت عملی کے حملہ آور ہتھیاروں کا معاہدہ (SALT) بہت ہی پیچیدہ تھا۔ یہ معاہدہ زمینی ICBM اور آبدوز سے چھوڑے جانیوالے ICBM دونوں کا احاطہ کرتا ہے۔ سویت یونین اور امریکہ کے لیے ICBM کی تعداد بالترتیب 1618 اور 1054 رکھی گئی تھی۔ یہ تعداد یکم جولائی 1971ء کے وقت ان کی حقیقی طاقت کی بنیاد پر رکھی گئی تھی۔ اس معاہدہ میں دونوں طاقتوں نے اپنے ہتھیاروں میں جدیدیت کے اقدامات سے بھی اتفاق کیا تھا۔

SALT II

SALT I معاہدہ اکتوبر 1977ء میں ختم ہوا۔ اس کے بعد جون 1979ء کو SALT II معاہدہ پر ویانا میں امریکی صدر کارٹر اور سویت صدر برزنیف کے دستخط ہوئے۔ اس معاہدہ کی مدت 31 ڈسمبر 1985ء تک تھی۔ لیکن ڈسمبر 1979ء میں سویت یونین کی افغانستان میں مداخلت سے امریکی کانگریس نے SALT II معاہدہ کی توثیق نہیں کی یہاں تک کہ اس معاہدے کی مدت ختم ہوگئی۔ اس کے بعد امریکی صدر ریگن SALT کی جگہ ایک نئے معاہدہ START کو شروع کرنے پر زور دیا۔

ستاروں کی جنگ SDI or Star War

23 مارچ 1983ء کو امریکی صدر رونالڈ ریگن نے پہلی بار عوامی سطح پر SDI پروگرام (حکمت عملی کی دفاعی پہل) پیش کیا جس کا مقصد زمین سے زمین پر مار کرنے والے سویت میزائیلوں کی برتری کا مقابلہ کرنے کے لیے خلاء میں نئی دفاعی تحقیق شروع کرنا تھا۔ سویت یونین اور اس کے حلقے کے ممالک نے اس پروگرام کو ستاروں کی جنگ Star War سے تعبیر کیا۔ اپنی اس دفاعی تحقیق کے ذریعہ امریکہ ICBM میزائل داغے جانے کے کسی بھی مرحلے پر اسے روکنے کا میزائلی نظام خلاء میں قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح امریکہ ایک نیا Ballistic Missile Defence نظام قایم کرنا چاہتا تھا اور یہ نظام مکمل طور پر کیمیائی شعاعوں ، نیوکلیائی ہتھیاروں پر مشتمل تھا۔ اس نئے نظام سے سویت دفاعی برتری ختم ہوجاتی تھی۔ اس نظام پر تقریباً 500,000 ملین ڈالر کی رقم کا تخمینہ کیا گیا تھا۔ اب امریکہ اپنی تحقیق کے دوسرے مرحلے میں داخل ہوگیا ہے۔ اور اس نظام کی مکمل کامیابی کے ساتھ خلاء میں قایم کرنے کے قابل ہوگیا۔

Intermediate Nuclear Force(INF)معاہدہ

18 نومبر 1981ء کو صدر ریگن نے قومی پریس کلب کو مخاطب کرتے ہوئے ترکِ اسلحہ کے لیے ایک پیشکش کی جسے صفر۔صفر پیشکش بھی کہا جاتا ہے۔ 1981ء میں یوروپ میں امریکہ کے نئے میزائیل سے اس بات کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں سویت یونین یوروپ کے خلاف حملہ آور نہ ہو۔ امریکی ہتھیار NATO ممالک کی حفاظت کے لیے نصب کیے گئے تھے۔ اس پس منظر میں امریکی صدر نے دونوں جانب سے اسلحہ کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے صفر۔صفر پیشکش کیا اور اس بات کی پیشکش کی کہ اگر سویت یونین 250 نئے SS-20 اور 350 سے زائد قدیم SS-4,SS-5 میزائیل کو تباہ کرنے کے لیے تیار ہو تو امریکہ بھی یوروپ میں108 Persshing-II اور 464 زمین سے مارے جانے والے Cruise Missile نصب نہیں کرے گا۔ اس مقصد کے لیے دونوں ممالک کے درمیان کھلی بات چیت کی تجویز رکھی۔

دونوں ممالک کے درمیان 30 نومبر 1981ء سے درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے میزائلس کو ہٹانے کے لیے جنیوا میں بات چیت کا آغاز ہوا اور بالآخر چھ سال کی کاوشوں کے بعد 8 ڈسمبر 1987ء کو ریگن اور گورباچوف نے واشنگٹن میں INF معاہدہ پر دستخط کردیے جس کا

نفاذ یکم جون 1988ء سے ہوا۔ اس معاہدہ کی رو سے امریکہ اور سویت یونین مجموعی طور پر 2700 نیوکلیر اسلحہ کے حامل میزائل کو تباہ کرنے پر راضی ہوئے۔ تناسبی لحاظ سے یہ طئے پایا کہ امریکہ ایک نیوکلیر ہتھیار کے مقابلے میں سویت یونین اپنے چار نیوکلیر ہتھیار کو ہٹالے گا۔ اس معاہدہ کی رو سے زمین سے مار کرنے والے 500 تا 550 کلومیٹر کے فاصلے کے میزائیلس کو تباہ کرنا طئے کیا گیا۔ جن میں امریکہ کے Pershing-II اور کروز میزائیل اور سویت یونین کے SS-20,SS-12,SS-4 اور SS-23 میزائل بھی شامل تھے۔ اس معاہدے کی رو سے میزائیلس کی تیاری ذخیرہ اندوزی اور تنصیب کے تمام مقامات کا دوطرفہ معائنہ کیا جاسکے گا اور پہلے تین سالوں کے دوران ہر سال 20 معائینے کیے جاسکیں گے۔ تین سال کے دوران میزائلس کی تباہی کے بعد آئندہ پانچ سالوں کے دوران دونوں طرف سے 15 معائنے ہوا کریں گے اور اس کے بعد کے مزید پانچ برسوں کے دوران ہر سال 10 معائنوں کی اجازت ہوگی۔ اس طرح یہ معاہدہ 13 برسوں میں پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔ یہ معاہدہ کامیابی سے عمل آوری کے بعد اب نافذ نہیں ہے۔

START معاہدات

تقریباً نو سال تک گفتگو و بات چیت کے نتیجہ میں 31 جولائی 1991ء کو امریکی صدر جارج بش اور سویت یونین صدر گورباچوف نے حکمت عملی کے نیوکلیر ہتھیاروں کو ہٹانے کے لیے اسٹارٹ معاہدہ (Strategic Arms Reduction Treaty) پر ماسکو میں دستخط کیے۔ اس معاہدہ پر دستخط کے لیے INF معاہدہ کے بعد تلف کردہ اسلحہ کی دھات سے تیار کردہ خصوصی قلم استعمال کیے گیے۔ یہ کوئی چھ سوصفحات اور 19 دفعات پر مشتمل ایک تفصیلی معاہدہ تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے امریکہ اسلحہ میں 28% اور سویت یونین 35% کی کمی سے اتفاق کیے۔ اس طرح یہ اپنے اسلحہ میں 1982 کی سطح تک کمی کے لیے تیار ہوئے چوں کہ اسلحہ میں کمی کے لیے بات چیت کا آغاز اسی سال سے ہوا تھا۔ دونوں ممالک اپنے اسلحہ کو گھٹا کر 6,000 تک رکھنے کے لیے تیار ہوئے۔ اس کے علاوہ SLBM, Air Lanched Cruise Missile, ICBM, کو دونوں جانب سے گھٹا کر 1,600 رکھنے سے اتفاق کیا گیا۔ یہ معاہدہ پندرہ سال کے لیے تھا۔ ان پہلے سات برسوں میں دونوں ممالک تین مرحلوں میں اسلحہ کی مقدار کو کم کرنے سے اتفاق کیے۔ پندرہ سال بعد اگر دوسرا معاہدہ نہ ہو تو اس معاہدہ کی مدت میں مزید پانچ برسوں کا اضافہ کیا جاسکے گا۔ سویت یونین کے خاتمہ کے بعد بیلاروس، قازقستان اور یوکرین اس معاہدہ پر کاربند رہنے کا عہد کیے۔

START II

ڈسمبر 1991ء میں سویت یونین کے ٹوٹنے وبکھرنے سے START I معاہدہ کی جگہ پر روس کے ساتھ دوسرے معاہدہ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ چنانچہ 3 جنوری 1993ء کو امریکی صدر جارج بش اور روس کے صدر بورس یلتسن ماسکو میں آئندہ دس برسوں میں اپنے نیوکلیر اسلحہ کو 2/3 تک ہٹا دینے کے لیے اس معاہدہ پر دستخط کیے۔ دونوں قائدین نے اس معاہدہ کو ترکِ اسلحہ کا خواب دیکھنے والی انسانیت کے لیے ایک امید قرار دیا۔ اس معاہدہ کے مطابق 2003ء تک دونوں ممالک اپنے 21,000 اسلحہ کے ذخیرہ میں سے 17,000 کو تلف کریں گے۔ اس کے مطابق سال 2003ء تک روس اور امریکہ کے پاس 3500 سے زیادہ نیوکلیر اسلحہ نہیں ہوں گے۔ اس معاہدنے طویل فاصلے تک وار کرنے والے ملٹیپل وارہیڈز کے زمینی میزائل پر امتناع عائد کردیا۔ اس معاہدہ کی ایک شرط یہ تھی کہ یوکرین اور بیلاروس START I معاہدہ کی توثیق کریں۔

CTBT

عالم گیر ترکِ اسلحہ کے لیے تجویز سب سے پہلے اقوام متحدہ میں پنڈت جواہرلال نہرو نے 1953ء میں رکھی تھی۔ 1958ء میں امریکی صدر آئیزن ہوور اور سویت یونین کے صدر خرشچوف کے درمیان اس کے لیے بات چیت شروع ہوئی جو نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکی۔ 1963ء میں برطانیہ امریکہ وسویت یونین کے درمیان تعطل کو دور کرنے کے لیے ثالثی کیا لیکن کسی معاہدہ پر نہیں پہنچ سکے۔ لیکن اس بات چیت کے نتیجہ میں PTBT پر دستخط ہوئے۔ 1980ء کے دہے میں CTBT کے لیے دباؤ بڑھنے لگا۔ 1990ء میں NPT جائزہ کانفرنس میں CTBT کے لیے بات چیت کے آغاز کا عہد کیا گیا چنانچہ کانفرنس برائے ترکِ اسلحہ (Conference on Disarmament) کا آغاز 1993ء میں جنیوا میں ہوا۔ 1994ء تک CTBT کو رسمی طور پر اپنایا گیا لیکن جنوری 1996ء میں ہی اس کے لیے باقاعدہ معاہدہ ہوا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 10 سپٹمبر 1996ء کو CTBT کے لیے قرارداد منظور کی۔ 158 ممالک نے اس کی تائید میں ووٹ دیا۔ جب کہ ہندوستان، بھوٹان اور کیوبا اس کے خلاف ووٹ دیئے، پانچ ممالک لبنان، لیبیاء، ماریشس، شام اور تنزانیہ رائے دہی سے غیرحاضر رہے۔ 24 سپٹمبر 1996ء سے اس پر نمائندوں نے دستخط کرنے شروع کیے۔ ختم نومبر 2001ء تک 164 ممالک نے اس پر دستخط کیے جب کہ 89 ممالک کی پارلیمنٹوں نے اس کی توثیق کی ہے۔ نیوکلیر صلاحیت کے حامل 44 میں سے

31 ممالک نے توثیق کردی ہے۔امریکہ' چین' الجیریا' کولمبیا' کانگو' مصر' انڈونیشیا' ایران' اسرائیل اور ویتنام نے دستخط کرنے کے باوجود ابھی تک توثیق نہیں کی۔

اہم دفعات

1. کسی بھی مقصد کے لیے نیوکلیر تجربات (چاہے وہ پرامن مقاصد کے لیے ہی کیوں نہ ہوں) پر امتناع۔ 2. ماحول میں کہیں پر بھی تجربات پر امتناع (بشمول زیرزمین) 3. اس کا مقصد عام تباہی کے نیوکلیر ہتھیاروں (Weapons of Mass Destruction) کو روکنا ہے۔
4. CTBT کے قیام کے ذریعہ معائنہ اور جانچ کے نظام کو قایم کرنا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے 321 انٹرنیشنل مانیٹرنگ اسٹیشن اور ایک بین الاقوامی ڈاٹا سنٹر کے قیام کی تجویز رکھی گئی۔

نیوکلیرری ایکٹر یا نیوکلیر ریسرچ سہولت رکھنے والے 44 ممالک کی جانب سے توثیق کے 180 دن بعد اس کا نفاذ عمل میں آئے گا۔ اس کے علاوہ سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ممالک اور ہندوستان ، اسرائیل و پاکستان کی جانب سے اس کی توثیق لازمی ہوگی۔ 44 نیوکلیر ممالک میں سے شمالی کوریا ، ہندوستان اور پاکستان نے اس پر اب تک دستخط نہیں کیے ہیں۔ اگر 24 سپتمبر 1999ء تک اس کا نفاذ ناممکن ہوتو اس کی توثیق کرنے والے ممالک کانفرنس کا انعقاد عمل میں لائیں گے۔ اور ممالک پر توثیق کے لیے دباؤ ڈالیں گے۔ اکٹوبر 1999ء میں اس کے نفاذ کے لیے (Entry into Force) پہلی کانفرنس ویانا میں منعقد ہوئی۔دوسری کانفرنس نومبر 2001ء میں نیو یارک میں منعقد ہوئی اس کانفرنس نے نیوکلیر ممالک سے نیوکلیر تجربات کو نہ کرنے کے عہد کا مطالبہ کیا۔لیکن امریکہ کی طرف سے سرکاری یا غیر سرکاری کوئی بھی نمائندہ اس کانفرنس میں شرکت نہیں کیا۔

اس معاہدہ کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں لیبارٹری میں اور کمپیوٹر پر کیے جانے والے تمثیلی تجربات پر کوئی امتناع عائد نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی نوعیت امتیازی ہے۔ نیوکلیر ہتھیار رکھنے والے ممالک کے ہتھیار کم کرنے پر کوئی توجہ اس معاہدہ میں نہیں دی گئی ہے۔ اس وجہ سے ہندوستان اس پر دستخط کرنے سے انکار کیا ہے ہندوستان کا مطالبہ ہے کہ نیوکلیر ہتھیاروں کے حامل ممالک پہلے اپنے ہتھیاروں کو ایک دیئے گے وقت میں ترک کردیں اس کے بعد نیوکلیر ہتھیاروں کی تیاری پر پابندی کے اس معاہدہ پر دستخط ہوں۔

☆☆☆

باب 19

غیر جانبدار تحریک- ابتداء و ارتقاء

The Non-Alignment Movement-Origin and Development

دوسری جنگ عظیم کے بعد سرد جنگ کے ماحول میں تیسری دنیا کے غریب و پچھڑے ے لیے اہم ترین مسئلہ انکی آزادی کا تحفظ اور معاشی خوشحالی کا حصول تھا۔ دو گروہوں یں ہی دنیا سے عالمی امن کو خطرہ تھا۔ چنانچہ تیسری دنیا کے ممالک نے اپنے لیے ایک آزادانہ راہ کا تعین کیا جس میں وہ امریکہ اور سویت یونین کے فوجی بلاکوں سے یکساں طور پر دور رہتے ہوئے اپنی آزادی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست میں ایک مثبت اور سرگرم رول ادا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ غیر جانبداریت اتحادات خصوصاً فوجی اتحادات سے دور رہنے کی تیسری دنیا کے ممالک کی خارجہ پالیسی کا نام ہے۔ مغربی مفکر اس اصطلاح کے مختلف معنی مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ مارگنتھو، George Liska وغیرہ کے Non-Alignment کے مقابلہ میں Neutrality کی اصطلاح کو فوقیت دیتے ہیں۔ اسی طرح George Schwarzenberger نے کئی ایک اصطلاحوں جیسے Isolatianism (علیحدگی پسندی) Non-Commitment (غیر پابند) Neutrality (بے تعلقی) اور Non-Involvement (عدم شرکت) وغیرہ کو Non-Alignment کے ہم معنی سمجھا ہے۔ جب کہ یہ تمام اصطلاحات الگ الگ ہیں اور غیر جانبداریت ایک الگ اصطلاح ہے۔ چنانچہ علیحدگی پسندی پہلی جنگ عظیم سے قبل امریکہ کی وہ پالیسی تھی جس میں وہ عالمی امور سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنا چاہتا تھا۔ غیر پابند کا مطلب دوسری طاقتوں سے دور رہنے کی سیاست ہے۔ بے تعلقی Neutrality عالمی امور سے دور رہنے کی پالیسی ہے۔ سوئیزر لینڈ کی پالیسی عالمی امور سے بے تعلقی کی ہے۔ اسی طرح عدم شرکت (Non-Involvement) عظیم طاقتوں کی نظریاتی جد و جہد سے اپنے آپ کو دور رکھنا ہے۔

ان تمام تصورات کے برعکس غیر جانبداریت کے معنی وسیع اور خصوصی نوعیت کے ہیں۔ چنانچہ غیر جانبداریت ایسی خارجہ پالیسی کا نام ہے جو طاقت کے بلاک سے آزاد خارجی امور میں انتخاب کی آزادی چاہتی ہے۔ یہ بے تعلقی کی نرم پالیسی نہیں بلکہ عالمی سیاست میں سرگرم

رول ادا کرنے کی خواہش ہے جس میں ممالک حریف طاقتوں کی رقابتوں سے دور رہ کر عالمی امن کے لیے مثبت رول ادا کرنا چاہتے ہیں۔ غیر جانبدار ممالک ترقی کے لیے پر امن ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے۔ حسب ذیل وجوہات کی بناء پر تیسری دنیا کے ممالک نے غیر جانبداریت کی خارجہ پالیسی اپنائی۔

غیر جانبدار تحریک کے آغاز کی وجوہات

1. اقتدار اعلی اور آزادی کا تحفظ

دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں امریکہ اور سویت یونین عظیم طاقتیں بنیں جس سے دنیا میں دو قطبی نظام کا قیام عمل میں آیا۔ دو عظیم طاقتوں کے درمیان نظریاتی اختلافات سے سرد جنگ کی کشیدگی پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی اور امکان تھا کہ دونوں عظیم طاقتیں متصادم ہو کر دنیا کو ایک عظیم تباہی سے دو چار کر دیں۔ ایسے میں ایشیاء، آفریقہ اور لاطینی امریکہ کے نو آزاد ممالک نے اپنے آپ کو سرد جنگ کی کشیدہ سیاست سے بچانے اور اپنی لاقیمت آزادی و اقتدار کے تحفظ کے لیے عظیم طاقتوں کی رسہ کشی سے دور رہنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ انکے لیے غیر جانبداریت سے بہتر اور کوئی دوسری پالیسی نہیں ہوسکتی تھی۔

2. معاشی ترقی کے لیے پر امن حالات

تیسری دنیا کے ممالک صدیوں سے سیاسی غلامی میں تھے اور بڑی جد و جہد و قربانیوں کے ذریعہ آزادی حاصل کیے تھے۔ لیکن ان کی منزل ابھی بہت دور تھی۔ سیاسی آزادی کے بعد معاشی ترقی کی طرف انہیں پیش قدمی کرنا تھا اور یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا تھا جب کہ اطراف و اکناف کے ماحول میں اور ساری دنیا میں امن ہو۔ عالمی کشیدگی کے ماحول میں کسی بھی قسم کی ترقی ممکن نہ تھی۔ اسی لیے تیسری دنیا کے ممالک نے اپنے لیے غیر جانبداری کی راہ کا انتخاب کیا۔ اس طرح غیر جانبدار تحریک تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کی ایک متحدہ و نمائندہ طاقت بن گئی۔ اس کے علاوہ یہ تحریک سرد جنگ کے دور میں بڑی طاقتوں کے درمیان ایک تیسری متبادل قوت بنی جس سے عالمی نظام میں توازن اور اعتدال قایم ہوا۔ نتیجتاً تیسری دنیا کی غیر جانبداریت نے ایک طرف دو عظیم طاقتوں کے درمیان مثبت تعلقات کے فروغ کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا تو دوسری طرف ترکِ اسلحہ کے لیے بڑی طاقتوں کو متوجہ کیا تا کہ تناؤ اور کشیدگی کی سیاست کا مداوا ہو۔

3. قومی و عالمی وسائل کا بہتر استعمال

معاشی ترقی کے لیے قومی وسائل کا صحیح اور متوازن استعمال ضروری تھا۔ اس کے لیے ٹکنالوجی کی ضرورت درکار تھی جس سے تیسری دنیا کے ممالک محروم تھے۔ چنانچہ وہ ترقی یافتہ ممالک خصوصاً عظیم طاقتوں سے اپنی ترقی کے لیے معاشی و تکنیکی مدد کے خواہاں تھے جسکے بغیر انکی معاشی ترقی ممکن نہ تھی۔ کسی ایک طاقت یا بلاک سے انکی قربت انہیں دوسرے بلاک کی امداد سے محروم کردیتی۔ اس لیے ان ممالک نے دونوں بلاکوں اور طاقتوں سے یکساں دوستانہ تعلقات رکھنے کی پالیسی کو اپناتے ہوئے دونوں بلاکوں سے معاشی مدد اور تکنیکی جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کی۔

4. نظریاتی بنیادیں

تیسری دنیا کے ممالک نے اس وقت کے متصادم دو نظریات سرمایہ داریت اور اشتراکیت میں سے کسی ایک تصور کو اپنانے کے بجائے بہتر یہی سمجھا کہ وہ ایسے نظریات وفکر کو اپنائیں جو ان کی روایت تاریخ، تمدن اور ضرورتوں کے مطابق ہو۔ چنانچہ تیسری دنیا کے ممالک نے اپنے لیے غیر جانبداریت کے راستے کو اپنایا اور اپنے حالات کے مطابق سیاسی و معاشی طریقوں کو اپنائے۔ ہندوستان اشتراکی طرز کو اپنانے کے باوجود مخلوط معاشی نظام کی ایک نئی راہ نکالی اور عالمی سطح پر جو بہتر درمیانی راہ ہوسکتی تھی وہ غیر جانبداریت کی تھی۔

5. تجارت و کامرس کا تحفظ

نو آزاد ممالک نو آبادیاتی معاشی ورثہ رکھتے تھے۔ اور یہ تمام کے تمام زرعی ممالک تھے جو خام مال مغربی صنعتی ممالک کو برآمد کرتے تھے۔ تیار شدہ مال کے لیے انکا انحصار یوروپ و مغرب پر تھا۔ ایسے میں توازن تجارت انکے حق میں نہیں تھا اور انکی معیشت کا دارومدار مغرب پر تھا۔ آزادی کے بعد بھی انکی حالت میں کوئی سدھار نہیں آیا اور سابقہ نو آبادیاتی آقاؤں کے استحصال کا شکار تھے۔ جس سے نو آزاد ممالک کی ترقی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ اپنی تجارت کو مختلف سمتوں میں ڈالنے اور استحصال سے بچنے کے لیے ان ممالک کا ایک متحدہ پلیٹ فارم ضروری تھا جس سے وہ باہمی تجارت اور معاشی تعاون کو فروغ دے سکیں۔ اپنی اس غیر جانبدارانہ پالیسی کے نتیجہ میں اقوام متحدہ میں یہ ممالک جدید بین الاقوامی معاشی نظام (NIEO) کا مطالبہ کرسکے۔ 1964ء میں UNCTAD کا قیام انہی کوششوں کا نتیجہ تھی۔

6. عالمی سیاست میں مثبت رول ادا کرنے کی خواہش

آفروایشائی ممالک عالمی سیاست میں مثبت رول ادا کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ وہ بین الاقوامی تناؤ اور کشیدہ حالات میں اپنی ذمہ داریوں سے فرار نہیں چاہتے تھے بلکہ تناؤ کو کم کرنے کے لیے ایک ذمہ دارانہ رول ادا کرنے کے خواہشمند تھے۔ انکی یہی خواہش انہیں کسی ایک نظریہ یا بلاک کے اندھے پیرو بننے سے روکی۔ انکی اس خواہش کا اظہار 1955ء میں بانڈونگ (انڈونیشیاء) میں ہوئی آفروایشیائی کانفرنس سے ہوتا ہے۔

غیر جانبدار تحریک کی خصوصیات

1. فوجی اتحادات سے دوری

غیر جانبدار ممالک خصوصی نوعیت کے فوجی اتحادات جیسے SEATO ،NATO CENTO اور معاہدہ وارسا وغیرہ سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ وہ ان فوجی بلاکوں کو عالمی امن کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں چونکہ انکی وجہ سے قوموں کے درمیان مخالفانہ ماحول پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اسلحہ کی دوڑ بڑھتی ہے۔ اس طرح اتحادات اور اسلحہ کی دوڑ جنگی ہسٹریا کو پیدا کرتے ہیں۔

2. سرد جنگ سے دوری

غیر جانبدار تحریک دراصل دنیا میں جاری سرد جنگ کے خلاف تیسری دنیا کا ایک ردعمل تھی۔ سرد جنگ سے عظیم طاقتوں کے حامی ممالک اپنی شناخت و اہمیت کو کھو کر سرد جنگ کا ایک حصہ بن گئے تھے جس سے امن کو خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ اسی لیے غیر جانبدار ممالک طاقتوں کے دو بلاکوں کے درمیان کسی ایک کا حصہ نہ بنتے ہوئے اور دونوں سے یکساں دوری کا طریقہ اپنائے۔

3. انقلابی ذہن

تیسری دنیا کے ممالک اپنی آزادی انقلابی جد و جہد کے ذریعہ حاصل کیے تھے اور وہ دوبارہ سابقہ نوآبادیاتی آقاؤں سے دور رہتے ہوئے معاشی وسماجی میدانوں میں انقلابی ترقی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں سماجی و معاشی ترقی کے لیے کئی ایک انقلابی اصلاحی اقدامات کیے۔ اور منصوبہ بند معیشت کو ترقی کا زینہ بنائے۔

4. دوستی اور مساوات

غیر جانبدار ممالک تمام قوموں کے ساتھ مساوات، انصاف، خود اختیاری اور پر امن

بقائے باہم کے اصول پر دوستی کو پروان چڑھانا چاہتے تھے۔ جس سے عالم گیر بھائی چارگی کا احساس پیدا ہوا۔ بانڈونگ کانفرنس اور پنچ شیل کے اصولوں سے اس کی عکاسی ہوتی ہے۔

5. اقوام متحدہ سے تعاون

غیر جانبدار ممالک ہمیشہ اقوام متحدہ سے تعاون عمل کا راستہ اپنائے۔ وہ عالمی مسائل کے حل میں اقوام متحدہ کی ثالثی میں یقین رکھتے ہیں۔ عالمی امن کے لیے اقوام متحدہ کی جانب سے کیے جانے والے اقدامات کی بھر پور تائید و حمایت کرتے ہیں۔ وہ جنرل اسمبلی میں اپنے مباحث اور قرار دادوں کے ذریعہ اقوام متحدہ کو جمہوری ادارہ بنانے میں اہم رول ادا کیے۔

6. قابل قیادت

ابتدائی دنوں میں غیر جانبدار تحریک کی ایک اہم خصوصیت اسکو حاصل قابل قیادت رہی ہے۔ چنانچہ گذشتہ صدی کے پچاس کے دہے میں نہرو، ٹیٹو، سکارنو، ناصر، ینکروما، کوانڈا وغیرہ کی قابل قیادت اسکو حاصل تھی۔ غیر جانبدار تحریک انہی قائدین کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ یہ اپنے اپنے ممالک کے معمار تھے اور عالمی سطح پر بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بعد کے برسوں میں مسز اندرا گاندھی، رابرٹ مگابے وغیرہ نے غیر جانبدار تحریک کو روشنی عطا کی۔ لیکن آج اس میں قیادت کا فقدان ہے۔

غیر جانبدار تحریک کی ابتداء و ارتقاء

غیر جانبدار تحریک کی ابتداء کو 1955ء کی بانڈونگ کانفرنس سے جوڑا جاتا ہے۔ اس کانفرنس نے پہلی مرتبہ آفروایشیائی ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا اور زبان، نسل، تہذیب و علاقہ کے اختلافات کے باوجود ایشیاء و آفریقہ کے ایک ہونے کا اعلان جاری کیا۔ اس سے مختلف براعظموں میں رہنے والے عوام کے درمیان وسیع تر تعاون و تعلق کے جذبہ کا اظہار ہوا۔ اس کانفرنس نے غیر جانبدار تحریک کی بنیاد ڈالی۔ ''فروغ عالمی امن اور تعاون کا اعلان نامہ'' اس کانفرنس کا حاصل تھا۔ اس اعلان نامہ میں ''پنچ شیل'' کو قوموں کی خارجہ پالیسی کے لیے مشعل راہ کے طور پر شامل کیا گیا۔ اور ''پر امن بقائے باہم'' کے اصول پر عالمی امن کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ سمجھا گیا کہ ممالک اس پر عمل کرتے ہوئے امن و سلامتی کی ضمانت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کانفرنس میں پنچ شیل کے پہلے چار اصولوں میں مزید چھ نکات کو شامل کیا گیا۔

1. بنیادی انسانی حقوق کی عزت کرنا، 2. اجتماعی و انفرادی طور پر دفاع کا حق، 3. بیرونی

دباؤ کے بغیر معاہدات میں شمولیت' 4. فائدے کے لیے خفیہ معاہدات میں شمولیت' 5. تنازعات کا پر امن تصفیہ' 6. انصاف اور بین الاقوامی ذمہ داریوں کی عزت کرنا[1]۔

کئی ممالک غیر جانبدار تحریک میں دلچسپی لینے لگے۔ جواہر لال نہرو، مصر کے جمال عبدالناصر اور یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو کی ذہین اور دور اندیش قیادت اقوام عالم کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگی۔ غیر جانبدار ممالک کی بڑھتی تعداد باہمی ربط کو پروان چڑھانے کے لیے ایک مشترکہ فورم کے قیام کی ضرورت کو محسوس کرنے لگی۔ جس کے نتیجہ میں جون 1961ء میں غیر جانبدار ممالک کے سفراء کی ایک تیاری کانفرنس قاہرہ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس نے غیر جانبداریت کے پانچ اصولوں کی نشاندہی کی۔

1. وہ ملک جو پر امن بقائے باہم اور غیر جانبداریت پر مبنی آزادانہ پالیسی کو اپناتا ہو یا اس طرح کی پالیسی کی طرف اس کا رجحان ہو' 2. مسلسل قومی آزادی کی تحریکات کا حامی رہا ہو' 3. بڑی طاقتوں کے تصادم کے تناظر میں یہ ہمہ رخی فوجی اتحادات کا رکن نہ ہو' 4. کسی بیرونی طاقت کو فوجی اڈے بڑی طاقتوں کے تصادم کے تناظر میں نہ دیے ہوں' 5. باہمی یا علاقائی دفاعی معاہدہ کا رکن ہو تو یہ بڑی طاقتوں کے تصادم کے تناظر میں نہ ہو۔

پہلی غیر جانبدار چوٹی کانفرنس یکم تا چھ ستمبر 1961ء کو بلگریڈ (یوگوسلاویہ) میں منعقد ہوئی جس میں 25 ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ تین ممالک مبصر کے طور پر اس کانفرنس میں شرکت کیے۔ اس کانفرنس نے ایک 27 نکاتی اعلان نامہ جاری کیا۔ جس کے چند اہم نکات اس طرح تھے۔

1. بین الاقوامی امن کے تحفظ کے لیے عظیم طاقتوں سے اپیل' 2. نو آبادیت، جدید نو آبادیت اور سامراجیت کی تمام شکلوں کی مذمت' 3. دنیا کے کسی بھی حصہ میں جاری نسل پرستی کی مذمت' 4. تمام نو آبادیاتی عوام کے لیے آزادی کا مطالبہ' 5. الجیریا، تیونس، انگولا، کانگو میں عوامی جدو جہد آزادی کو سراہتے ہوئے یہاں سے بیرونی افواج کو ہٹالینے کا مطالبہ' 6. تمام ترقی پذیر ممالک کی معاشی، سماجی اور تہذیبی ترقی کا مطالبہ' 7. مکمل ترک اسلحہ کے لیے اپیل۔

دوسری غیر جانبدار چوٹی کانفرنس اکتوبر 1964ء میں قاہرہ (مصر) میں منعقد ہوئی۔ اس میں 47 ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی اس کے علاوہ گیارہ ممالک بحیثیت مبصر اس میں

1. بین الاقوامی تعلقات' ملکوٹے، نرسمہاراؤ (انگریزی) اسٹرلنگ پبلیشرز نئی دہلی۔ صفحہ 302

شرکت کیے۔ یہ کانفرنس اس اعتبار سے اہم تھی کہ گذشتہ بلگریڈ کانفرنس کے بعد زبردست تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی تھیں۔ 1962ء میں کیوبا کا میزائیلی بحران اور ہند۔ چین جنگ اہم ترین واقعات تھے۔ اس کے علاوہ نہرو کا بھی انتقال ہوچکا تھا۔ اس کانفرنس نے ''پروگرام برائے امن اور بین الاقوامی تعاون'' کے عنوان سے ایک اعلان نامہ جاری کیا۔ جس میں عالمی امن کی برقراری کے لیے آزادی، مساوات اور انصاف کے عالمگیر اصولوں پر زور دیا گیا۔ اور عالمی امن کے استحکام کے لیے سامراجیت، نوآبادیت اور جدید نوآبادیت کے خاتمہ کو لازمی قرار دیا گیا۔ پرامن بقائے باہم کے اصول اور بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لیے پرامن طریقوں پر زور دیا گیا۔ مکمل ترکِ اسلحہ پر زور دیتے ہوئے غیر نیوکلیر ہتھیار اقوام سے ان کی تیاری سے باز رہنے کا مطالبہ کیا گیا۔ تجربات پر جزوی امتناع کا معاہدہ PTBT میں زیرِ زمین تجربات پر امتناع کو بھی شامل کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ بیرونی فوجی اڈوں کو ہٹا لینے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ قاہرہ اعلان نامہ میں دوسرے ممالک کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت' نوآبادیاتی عوام کی مسلح جدوجہد آزادی کے ساتھ مکمل تعاون کے اصولوں پر زور دیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں گروپ 77 کا قیام عمل میں آیا۔ یہ گروپ ترقی یافتہ اقوام سے معاشی امور پر بات چیت کے لیے تیسری دنیا کا ایک اہم گروہ بن گیا۔ بعد میں اگرچیکہ اس کے اراکین کی تعداد میں اضافہ ہوا اس کے باوجود اسے گروپ 77 ہی کہا جانے لگا۔

تیسری چوٹی کانفرنس لوسا کا (زامبیا) میں ستمبر 1970ء میں منعقد ہوئی۔ بحیثیت رکن 54 ممالک نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں ایک اعلان نامہ اور چھ قرار دادیں منظور کی گئیں۔ اعلان نامہ کا عنوان ''غیر جانبداریت اور معاشی ترقی'' تھا۔ اس کے چند اہم پہلو اس طرح تھے۔

1. غیر جانبدار تحریک کی معنویت' 2. دنیا کی دھماکہ خیز صورتحال کے حوالہ سے ممالک خصوصاً عظیم طاقتوں سے اپیل کی گئی کہ وہ تنازعات کو پرامن طریقوں سے حل کرنے اور تناؤ کو کم کرنے کے لیے فوجی اتحادات کو ختم کرنے کا مطالبہ' 3. نوآبادیت کے خاتمہ کے عمل میں تیزی لائی جائے' 4. امن کے تحفظ کے لیے تمام ممالک کے درمیان معاشی تعاون کی اہمیت پر زور دیا گیا' 5. مقبوضہ علاقوں سے اسرائیل کی دستبرداری کا مطالبہ' 6. پرتگال اور جنوبی آفریقہ سے معاشی وسفارتی تعلقات کو اسوقت تک منقطع کرنے کا فیصلہ کیا گیا جب تک کہ وہ اقوام متحدہ کے فیصلوں کے مطابق نوآبادیت اور نسل پرستی کو ختم نہیں کر دیتے۔

چوتھی چوٹی کانفرنس الجیریا کے صدر مقام الجیرس میں ستمبر 1973ء میں منعقد ہوئی۔ جس میں 76 ممالک نے شرکت کی۔ اس کانفرنس نے ایک سیاسی اعلان نامہ، ایک معاشی اعلان نامہ کے علاوہ خصوصی موضوعات پر کئی قراردادیں منظور کیں۔ جنکے اہم نکات اس طرح تھے۔

1. بڑھتے دیتانت کے عمل کا خیر مقدم کرتے ہوئے پوری دنیا میں اس کے اطلاق اور استحکام کا مطالبہ، 2. نو آبادیت اور Aparthied کی مذمت، 3. تمام تنازعات کے پر امن حل پر زور دیا گیا تاکہ بین الاقوامی امن کا تحفظ ہو سکے، 4. عرب مقبوضہ علاقوں سے اسرائیل کے غیر مشروط اور مکمل تخلیہ کا مطالبہ، 5. معاشی استحصال کو ختم کرتے ہوئے امیر و غریب ممالک کے درمیان خلیج کو کم کرنے کا مطالبہ، 6. اس اصول سے اتفاق کیا گیا کہ ہر ملک کو اپنے قدرتی وسائل کو قومیانے اور اپنی بین الاقوامی معاشی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کا حق ہے۔ اس کے علاوہ ملٹی نیشنل کارپوریشنس کی جانب سے غریب ممالک کی معیشتوں کے استحصال کی مذمت۔

پانچویں کانفرنس 1976ء میں کولمبو (سری لنکا) میں منعقد ہوئی جس میں 86 ممالک نے شرکت کی۔ براعظم ایشیاء میں منعقد ہونے والی یہ پہلی کانفرنس تھی جس میں آفریقہ اور لاطینی امریکہ کے مسائل پر پہلے سے کہیں زیادہ توجہ دی گئی۔ اس کے علاوہ یہ کانفرنس اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے ویٹو کے طریقہ کار کو ختم کرنے اور اس غرض کے لیے اقوام متحدہ کے منشور میں ضروری ترمیم کا بھی مطالبہ کی۔ اس کانفرنس میں ایک نئے اور منصفانہ بین الاقوامی معاشی نظام کے قیام کا مطالبہ کیا گیا، جس میں اور باتوں کے علاوہ شامل ہو۔ 1. شرائط تجارت کے خصوصی حوالہ سے بین الاقوامی تجارت کی تشکیل نو، 2. ایک نئے بین الاقوامی تقسیم کار کی بنیاد پر عالمی پیداوار کی از سر نو تشکیل، 3. موجودہ بین الاقوامی مالیاتی انتظامات میں انقلابی تبدیلیاں اور 4) معاشی ترقی کے لیے ترقی پذیر ممالک کی مالی و ٹکنیکل مدد۔

امیر ممالک سے اپنا حصہ حاصل کرنے کے پختہ اعادہ کے باوجود غیر جانبدار ممالک نے یہ واضح کر دیا کہ وہ ترقی یافتہ ممالک سے کوئی تصادم نہیں چاہتے۔ بلکہ ترقی پذیر ممالک کی معاشی آزادی کے لیے ترقی یافتہ اقوام سے بامعنی تعاون اور مدد پر زور دیا گیا۔ اس کے علاوہ ترقی پذیر ممالک میں اجتماعی خود انحصاری پر بھی زور دیا گیا۔

چھٹی غیر جانبدار چوٹی کانفرنس 1979ء میں ہوانا (کیوبا) میں منعقد ہوئی۔ جس میں 94 ممالک نے حصہ لیا۔ گویا دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی کے نمائندے اور دنیا کے دو تہائی

ممالک اس کانفرنس میں شریک تھے۔ اس کانفرنس میں پہلی مرتبہ غیر جانبدار تحریک میں اختلافات نظر آنے لگے۔ چند انقلابی رکن ممالک جیسے کیوبا' ویت نام وغیر کا یہ اصرار تھا کہ دو عظیم طاقتوں کے درمیان بڑھتے دیتانت'' Detente '' کے عمل و تعاون کی وجہ سے تحریک دونوں کے درمیان مساوی دوری نہیں رکھ سکتی بلکہ اسے اب اشتراکی بلاک کے ساتھ ہوجانا چاہیئے چونکہ یہ بلاک مخالف سامراجیت اور مخالف نوآبادیت ہے۔ جب کہ دوسری طرف سنگاپور اور زائیر(Zaire) جیسے ممالک کا یہ اصرار تھا کہ غیر جانبدار تحریک کو مغربی بلاک یعنی امریکہ کے قریب ہوجانا چاہیئے چونکہ یہ بلاک اپنے وسائل کی بہتات اور ٹکنالوجی کی برتری کی وجہ سے غیر جانبدار ممالک کو معاشی ترقی کے حصول میں مدد دے سکتا ہے۔ تاہم' اکثریتی رائے یہی تھی کہ تحریک کو اپنے آزادانہ کردار کو باقی رکھتے ہوئے دونوں بلاکوں سے یکساں فاصلہ برقرار رکھنا چاہیئے۔

اس کانفرنس کا دوسرا اہم مسئلہ مصر کے اخراج کا تھا جس سے تحریک کے اتحاد کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ عرب رکن ممالک یہ چاہتے تھے کہ مصر کو تحریک سے بے دخل کیا جائے چونکہ وہ اسرائیل کے ساتھ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ پر دستخط کے ذریعہ عربوں کے مفاد کو نقصان پہنچایا ہے۔ تاہم اس مسئلہ پر بھی متفقہ رائے یہ سامنے آئی کہ مصر کے اخراج کو بعد کے لیے ملتوی کیا جائے۔ لیکن کانفرنس نے یکطرفہ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے لیے مصر و اسرائیل دونوں کی مذمت کی۔ کانفرنس نے اختتام پر اعلان نامہ میں عظیم طاقتوں کی من مانی سیاست کی مذمت کرتے ہوئے فوجی اتحادات اور فوجی اڈوں کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ امیر و غریب ممالک کے درمیان خلیج کو کم کرنے اور بحیرہ ہند کو منطقہ امن بنانے اور غیر جانبدار تحریک کے استحکام پر بھی زور دیا۔

ساتویں چوٹی کانفرنس مارچ 1983ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ دراصل یہ کانفرنس بغداد میں منعقد شدنی تھی۔ لیکن ایران۔عراق جنگ کی وجہ سے اس کو نئی دہلی میں منعقد کیا گیا۔ اس کانفرنس میں 99 ممالک حصہ لیے۔ اس کانفرنس نے نیوکلیر ممالک کی جانب سے نیوکلیر اسلحہ کے استعمال یا استعمال کی دھمکی پر امتناع عائد کرنے کا مطالبہ کیا۔ کانفرنس نے نیوکلیر اسلحہ کو رکھنے سے متعلق تمام نظریات کو مسترد کو مسترد کردیا اور نیوکلیر کو اسلحہ کو منجمد کرتے ہوئے تجربات پر مکمل امتناع کا مطالبہ کیا۔ اس کانفرنس میں لاطینی امریکہ کے مسائل پر زیادہ توجہ دی گئی۔ چنانچہ نکارا گوا پر امریکی حملہ اور ایلسلوڈر (El Selvader) وسوری نام (Suri Nam) کے داخلی معاملات میں مداخلت کی مذمت کی گئی۔ اسی طرح امریکہ کی جانب سے کیوبا پر عائد معاشی تحدیدات کی

مذمت کی گئی اور پناما حکومت کے ساتھ کیے گئے معاہدہ پر کاربند رہنے سے امریکی انکار کی سخت مذمت کی گئی۔ یہ کانفرنس نامیبیا اور جنوبی آفریقہ کے عوام کی تائید کا اعلان کرتے ہوئے نامیبیا کی آزادی سے متعلق اقوام متحدہ کی قرارداد کی فوری عمل آوری کا مطالبہ بھی کی۔ لیکن یہ کانفرنس ایران عراق جنگ کو ختم کروانے میں پوری طرح ناکام رہی۔ معاشی امور پر بھی اس کانفرنس میں حسب معمول توجہ دیتے ہوئے تیسری دنیا کے ممالک کی اجتماعی خود انحصاری پر زور دیا گیا۔

آٹھویں چوٹی کانفرنس ستمبر 1986ء میں ہرارے (زمبابوے) میں منعقد ہوئی۔ جس میں 101 ممالک حصہ لیے۔ اس کانفرنس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ تحریک کی سلور جوبلی کا سال تھا۔ اس کانفرنس میں نامیبیا کی آزادی اور جنوبی آفریقہ سے سے اپارتھائیڈ کے خاتمہ کے مسائل حاوی رہے۔ نامیبیا کی آزادی کے لیے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے خصوصی اجلاس کا مطالبہ کیا گیا، آفریقہ کی ترقی کے لیے ایک خصوصی فنڈ کا قیام عمل میں لایا گیا اور تیسری دنیا کے ممالک کے درمیان خبروں کی ترسیل کے لیے ایک خبر رساں ادارہ کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

نویں چوٹی کانفرنس ستمبر 1989ء میں پھر ایک بار بلگریڈ (یوگوسلاویہ) میں منعقد ہوئی جس میں 104 ممالک شرکت کیے۔ اس دوران عالمی سیاست میں تیزی سے تبدیلیاں آرہی تھیں۔ دونوں عظیم طاقتوں کے درمیان ترکِ اسلحہ پر بات چیت ثمر آور ثابت ہوچکی تھی اور درمیانی فاصلے تک وار کرنے والے اسلحہ کو ہٹانے کے لیے INF معاہدہ پر دستخط ہوچکے تھے۔ ایران عراق جنگ ختم ہوچکی تھی اور افغانستان سے سویت افواج کا تخلیہ بھی ہوچکا تھا اور کمپوچیا کا مسئلہ بھی پرُ امن طور پر حل ہورہا تھا۔

اس کانفرنس میں نہ صرف ترقی پذیر ممالک کے درمیان بلکہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان باہمی تعاون کے قیام پر زور دیا گیا۔ تحریک نے انصاف و مساوات پر مبنی ایک نئے معاشی نظام کے قیام کا فیصلہ کیا۔ یہ اقوام متحدہ میں اپنے اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے دنیا سے جنگ کو ختم کرنے میں اسکی تائید کا اعلان کی اور عالمی مسائل کے منصفانہ حل کے لیے تعاون کا عہد کی۔ دنیا سے نوآبادیت اور اپارتھائیڈ کو ختم کرنے کی اپنی جستجو کا اعادہ کرتے ہوئے دنیا میں انسانی حقوق کے تحفظ کا عہد کی۔ ایک نئے معاشی نظام کے قیام کے لیے امیر و غریب ممالک کے درمیان بات چیت کو جاری رکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ اس کانفرنس کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں امیر ممالک کے گروپ۔7 کی طرح ترقی پذیر ممالک کے گروپ۔

15 کا قیام عمل میں لایا گیا۔

دسویں نام(NAM) کانفرنس جکارتہ (انڈونیشیاء) میں ستمبر 1992ء میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں چند نئے ممالک جیسے فلپائین برونی ازبکستان اور تیرہ برس کے وقفے کے بعد مائینمار کی دوبارہ شمولیت سے اراکین کی تعداد بڑھ کر 108 ہوگئی۔ اس کانفرنس میں ترقی پذیر ممالک کی معیشت کو متاثر کرنے والے بین الاقوامی معاشی ماحول پر تعلق خاطر کا اظہار کرتے ہوئے ایک منصفانہ اور مساوی سماجی و معاشی نظام کے قیام کا مطالبہ کیا گیا' تاکہ امیر و غریب ممالک کے درمیان خلیج کم ہوسکے۔ اس کے لیے جنوب۔جنوب تعاون پر زور دیتے ہوئے شمال جنوب بات چیت کے احیاء پرزور دیا گیا۔ اس کانفرنس نے دنیا میں بڑھتی ہوئی ایک ملک کی سرداری اور اس کے تصور جمہوریت و انسانی حقوق کو دوسروں پر تھوپنے کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا۔

گیارہویں چوٹی کانفرنس کارٹاجینا (کولمبیا) میں اکٹوبر 1995ء میں منعقد ہوئی جس میں رکن ممالک کی تعداد بڑھ کر 113 تک پہنچ گئی۔ اس کانفرنس میں مابعد سرد جنگ دور میں غیر جانبدار تحریک کی معنویت و موزونیت پرشبہات کا اظہار کیا گیا۔ تحریک کے چیرمن اور کولمبیا کے صدر Ernesto Samper نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ دو قطبی نظام کے مقابلے میں یک قطبی نظام میں اسکی اہمیت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس کانفرنس نے غیر قانونی منشیات کی تجارت کوختم کرنے کے لیے عہد کیا اور سرحد پار سے دہشت گردی کی مذمت کرتے ہوئے رکن ممالک سے خواہش کی گئی کہ وہ دہشت گردوں کی مدد و تائید• سے گریز کریں۔ اس کانفرنس نے سلامتی کونسل کو زیادہ نمائندہ بنانے کے لیے مستقل اراکین کی رکنیت میں اضافہ پر زور دیا۔ غیر جانبدار تحریک کے اراکین نے مکمل ترکِ اسلحہ پرزور دیا اور کیوبا کے خلاف جاری امریکہ کی جانب سے طویل معاشی مقاطعہ وتحدیدات کوختم کرنے کی اپیل کی۔

بارہویں چوٹی کانفرنس ستمبر 1998ء میں جنوبی آفریقہ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں تحریک نے نیوکلیر ہتھیاروں کے حامل ممالک کی اجارہ داری کو امتیازی قرار دیتے ہوئے اسے ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور ایک غیر امتیازی نیوکلیر ماحول کی برقراری کے لیے عام تباہی کے نیوکلیر ہتھیاروں کوختم کرنے ایک بین الاقوامی کانفرنس کی ہندوستانی تجویز کو قبول کرلیا۔ دہشت گردی کے خلاف مشترکہ عالمی اقدامات کے لیے ایک بین الاقوام چوٹی کانفرنس کے لیے ہندوستان کی تجویز کو بھی منظور کرلیا گیا۔ اسی طرح باہمی تنازعات میں کسی تیسرے ملک کی

مداخلت کو اس کے اعلان نامہ میں رد کیا گیا۔ سوڈان پر امریکی ہوائی حملوں کی مذمت کرتے ہوئے، غیر جانبدار ممالک کے خلاف امریکہ کے جبری اقدامات کی مذمت کی گئی۔

تیرہویں نام کانفرنس 2002ء میں اردن میں منعقد ہوگی' اس کانفرنس کا طئے شدہ مقام بنگلہ دیش تھا لیکن 2001ء کے عام انتخابات کے بعد بننے والی خالدہ ضیاء کی نئی حکومت نے اس کانفرنس کے انعقاد سے معذرت کا اظہار کیا۔ جس کے نتیجہ میں ایران اور ہندوستان اس کے انعقاد کے لیے میزبانی کی پیشکش کیے لیکن بالآخر اردن کی میزبانی کی خواہش کو قبول کرلیا گیا۔

غیر جانبدار تحریک کا رول

غیر جانبدار تحریک سرد جنگ کے ماحول میں عالمی طاقتوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہی۔ غیر جانبداریت کے تصور نے ایک طرف امریکہ اور سویت یونین کے درمیان مثبت تعلقات کے فروغ کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا تو دوسری طرف ترکِ اسلحہ پر متعدد بار عالمی طاقتوں کو متوجہ کرتی رہی۔ غیر جانبدار تحریک کی وجہ سے اقوام متحدہ بڑی حد تک ایک موثر ادارہ بن گیا چونکہ اقوام متحدہ میں غیر جانبدار تحریک کے ممالک سب سے بڑا گروپ بنتے ہیں۔ غیر جانبدار تحریک کی وجہ سے ایشیاء آفریقہ اور لاطینی امریکی ممالک ایک دوسرے سے قریب ہوئے جس سے حقیقی معنوں میں عالمی بھائی چارگی کے تصور کو فروغ حاصل ہوا۔ غیر جانبدار تحریک نے نظریاتی تضادات سے بالاتر ہو کر ایک دنیا کے خواب کی بڑی حد تک تکمیل کی۔ اس کے علاوہ تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کے لیے بڑی طاقتوں کے جدید نوآبادیاتی ہتھکنڈوں سے نجات کا واحد راستہ رہی۔ مختلف علاقائی مسائل اور تصادم کے حل میں غیر جانبدار تحریک اقوام متحدہ میں اور اقوام متحدہ سے باہر موثر رول ادا کی۔ ایران عراق جنگ' مسئلہ افغانستان اور کمپوچیا کے حل میں غیر جانبدار تحریک نے بڑی طاقتوں پر ان مسائل کے حل کے لیے اور ان مسائل کے استحصال سے باز رہنے کی ترغیب دی۔ اس طرح غیر جانبدار تحریک عالمی معاشی مسائل جیسے غربت' بیروزگاری اور صنعت و ٹکنالوجی کی ترقی کے میدانوں میں مختلف ممالک کے درمیان ہم آہنگی اور تال میل کا کام انجام دی۔ اسی طرح بین الاقوامی تجارت کے لیے قواعد و ضوابط کو منضبط کرتے ہوئے تیسری دنیا کے ممالک کو بڑی طاقتوں کے معاشی استحصال سے بچانے کے اقدامات کیے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کی طرف سے کیے گئے تمام اقدامات غیر جانبدار تحریک کی مرہون منت ہیں۔

بلا شبہ غیر جانبدار تحریک کے بغیر مابعد دوسری جنگ عظیم دور کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا تھا۔ غیر جانبدار تحریک نے بین الاقوامی تعلقات کے موضوع کو وسعت اور ترقی دی۔ اور صحیح معنوں میں قوموں کے درمیان پہلی مرتبہ قریب تر تعلقات کا موجب بنی۔ اور اب غیر جانبدار تحریک عالمی سیاست کا متحرک اور مرکزی عنصر ہے۔ عالمی مسائل غیر جانبدار تحریک کے تعاون کے بغیر حل نہیں کیے جاسکتے۔ خصوصاً جدید بین الاقوامی معاشی نظام اور معاشی وسائل کی ازسرنو تقسیم کے لیے اقوام متحدہ کی کوششیں غیر جانبدار تحریک کی جستجو کا ہی ایک نتیجہ ہیں۔ چنانچہ UNCTAD اسکی ایک مثال ہے۔ غیر جانبدار تحریک میں شامل ممالک کا گروپ 77 اور 1990 میں قایم گروپ 15 عالمی معاشی تقسیم نو کے نقیب سمجھے جاسکتے ہیں۔

غیر جانبدار تحریک اور جدید بین الاقوامی معاشی نظام

جدید بین الاقوامی صورتحال میں غیر جانبدار تحریک کا رول کئی زاویوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اب غیر جانبدار تحریک ایک نئے بین الاقوامی معاشی نظام کے حصول پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے تاکہ تیسری دنیا کو معاشی راحت ملے اور اس میں بسنے والی عوام کے معیار زندگی کو اوپر لایا جاسکے۔ غیر جانبدار تحریک تمام قسم کے ظلم استحصال اور ناانصافیوں کے خلاف برسرپیکار ہے۔ اسی لیے وہ معاشی میدان میں بھی ایک نئے بین الاقوامی معاشی نظام کا مطالبہ کررہی ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے ساتھ ہی ایک نئے معاشی نظام کی تشکیل ضروری ہوگئی۔ چنانچہ اقوام متحدہ کو یکم مئی 1974ء کو ایک نئے عالمی معاشی نظام کی تشکیل کے لیے قرارداد منظور کرنی پڑی جسے غیر جانبدار تحریک کی مخالف نوآبادیت' سامراجیت اور جدید نوآبادیت سے مربوط کیا جاسکتا ہے۔

ابتدائی مراحل میں غیر جانبدار تحریک نے اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر قدرتی وسائل پر مملکتوں کی اجارہ داری کے اصول کو قایم کرنے کے لیے کام کیا۔ 1955ء کی بانڈونگ آفرو ایشیائی کانفرنس نے غیر جانبدار ممالک کی برآمدات کو ایک نئی سمت دینے پر توجہ مرکوز کی۔ لیکن یہ دور بنیادی طور پر غیر جانبدار تحریک کی سیاسی سرگرمیوں کا دور تھا جس میں اسے نوآبادیاتی اور سامراجی نظام کے خلاف سیاسی آزادی کے لیے اپنی توانائیاں صرف کرنی پڑیں۔ صرف 1960ء کے دہے میں ہی غیر جانبدار تحریک نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد جدید عالمی معاشی نظام کی اصطلاح میں سوچنے لگی۔ 1961ء کی پہلی بلگریڈ چوٹی کانفرنس نے معاشی عدم توازن کو ختم کرنیکی جدوجہد پر زور دیا۔ دوسری قاہرہ چوٹی کانفرنس میں بین الاقوامی معاشی تعلقات کی سابقہ ساخت

کی مذمت کی گئی اور ایک انصاف پر مبنی نئے معاشی تعلقات کے قیام پر زور دیا گیا۔ غیر جانبدار تحریک کی اس سمت میں سرگرمیاں ثمر آور ثابت ہونے لگیں اور اقوام متحدہ نے 1964ء میں UNCTAD کو قایم کیا اور اس کے بعد گروپ 77 کا قیام بھی عمل میں آیا۔

قاہرہ کانفرنس کے بعد غیر جانبدار تحریک نے نئے عالمی معاشی نظام کے لیے اہم رول ادا کیے اور اس سلسلہ میں کئی قرار دادیں اور اعلامیے جاری کیے۔ اس سلسلہ میں کیے گئے اہم اقدامات میں 1967ء کی الجیرس قرار داد اور UNCTAD کی دوسری قرار داد اور 1968ء کا دہلی اعلامیہ شامل ہے۔ NIEO کے لیے لوسا کا میں ایک Blue Print جاری کیا گیا۔ اس میں عالمی معاشی نظام کی خامیوں کی نشاندہی کی گئی اور اس بات پر زور دیا گیا کہ ترقی پذیر ممالک کی ترقی کے لیے تیز تر اقدامات اور مربوط پالیسیوں کو اپنایا جانا چاہیئے جس سے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں تجارتی شراکت داری کو فروغ ملے۔ اس کے بعد الجیرس کانفرنس نے عالمی معاشی ترقی کے مقاصد کے حصول کے لیے ممالک کی خود کفالتی اور اجتماعی انحصار کو ضروری قرار دیا۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے ممالک کے معاشی حقوق اور فرائض پر ایک منشور کی تیاری کا بھی مطالبہ کیا۔ کولمبو اور ہوانا کانفرنسوں میں معاشی اقدام کے پروگرام پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی۔ اسی طرح دہلی چوٹی کانفرنس میں بھی اسی مطالبہ کو دہرایا گیا۔ قوموں کے درمیان معاشی مساوات معاشی انصاف اور سیاسی مصالحت کو لازمی قرار دیا گیا۔ قوموں کی سیاسی اور معاشی آزادی دہلی کانفرنس کے اہم موضوع تھے۔ ہرارے کانفرنس میں نامیبیا کی آزادی آفریقہ کی ترقی کے لیے ایک علیحدہ فنڈ کا قیام اور غیر جانبدار ممالک کے لیے ایک علیحدہ خبر رساں ایجنسی کے قیام پر توجہ مرکوز کی گئی۔ اور غیر جانبدار ممالک کے درمیان خبروں کی ترسیل کے لیے ایک آزادانہ ادارہ کے قیام کی کوششوں کا آغاز کیا گیا۔ 1990ء کی بلگریڈ چوٹی کانفرنس میں غیر جانبدار ممالک کے درمیان معاشی تعاون کو مزید فروغ دینے، ترقی یافتہ ممالک پر معاشی انحصار کو کم کرنے اور عالمی معاشی تجارت کے لیے منصفانہ اقدامات کا مطالبہ کیا گیا اور اس سمت میں عملی اقدامات کے لیے غیر جانبدار ممالک کے پندرہ ممالک پر مشتمل ایک علیحدہ معاشی گروپ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جو تیسری دنیا کے معاشی مسائل اور معاشی امور پر ایک بااختیار نمائندہ گروپ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

☆☆☆

باب 20

خارجہ پالیسی تعریف و عوامل

Foreign Policy Definition and Factors

خارجہ پالیسی وہ پہیہ ہے جس کے ذریعہ بین الاقوامی سیاست کا عمل کام کرتا ہے۔ خارجہ پالیسی قومی پالیسی سے جدا نہیں بلکہ اس کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ یہ دوسری مملکتوں سے تعلقات کے فروغ اور قومی مفادات پر مشتمل ہوتی ہے۔ تمام مملکتیں اپنے قومی مفاد کو آگے بڑھانے کے لیے بین الاقوامی ماحول اور اپنی طاقت کے مطابق خارجہ پالیسی کا تعین کرتی ہیں۔ حالیہ عرصے میں خارجہ پالیسی کی اصطلاح اتنی وسیع ہوگئی ہے کہ اس میں ایک حکومت اور دوسری حکومت کے درمیان ہونے والے تمام تعلقات شامل ہیں۔ غیرسیاسی تعلقات بھی خارجہ پالیسی میں آتے ہیں۔ خارجہ پالیسی کی اصطلاح کو کئی مفکرین نے مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ Hartmann کے مطابق خارجہ پالیسی ''احتیاط سے طئے کردہ قومی مفادات کا باضابطہ بیان ہے'' اس طرح قومی مفاد خارجہ پالیسی کا اہم جز ہوتا ہے اور یہی مفادات خارجہ پالیسی کے مقاصد ہوتے ہیں۔ خارجہ پالیسی مملکتوں کی جانب سے متعین کیے جانے والے اصولوں کا مجموعہ ہے اور یہ ان مفادات پر مشتمل ہوتے ہیں جو مملکتوں کے درمیان تعلقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

خارجہ پالیسی کے اصول

خارجہ پالیسی قومی پالیسی کا وہ حصہ ہے جسے مملکتیں دوسری مقتدر مملکتوں سے متعلق اپناتی ہیں۔ تمام مملکتیں بین الاقوامی نظام کا حصہ ہونے کے باوجود مقتدر و آزاد بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ مملکتوں کا اقتدار اعلیٰ، ان کا ایک دوسرے پر آپسی انحصار، اور ان کے داخلی و خارجی حالات وہ عوامل (Factors) ہیں جو خارجہ پالیسی اور اس کی راہ کا تعین کرتے ہیں۔ پہلا عنصر مملکتوں کا اقتدار اعلیٰ ہے جو مملکتوں کی علاقائی سالمیت کے اصول کا تعین کرتا ہے۔ آپسی انحصار کا عنصر خارجہ پالیسی میں سودے بازی کے اصول کا تعین کرتا ہے، ہر مملکت کسی بھی حالت میں زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تیسرا عنصر داخلی اور خارجی حالات کا ہے، جو کہ حقیقت پسندانہ عامل ہے۔ کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی حسب ذیل تین اصولوں پر مبنی ہوتی ہے۔

1. علاقائی سالمیت کے تحفظ کا اصول

مملکت کا یہ بنیادی فرض قومی سرحدات کے تحفظ کے تصور پر صادق آتا ہے اور اگر ضروری ہوتو غیرملکی علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا جاتا ہے۔ وہ مملکتیں جو اپنے علاقے کی حفاظت چاہتی ہیں Statusquo کی پالیسی پر عمل کرتی ہیں۔ امریکہ کی علیحدگی پسند پالیسی ، Monroe Doctrine 1923 اور 1932ء کا Stimson Doctrine اس کی بہترین مثالیں ہیں۔وہ مملکتیں جو دوسروں کے علاقے پر قبضہ چاہتی ہیں رجعت پسند (Revisionist) پالیسی کو اپناتی ہیں اور اندرون یا بیرون ملک شہریوں کے مفادات کے تحفظ کی پالیسی کو وقار کی پالیسی (Policy of Prestige) کہتے ہیں۔

2. سودے بازی کا نظریہ Theory of Bargaining

بین الاقوامی سیاست میں مملکتوں کا ایک دوسرے پر انحصار ایک اہم واقعہ ہے۔ تمام مملکتیں چاہے بڑی ہوں یا چھوٹی کسی نہ کسی وجہ سے ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہیں۔ چنانچہ اس آپسی انحصار کی وجہ سے مملکتوں کے درمیان ٹکراؤ یا تعاون پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح مملکتیں ایک ایسی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جس میں بین الاقوامی رویہ ٹوٹنے نہ پائے۔ خارجہ پالیسی اس طرح کا توازن سودے بازی کے ذریعہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مثلاً ہندوستان اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا تھا تاکہ ہندپاک جھگڑے کی صورت میں مشرق وسطیٰ کی مملکتوں کو الگ تھلگ رکھ سکیں۔

3. قومی مفاد کے فروغ کا نظریہ

ہر مملکت کا یہ نیک فرض ہے کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی کے ذریعہ اپنے قومی مفادات کو فروغ دے۔ ہر مملکت کے مفادات میں تھوڑا بہت اختلاف وقت مقام اور محل وقوع کے لحاظ سے ضرور ہوتا ہے لیکن حفاظت خود اختیاری ، شہریوں کا تحفظ اور بھلائی تمام مملکتوں کے مشترکہ مفادات ہوتے ہیں جس کی بنیاد پر خارجہ پالیسی مرتب کی جاتی ہے۔

خارجہ پالیسی کو متعین کرنے والے عوامل

خارجہ پالیسی کو متعین کرنے والے عوامل اوپر بیان کیے گئے اصول ہیں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مملکتوں کو ضرورت کے لحاظ سے اپنی خارجہ پالیسی کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ ان

خصوصی مفادات کو خارجہ پالیسی کو متعین کرنے والے عوامل کہتے ہیں Padelford اور Lincoln نے ان عوامل کو دوحصوں میں تقسیم کیا ہے۔ 1. موضوعاتی (Subjective) 2. موقع جاتی (Situational)۔ پہلے میں مملکتیں اپنے مفادات کے متعلق سوچتی ہیں۔ جب کہ دوسرے میں مملکتوں کو قومی ماحول، بین الاقوامی ماحول اور حالات سے نمٹنے کی خود کی صلاحیت کا جائزہ لیتی ہیں۔ بہت سے مفکریں کا خیال ہے کہ قومی مفاد کا تصور ایک مبہم تصور ہے۔ چنانچہ Paul Seabury نے اس کے تین معنی بتلائے ہیں 1. وہ مقاصد جنھیں مملکتیں مستقبل قریب میں خارجہ پالیسی کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتی ہیں 2. مملکت کی وہ پالیسیاں جسے وہ بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں اپناتی ہیں 3. وہ پالیسیاں جو فیصلہ سازوں کے دماغوں میں مملکتی امور کو چلانے کے لیے ہوتی ہیں۔ چنانچہ K.J.Holsti نے مقاصد کے تصور (Concept of Objective) کو وضاحت کے لیے استعمال کیا۔ خارجہ پالیسی کو متعین کرنے والے عوامل کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

داخلی عوامل

1. تاریخی اور قومی اقدار

خارجہ پالیسی پر قوم کی تاریخ کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ تہذیب، رواج اور مزاج قوم کو ورثے میں ملتا ہے اور یہ ایک دوسرے کے تعلقات پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ تاریخ کسی قوم کی کامیابی یا ناکامی کا ریکارڈ ہے اور یہی کامیابیاں و ناکامیابیاں خارجہ پالیسی کے تعین میں رہنمائی کرتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ قوم ان سے دلی تعلق پیدا کرلیتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کی خارجہ پالیسی اس کی تاریخ کا فطری نتیجہ ہے۔ اس کی یہ پالیسی ان تمام تاریخی اصولوں کی عکاسی کرتی ہے جو کہ پنچ شیل اور بدھ مت کے آٹھ نکاتی اصولوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح امریکہ بین الاقوامی سیاست میں تبدیلیوں کے باوجود بھی اپنی علیحدگی پسند پالیسی کو ترک نہیں کرسکا اور دونوں عالمی جنگوں کے درمیان اسی پالیسی پر گامزن رہا۔ آج بھی امریکی عوام دوسرے ممالک کے سیاسی مسائل میں امریکہ کے ملوث ہونے پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔

چنانچہ روایتی پالیسی سے انحراف پر امریکیوں نے Non Move Vietnam کا نعرہ دیا تھا۔

2. جغرافیہ

جغرافیہ خارجہ پالیسی کو متعین کرنے اور اس پر اثرانداز ہونے والا اہم ترین عامل ہے۔

مختلف قوموں کی خارجہ پالیسی کے تجربے سے خارجہ پالیسی پر جغرافیہ کے اثرات عیاں ہوتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے برطانیہ کی خارجہ پالیسی توازن طاقت، سمندروں پر برتری اور سلطنت کی توسیع کے اصولوں پر مبنی تھی اور یہ اصول اس کے جغرافیائی اثرات کا ایک اہم حصہ تھے۔ برطانیہ سمندر سے گھرا ہوا ہے جو اسے پورے یوروپ سے الگ کرتا ہے۔ برطانیہ کے اس جغرافیائی محل وقوع کو جولیس سیزر اور ہٹلر بھی تسلیم کیے۔ 1823ء کے منرو اصول سے امریکی خارجہ پالیسی پر جغرافیہ کے اثرات واضح ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی غیر جانبداریت کی پالیسی پر بھی جغرافیہ کے اثرات ہیں۔ اگرچیکہ خارجہ پالیسی عوامل کے طور پر جغرافیہ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّمہ ہے۔ لیکن حالیہ برسوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے جغرافیائی عوامل بین الاقوامی تعلقات کے عملی پہلو میں نظر انداز ہوسکتے ہیں۔ ICBMS اور راکٹوں کی وجہ سے سمندر اور پہاڑ کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے۔ چنانچہ ایک مملکت اپنی خارجہ پالیسی میں دور دراز کے ملک کو بھی اپنے قریبی پڑوسی کی طرح سلوک کرنے لگی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جغرافیہ کی اہمیت گھٹ گئی ہے۔ سویت یونین کے مشرقی یوروپ سے تاریخی تعلق کی اہم وجہ جغرافیہ ہے۔ اس طرح امریکہ بھی جغرافیائی وجوہات کی بناء پر جنوبی امریکہ میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔

3. رائے عامہ

جمہوری اداروں کے قیام، معیار زندگی میں اضافہ اور تعلیم کی ترقی سے خارجہ پالیسی میں رائے عامہ کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مملکتیں رائے عامہ کی مخالفت پر کسی پالیسی کو اپنا نہیں سکتیں اور وہ کم از کم ایسے مفادات کو اپنائیں گے جس کی رائے عامہ مخالف نہ ہو۔ رائے عامہ خارجہ پالیسی کا تعین کرتی ہے بشرطیکہ وہ واضح اور مربوط ہو۔ غیر ترقی یافتہ مملکتوں کی بہ نسبت رائے عامہ ترقی یافتہ مملکتوں میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔

4. قومی صلاحیت

اس سے مراد مملکت کی فوجی تیاریاں، ٹکنالوجی کی ترقی اور جدید ذرائع مواصلات ہیں۔ اس کے علاوہ معاشی اور بہتر سیاسی اداروں کا تعلق بھی قومی صلاحیت سے ہے۔ ایک پالیسی کو قومی صلاحیت کے متوازن ہونا چاہیے چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی امریکی خارجہ پالیسی اس کی وضاحت ہے۔ 1823ء سے امریکہ علیحدگی کی پالیسی اپنا رہا تھا لیکن 20 ویں صدی کی زبردست معاشی ترقی کی وجہ سے وہ اس پالیسی کو ترک کرتے ہوئے بین الاقوامی سیاست میں

گہرے طور پر ملوث ہوگیا۔ اسی طرح 1971ء کے بعد ہندوستان کی صلاحیت میں اضافہ سے ہندوستان اپنی روایتی غیر جانبدار پالیسی میں قدرے تبدیلیاں لایا۔ قومی صلاحیت خارجہ پالیسی کا محور ہے۔ اس سے خارجہ پالیسی کا تعین اور عملی نفاذ ہوتا ہے۔ درحقیقت خارجہ پالیسی راست طور پر قومی صلاحیت سے جڑی ہوئی ہے۔ اگر مملکت کی قومی صلاحیت میں اضافہ ہوا تو اس کی خارجہ پالیسی میں بڑی تبدیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک ممتاز مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مثال کے طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نہ صرف یوروپ میں بلکہ ساری دنیا میں ایک کمتر طاقت بن کر رہ گیا اور اس تبدیلی کی وجہ سے برطانیہ کی خارجہ پالیسی تبدیل ہوگئی۔

خارجی عوامل

خارجی عوامل دو طرح کے ہوتے ہیں لچکدار، غیر لچکدار۔ لچکدار عوامل میں بین الاقوامی تنظیم اور عالمی رائے عامہ شامل ہیں۔ یہ متحرک عناصر ہیں چونکہ بین الاقوامی تنظیمیں، بین الاقوامی قانون اور معاہدات بین الاقوامی ماحول کو بناتے ہیں۔ بین الاقوامی ماحول عالمی رائے عامہ پر اثرانداز ہوتا ہے۔ مملکتوں کو خارجہ پالیسی بناتے وقت اس متحرک بین الاقوامی سیاست کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس مملکتوں کا ردعمل Dynamic نہیں ہوتا بلکہ اسے ہم غیر لچکدار عوامل کہہ سکتے ہیں۔ مملکتوں کے اپنے حدود ہوتے ہیں جہاں پر یہ چند باتوں کے لیے راضی اور چند دوسری باتوں کے لیے ناراض ہوتے ہیں۔ ان کے چند پڑوسی دوست اور دشمن بھی ہوتے ہیں۔ یہ مستقل عوامل ہیں۔ ہند۔ پاک اختلافات ہندوستان کی خارجہ پالیسی میں ایک مستقل عامل ہے۔

1. بین الاقوامی تنظیم

بین الاقوامی تنظیمیں خارجہ پالیسی کے تعین میں اہم رول ادا کررہی ہیں۔ مملکتیں بین الاقوامی قانون، معاہدات اور Contracts کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ان کی خلاف ورزی سے ان کی پالیسی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ کمیونسٹ چین بڑی مدت تک ان عوامل پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا رہا جس کے نتیجے میں بین الاقوامی تعلقات میں اسے صحیح مقام نہ مل سکا۔ 1971ء کے بعد ہی اس نے ان عوامل کی اہمیت کو تسلیم کیا جس سے بین الاقوامی سیاست میں چین کو نئی جہت ملی۔

2. عالمی رائے عامہ

عالمی رائے عامہ ایک متحرک عنصر ہے اور یہ خارجہ پالیسی پر موقتی طور پر اثرانداز ہوتی

ہے۔اس میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر داخلی رائے عامہ، عالمی رائے عامہ کی تائید کرے تو تب یہ بہتر طور پر خارجہ پالیسی کا تعین کرسکتی ہے۔

3. مملکتوں کا ردعمل

مملکت مملکتوں کو اپنی پالیسی بناتے وقت دوسری مملکتوں کے مفادات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہ کبھی بھی ایسے مفادات کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرسکتیں جو کہ بنیادی طور پر دوسری مملکتوں کے مفادات کے بالکل خلاف ہو۔ اگرکوئی پالیسی دوسری مملکتوں کے ردعمل کا شکار ہوجائے تو یہ بری طرح ناکام ہوجاتی ہے۔ ہٹلر 1931ء میں برطانیہ کے ردعمل کا لحاظ کیے بغیر پولینڈ پر حملہ کرکے ایک بھیانک غلطی کیا تھا۔ جس کا نتیجہ دوسری جنگ عظیم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح جاپان امریکی ردعمل کا غلط اندازہ کرتے ہوئے **Pearl Harbour** پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں جاپان کو بھیانک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکہ جو اس وقت جنگ میں شامل نہیں تھا بعد میں جاپان کو تہس نہس کرکے رکھ دیا۔

4. پالیسی سازی کے عوامل

خارجہ پالیسی کے تعین میں سیاست دانوں کے بشمول تمام پالیسی ساز اہم رول ادا کرتے ہیں۔ چونکہ خارجہ پالیسی کو آخری شکل دینا زعماء **(Elites)** کا کام ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے حالات اور شخصیت کے اثرات فطری طور پر پالیسی پر پڑتے ہیں۔ ان کے اس کام میں کئی محکمہ جاتی ماہرین مدد کرتے ہیں۔ ہندوستان کی خارجہ پالیسی پر نہرو کا اثر واضح ہے۔

5. سربراہِ حکومت اور خارجہ پالیسی

ایک مطلق العنان خارجہ پالیسی ڈکٹیٹر کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ جمہوریت میں عام عوام اس میں موثر طور پر حصہ لینے کے قابل نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے خارجہ پالیسی کو مرتب کرنے کی ذمہ داری زعماء پر عائد ہوتی ہے۔ امریکہ صدر ٹرومن کا کہنا ہے کہ صدر خارجہ پالیسی کو بناتا ہے۔ پارلیمانی جمہوریت میں خارجہ پالیسی پر وزیر اعظم کی مرضی چلتی ہے۔ نہرو کے دور میں ہندوستان کی خارجہ پالیسی نہرو کے خیالات کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ اس طرح برطانیہ کی خارجہ پالیسی پر وزرائے اعظم **Disrael**، چرچل اور لارڈ اٹلی کے اثرات واضح تھے۔

سیاست اور نظم ونسق میں شخصیت کے اثرات بڑے اہم ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض مرتبہ صدر یا وزیر اعظم سے زیادہ اہم وزیر خارجہ، پالیسی کے تعین میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اٹلی کی

وزارت عظمیٰ کے زمانے میں Sir Earnest Biven خارجہ پالیسی کو متعین کرنے والا اہم شخص تھا۔ اس طرح Eisenhower کے زمانے میں John Foster Dulles، نکسن اور فورڈ کے زمانے میں ہنری کیسنجر امریکی خارجہ پالیسی کی علامت بن گئے تھے۔

6. مقنّنہ

مقنّنہ جمہوری حکومتوں میں پالیسی سازی کے لیے آخری اتھاریٹی ہوتی ہے۔ حکومت اور مالیہ پر اس کا کنٹرول ہوتا ہے۔ چنانچہ خارجہ پالیسی پر مقنّنہ اثرانداز ہوتی ہے دوسری جنگ عظیم کے بعد قومی مفادات کے فروغ کے لیے معاشی امداد کا ایک نیا پہلو سامنے آیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے حکومتوں کو مالیہ کی منظوری کے لیے مقنّنہ پر انحصار کرنا پڑا۔ خصوصاً امریکی حکومت خارجی امور میں سینٹ کا کنٹرول بہت بڑھ گیا اور اس طرح سے مقنّنہ حکومت کو جانب سے کیے جانے والے اقدامات اور پالیسیوں کی توثیق بھی کرتی ہے۔

7. خارجہ دفتر اور دوسری خدمات

نظریاتی طور پر وزراء پالیسی بناتے ہیں اور مستقل عہدیدار اسے عملی جامہ پہناتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر عہدیدار پالیسی بناتے ہیں اور وزراء صرف ان کی توثیق کرتے ہیں یا پھر مشورے لیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اگر وزیر کسی پالیسی کو اپنی مرضی کے مطابق ہی رکھنا چاہتا ہو تو متعلقہ عہدیداروں پر صرف اس پالیسی پر عمل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ خارجہ پالیسی صرف ڈپلومیسی پر ہی انحصار نہیں کرتی بلکہ اسے فوجی قوت اور سائنس دانوں پر بڑی حد تک انحصار کرنا پڑتا ہے۔ آج کی دنیا میں ہتھیار بہت کم استعمال ہوتے ہیں بلکہ انہیں صرف ''دھمکانے'' کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہاں سائنس داں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح حکومت کو انٹلیجنس ایجنسی کی جانب سے دی جانے والی امداد پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ CIA کا رول ایک کھلا راز ہے۔ اسی طرح سویت یونین کی K.G.B بھی اپنی سرگرمیوں کے لیے مشہور تھی۔

8. نظریات

نظریات خارجہ پالیسی کی بنیاد کے ساتھ ساتھ منزل بھی ہے۔ مملکتیں سیاسی اور معاشی اداروں کو نظریات کی بنیاد پر قایم کرتے ہیں اور انھیں اصولوں کو خارجہ پالیسی کے میدان میں بھی دیکھنے کی خواہاں ہوتی ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات میں نظریات وہ مقصد ہے جسے مملکتیں حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ امریکہ و سویت یونین کے درمیان کشیدگی کی نوعیت نظریاتی

جنگ ہی کی تھی۔

9. قومی مفاد اور قومی اقدار

خارجہ پالیسی کے ذریعہ قومی مفاد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پالیسی ساز اپنے قومی مفادات کے تحت پالیسیاں بناتے ہیں۔ اگر وہ کسی نکتہ پر راضی ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قوم کے لیے نقصان دہ نہیں اس کا ہر قدم قومی مفاد کے تابع ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ Lord Palmerstone کا کہنا ہے کہ خارجہ پالیسی میں دوستی اور دشمنی نہیں ہوتی بلکہ قومی مفاد مستقل ہوتا ہے۔

خارجہ پالیسی کے مقاصد

خارجہ پالیسی کے مقاصد کی اگر کسی ایک لفظ کے ذریعہ وضاحت ہوسکتی ہو تو وہ لفظ بلاشک وشبہ ''قومی مفاد'' ہے۔ لیکن یہ لفظ اتنا مبہم ہے کہ اسے آسانی سے سمجھا نہیں جاسکتا۔ اصولی طور پر خارجہ پالیسی ہمیشہ قومی مفاد کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ لیکن عملی طور پر پالیسی بین الاقوامی ماحول اور طاقت کے Pattern میں ان مقاصد سے بہت دور ہوسکتی ہے۔ سویت یونین کی خارجہ پالیسی کا مقصد کمیونزم کے پھیلاؤ کے لیے عالمی انقلاب تھا۔ امریکہ نے 1930ء سے خصوصیت سے اعلان کیا ہے کہ وہ دنیا میں جمہوریت کی تائید کریگا۔ دونوں ممالک اپنے ان پالیسی مقاصد سے کافی دور ہیں جیسا کہ سویت یونین ایران اور عراق کی مدد کرتا تھا جب کہ ان ممالک کی پالیسی کمیونزم کی مخالف ہے اور امریکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مطلق العنان حکومتوں کی مدد کرتا آیا ہے جو اس کی روایتی پالیسی کے خلاف ہے۔

خارجہ پالیسی کے مقاصد کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1. اقتدار اور مفادات

کسی قوم کی پالیسی کو اس کا اقتدار اور مفادات متعین کرتے ہیں۔ ان مقاصد کی بنیادیں وہ ضروریات اور عقائد ہوتے ہیں جن پر کہ مملکت کا وجود ہوتا ہے۔ یہ ضروریات اور عقائد حسب ذیل ہوتے ہیں۔

a) قومی سلامتی

قومی سلامتی خارجہ پالیسی کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ مملکتیں اس مقصد کے تحت اتحادات، معاہدات اور دوستی قایم کرتے ہیں۔ دوسرے ممالک سے قومی سلامتی کا تصور صرف علاقائی یکجہتی یا قومی سرحدات کی صیانت تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں تہذیب اور سیاسی اداروں، عقائد اور

اقدار کی صیانت بھی شامل ہے۔

b) معاشی ترقی

معاشی مفادات کا فروغ خارجہ پالیسی کا ایک اہم مقصد ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سے قومی وجود کا سوال جڑا ہوتا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں مملکت کے وقار کا تعین معاشی معیار سے ہوتا ہے۔ ہمیشہ مملکت اس طرح کے اقدامات کی کوشش کرتی ہے جس سے اس کی معاشی ترقی اور خوشحالی ہو سکے۔

2. درمیانی مقاصد

درمیانی مدت کے مقاصد میں بین الاقوامی تعاون وقار اور مفادات کا تحفظ شامل ہے۔ ان مقاصد کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے۔

a) با اثر حلقوں کے مفادات

عالمی مفادات کے ساتھ با اثر حلقے عالمی سیاست میں ایک نیا واقعہ ہیں جن کا خارجہ پالیسی میں کافی اثر ہوتا ہے۔ یہ با اثر حلقے متعلقہ حکومتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور حکومت ان کے مفادات کو اپنی خارجہ پالیسی میں شامل کرتی ہے تا کہ قومی سیاست میں استحکام لایا جاسکے۔ ہندوستان کی جانب سے اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے اور عربوں کی تائید کرنے کی وجہ، ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودگی ہے۔ اسی طرح امریکہ کی یہودی نواز پالیسی داخلی سیاست میں یہودیوں کا اثر ہے۔

b) غیر سیاسی تعاون

بین الاقوامی سیاست کے میدان میں ایسا تعاون سب سے زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ خارجہ پالیسی کی مقاصد میں معاشی، تہذیبی اور سماجی تعاون کو شامل کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ چنانچہ ملکوں کو دی جانے والی معاشی امداد اور مملکت کی جانب سے غیر ملکی طلباء کو دی جانے والی سہولتوں سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔

c) قومی وقار کا فروغ

اس طرح کے مقاصد میں وہ پالیسیاں شامل ہوتی ہیں جن کا مقصد بیرون ملک قومی وقار میں اضافہ ہوتا ہو۔ عموماً اس مقصد کے لیے مملکتیں Mass Media کے ذریعہ پروپگنڈہ کے

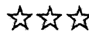
طریقوں کو اپناتی ہیں۔

d) علاقائی وسعت

علاقائی توسیعت کی پالیسی سامراجیت اور نوآبادیت پر مشتمل ہوتی ہے جسے مملکتیں اپنی معاشی اور سیاسی خواہشات کی وجہ سے اپناتی ہیں۔ 18 ویں تا 20 ویں صدی تک یوروپی مملکتیں مارکٹ اور خام مال کے لیے سامراجیت کی پالیسی کو اپنائے تھے۔ اس کے علاوہ یوروپی امور میں برتری جتانا بھی ان کا مقصد تھا۔ جدید زمانے میں روایتی سامراجیت کی پالیسی تبدیل ہوگئی ہے اور اب اس کے دو طریقہ ہیں۔ پہلی وہ پالیسی ہے جس کا مقصد اپنے اثرات کو اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ دوسری وہ پالیسی ہوتی ہے جس کا مقصد معاشی وسائل کو اپنے قابو میں کرنا ہوتا ہے تاکہ دوسری مملکتوں کا ان پر انحصار ہو۔ مغربی یوروپی ممالک اور امریکہ کی معاشی اور ڈالر کی سامراجیت اس کی مثال ہے۔

3. عالم گیر طویل مدتی مقاصد

بین الاقوامی نظام کے تعمیر نو کے مقاصد یہ درجے میں آتے ہیں۔ نظریاتی منصوبے اور خواب جو عالمی نظام کو قایم کرتے ہیں خارجہ پالیسی کا ہی حصہ ہوتے ہیں۔ جیسے ہٹلر نے ہزار سالہ Reich کا خواب دیکھا تھا یا سوشلسٹ نظام میں عالمی انقلاب کا تصور یا دنیا کو جمہوریت کے لیے مخصوص رکھنے کا امریکی تصور اور سویت یونین کے خاتمے کے بعد نئے عالمی نظام (New World Order) کی امریکی منطق وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔



باب 21

ہندوستان کی خارجہ پالیسی
India's Foreign Policy

کسی ملک کی خارجہ پالیسی بین الاقوامی امور میں اسکے مقاصد کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ہندوستان کی خارجہ پالیسی طویل جدوجہد آزادی کے دور میں تشکیل پائی۔ پچھلے باب میں خارجہ پالیسی کو متعین کرنے والے عوامل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان عوامل کا اطلاق کم وبیش تمام ممالک کی خارجہ پالیسیوں پر ہوتا ہے۔ بعض ممالک کی خارجہ پالیسی میں بعض عوامل کا اثر نمایاں اور مضبوط ہوسکتا ہے جب کہ دوسرے عوامل کا اثر کم یا کمزور ہوسکتا ہے۔ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کو متعین کرنے والے عوامل کا ذیل میں جائزہ لیا جائے گا۔

خارجہ پالیسی کو متعین کرنے والے عوامل

1. جغرافیائی عوامل Geographical Factors

کے۔ یم پانیکر نے کہا تھا کہ ''کسی ملک کی خارجہ پالیسی اس کے جغرافیائی محل وقوع سے متعین ہوتی ہے اور ہر پالیسی کا مقصد علاقائی صیانت ہوتا ہے' اور یہ جغرافیائی عوامل سے متعین ہوتی ہے''۔ چنانچہ ہندوستان جغرافیائی طور پر دنیا کے مرکزی منطقہ میں واقع ہے۔ یہ ایک بڑا جزیرہ نما ہے۔ جسکے تینوں جانب سمندر ہے۔ شمال مغرب وشمال مشرق میں پھیلے وسیع ہمالیائی پہاڑی سلسلے اسکے لیے محفوظ سرحدات فراہم کرتے ہیں۔ ہندوستان 15,200 کلومیٹر طویل زمینی سرحد کے علاوہ 6,100 کلو میٹر طویل ساحلی سرحد کا بھی حامل ہے۔ ہندوستان کے جغرافیائی محل وقوع کے متعلق مشہور مورخ Arnold Toynbee نے کہا ہے کہ ''ہندوستان شمال مشرق میں جاپان اور شمال مغرب میں آئیر لینڈ کے درمیان پائی جانے والی وسیع زمین کو جوڑنے والی ایک کڑی ہے''۔ اسی طرح 17 مارچ 1950ء کو پارلیمنٹ کو مخاطب کرتے ہوئے جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ''ہم چاہیں بھی تو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتے کہ مغربی ایشیاء، جنوب مشرقی ایشیاء اور مشرق بعید سے قریبی ماضی وحال کے تعلقات کے ساتھ ہم بحیرہ ہند اور ایشیاء میں مرکزی مقام پر ہیں۔ اب ایشیاء کا بڑا حصہ نوآبادیاتی ماضی سے آزاد ہوگیا ہے۔ ہمارا ذہن لازمی طور پر مغربی' مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیاء میں دوسرے ممالک سے پرانے تعلقات اور پرانے دنوں کی طرف جاتا ہے''۔ روس کے متعلق کہتے ہوئے نہرو نے کہا تھا کہ ''ہندوستان

اسے نظر انداز نہیں کر سکتا چونکہ وہ ایک طاقتور پڑوس ہے۔ ہندوستان کو اسکے ساتھ دوستانہ ماحول میں رہتے ہوئے اسے تعاون دینا چاہیے ورنہ وہ ہمارے بازو میں ایک کانٹا ہوگا۔ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اکٹوبر 1947ء میں شمالی مغربی کشمیر جس پر پاکستان کے قبضہ سے پہلے' سویت یونین اور ہمارے درمیان افغانستان کا صرف ایک چھوٹا علاقہ حائل تھا''۔ چنانچہ روس سے یہ جغرافیائی قربت، دوسرے عوامل کے علاوہ غیر جانبدار پالیسی اپنانے کے لیے نہرو پر اثر انداز ہوئی۔ اگر ہم مغربی بلاک میں شرکت کیے ہوتے تو ہم کو سویت یونین کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا اور نہرو اس سے گریز کرنا چاہتے تھے۔

چین کو چھوڑ کر رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ہندوستان اپنے تمام پڑوسیوں میں سب سے بڑا ملک ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستان کا اثر ورسوخ بھی اس علاقہ میں زیادہ ہوگا۔ ہندوستان ایک طرف اپنے وسیع و عریض جغرافیائی حدود کی سلامتی کے لیے دفاعی تیاریوں پر توجہ مرکوز کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے چھوٹے پڑوسیوں کے ساتھ بہتر تعلقات کے لیے مسلسل کوشاں رہتا ہے۔ ہندوستان کا بڑا جغرافیہ اسکے چھوٹے پڑوسیوں کے لیے خوف کا باعث نہ ہو اسکے لیے ہندوستان پُر امن بقائے باہم کی پالیسی کے ذریعہ چھوٹے پڑوسیوں اور چین کے ساتھ خوشگوار تعلقات کی جستجو کرتا ہے۔ تاریخی طور پر ہندوستان کا محل وقوع بیرونی قوموں کی آماجگاہ رہا ہے۔ ہندوستان پر تمام تر بیرونی حملے شمال اور مغرب سے ہوئے۔ صرف یوروپی اقوام ہندوستان کو جنوب میں سمندری راستوں سے آئے۔ اسی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے تک ہندوستان کی دفاعی تیاریاں صرف شمال مغرب کی سرحدات پر تھیں۔ لیکن اب مشرقی بحری کمان کے قیام کے ذریعہ سمندری حدود پر توجہ مرکوز کی جارہی ہے۔ دنیا کی 75% تجارت بحیرہ ہند سے گذرتی ہے۔ بحیرہ ہند کا سب سے بڑا ملک ہونے کی حیثیت میں ہندوستان ان آبی تجارتی گذرگاہوں کی محافظت کے فرائض انجام دے سکتا ہے، جو کہ اب بیرونی طاقتوں کی نگرانی میں ہیں۔ ہندوستان کی اس جغرافیائی خصوصیت کو دیکھ کر سابق امریکی سکریٹری آف اسٹیٹس ہنری کیسنجر نے کہا تھا کہ ہندوستان میں ایک عظیم طاقت بننے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں اور ہندوستان کا اثر ورسوخ بڑھ رہا ہے۔

2. فوجی عوامل Military Factors

ہندوستان کی سلامتی کے خدشات اور فوجی ضرورتوں کا خارجہ پالیسی کو متعین کرنے میں اہم رول ہے۔ ہندوستان کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ دشمن پڑوسیوں سے گھرا ہوا ہے۔ 1962ء میں ہندوستان پر چین کا حملہ اور پاکستان سے لڑی گئیں تین جنگیں یہ بتاتی ہیں کہ ہم کو فوجی طور پر ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ چین اور پاکستان دونوں ہی نیوکلیر صلاحیت کے حامل ملک ہیں تو ہندوستان کے لیے

سلامتی کے خدشات وخطرات میں اضافہ ہوجاتا ہے۔اسکے علاوہ ہندوستان کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ دو نیوکلیر دشمن ممالک کی متحدہ فوجی طاقت کو سامنے رکھ کر اپنی سلامتی کی تیاریوں پر توجہ مرکوز کرے۔ چنانچہ داخلی طور پر فوجی تیاریوں کے علاوہ ہندوستان کو دوسرے طاقتور ممالک سے بھی فوجی ضروریات کے آلات وہتھیار حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ ہندوستان کا روس' فرانس' اسرائیل اور چند دوسرے ممالک سے فوجی اشتراک وتعاون ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے فوجی عوامل کو پیش کرتے ہیں۔ نپولین نے کہا تھا کہ ''سفارتکاری طاقت کے بغیر ایسی ہی ہے جیسے آلہ کے بغیر ساز''۔ ہندوستان کو جنوب میں پھیلے وسیع سمندری حدود اور شمال مغرب میں پھیلے ناہموار سرحدات کی حفاظت کے لیے ہمہ اقسام کے اسلحہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تمام ضرورتیں ہندوستان خود اپنے طور پر نہیں کرسکتا بلکہ اسے دوسرے ممالک سے تعاون ومدد لینا پڑتا ہے۔ پچھلے برسوں میں ہندوستان کی سویت یونین سے قربت اور اسکے ساتھ معاہدہ دوستی کے پیچھے فوجی عوامل بھی کارفرما تھے۔فوجی طور پر طاقتور ہندوستان عالمی امور میں زیادہ اثر انداز رول اپنا سکتا ہے۔فوجی طاقت کے بغیر کوئی بھی ملک اپنے وسیع جغرافیہ کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ جب کہ وسیع جغرافیہ اور فوجی طاقت قومی طاقت اور صلاحیت کے اہم عوامل ہیں۔امریکی برتری' اسکی فوجی طاقت' جغرافیائی محل وقوع اور وسیع وعریض جغرافیہ میں پوشیدہ ہے۔

3. تاریخی عوامل Historical Factors

تاریخی طور پر ہندوستان ایک قدیم ملک ہے مذہب' فلسفہ اور فنون میں ہندوستان کا حصہ قابل قدر ہے۔ ہندوستان ایک طرف روحانی طور پر مختلف مذاہب اور تمدنوں کا مرکز ہے تو دوسری طرف ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ ہندوستانی سرحدوں سے باہر عالمی تہذیبوں کو متاثر کیا ہے۔ہندوستان تاریخی طور پر امن صلح وآشتی کا ملک ہے۔یہ وہ سرزمین ہے جہاں سے دنیا کے دو قدیم پرامن مذاہب بدھ مت اور جین مت نکلے۔مہاویر اور گوتم بدھ سے لیکر گاندھی تک تمام مفکرّین نے امن اور صلحِ کل کا پر زور پیغام دیا ہے۔ہندوستانی حکمراں اشوک اعظم عالمی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے جس نے کلنگ کی لڑائی کے بعد جنگ سے توبہ کی تھی اور بدھ مت کو اختیار کرتے ہوئے دنیا میں امن کا پرچار کیا تھا۔ ہندوستانی تاریخ کی یہی روایت کی جھلک طویل جدوجہد آزادی میں بھی دکھائی دیتی ہے۔مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہندوستان نے اہنسا اور ستیہ گرہ کے اصولوں پر چل کر آزادی حاصل کی ہے۔اسی لیے آزادی کے بعد ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں عدم تشدد، عالمی امن اور پرامن بقائے باہم پر رکھی گئیں۔تاریخی طور پر ہندوستان بیرون ملک حملہ آور نہیں ہوا۔آج بھی ہندوستان کے کوئی توسیعت

پسندانہ عزائم نہیں ہیں۔ اسی طرح ہندوستان دنیا میں نو آبادیت اور سامراجیت اور مخالف نسل پرستی جذبات کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔

4. معاشی عوامل Economic Factors

ہندوستان دنیا کی دوسری بڑی آبادی والا ترقی پذیر ملک ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے لیے جغرافیائی سلامتی کے ساتھ ساتھ معاشی سلامتی کے اقدامات پر بھی توجہ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ آج ہندوستان کی آبادی 104 کروڑ ہے اور آئندہ پچیس برسوں میں ہندوستان سب سے بڑی آبادی والا ملک بن جائیگا۔ چنانچہ آبادی کی بڑھتی معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے داخلی تدابیر و منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ بیرونی ذرائع سے آبادی کی معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ خصوصاً غذا اور توانائی کے میدان میں ہندوستان کا بیرونی انحصار بڑھتا جائے گا۔ بیرون ملک ہندوستانی شہریوں سے آبادی کی بیروزگاری میں کچھ حد تک کمی ہوتی ہے۔ ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہندوستان کو اپنی خارجہ پالیسی کی تدوین کرنا پڑتا ہے۔ معاشی طور پر خود کفیل ممالک بااثر موقف رکھتے ہیں اور انکی معاشی طاقت اقوام عالم میں انہیں رتبہ عطا کرتی ہے، جرمنی و جاپان رقبہ کے اعتبار سے چھوٹے ہونے کے باوجود اپنی معاشی طاقت کی وجہ سے دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اسی لیے ہندوستان آٹھ تا دس فیصد معاشی ترقی کے نشانہ کے ساتھ آگے بڑھنے کے لیے کوشاں ہے۔ عالمی تجارت میں ہندوستان کا حصہ صرف ایک فیصد ہے۔ جب کہ دنیا کی آدھی غریب آبادی (تقریباً 450 ملین) ہندوستان میں رہتی ہے۔ ایسے میں ہندوستان کے لیے آزادانہ خارجہ پالیسی اور موقف کو اپنانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ ہندوستان تمام ترقی یافتہ ممالک سے امداد اور تعاون کا متمنی ہے۔ اسی وجہ سے سرد جنگ کے ماحول میں ہندوستان نے اپنے لیے غیر جانداریت کی راہ چنی تھی۔ ہندوستان کی 60 تا 70 فیصد تیل کی ضرورت مغربی ایشیاء سے پوری ہوتی ہے۔ اسی لیے ہندوستان مغربی ایشیاء میں فلسطین اور عربوں کا حمایتی رہا ہے۔

5. نظریاتی عوامل Ideological Factors

نظریاتی طور پر ہندوستان جمہوریت، مساوات، آزادی سماجی انصاف اور بین الاقوامی امن و بھائی چارگی میں یقین رکھتا ہے۔ اسی لیے ہندوستان کسی بھی قسم کے بیرونی دباؤ کو قبول نہیں کرتا۔ سامراجیت' نو آبادیت کے خلاف اسکی آواز اسکی نظریاتی وابستگی کی وجہ سے تھی۔ آفریقہ کی آزادی اور نسل پرستی کے خلاف اسکی جدو جہد عالمی بھائی چارگی کے اسکے تصور سے ہم آہنگ تھی۔

بانڈونگ کانفرنس ہندوستانی قیادت کی نظریاتی پہلوؤں کی عملی تعبیر تھی جس میں ایشیاء آفریقہ کی وحدت کا اعلان کیا گیا اور جو بعد میں غیر جانبدار تحریک کے قیام کا باعث بنی۔ نہرو سامراجیت اور توازن طاقت دونوں کے مخالف تھے۔ نہرو کے فیبین اشتراکی (Fabian Socialism) تصورات نہ صرف ملک کی معیشت کو ''اشتراکی طرز سماج'' کی راہ پر ڈالے بلکہ عالمی سطح پر انہیں مخالف سامراجیت بنا دیا۔ تیسری دنیا کی وحدت نہرو کا ایک دیرینہ خواب تھا۔ اسلحہ سے پاک پر امن دنیا شروع سے ہی ہندوستان کی تصوراتی دنیا ہے۔ اس لیے ہندوستان ترکِ اسلحہ کے محدود منصوبوں کے جواب میں عالمگیر اور مکمل ترکِ اسلحہ کی دعوت دیتا ہے جسمیں تمام ممالک اپنے آپ کو اسلحہ سے پاک کر لیں اور عالمی امن کو خطرہ میں نہ ڈالنے کا عہد کریں۔ پنچ شیل کے اصول عالمی زندگی میں ہندوستانی کردار کی عکاسی کرتے ہیں۔ دستور ہند نے بھی رہنمایانہ اصولوں میں عالمی امن کے قیام میں مثبت رول ادا کرنے کی مملکت ہندوستان کو ہدایت دی ہے۔

6. شخصی و داخلی عوامل Personal and Internal Factors

ہندوستان کی خارجہ پالیسی پر نہرو کی شخصیت کا اثر ہے۔ آزادی کے بعد بحیثیت وزیر اعظم اور خارجہ دفتر کے ذمہ دار کے طور پر نہرو نے ہندوستان کی خارجہ پالیس کو وضع کیا تھا۔ چاہے وہ غیر جانبداریت کی پالیسی ہو یا پنچ شیل کے اصول نہرو کے دانشورانہ افکار اور فعال شخصیت کا نتیجہ ہیں۔ بعد میں کانگریس اور حکومت میں نہرو کا ورثہ خارجہ پالیسی پر حاوی رہا۔ کانگریس اقتدار کے خاتمہ کے بعد بھی یہ اصول ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے بنیادی پتھر ثابت ہوئے۔ اسکے علاوہ ہر دور میں وزیر اعظم وزیر خارجہ اور سکریٹری خارجہ کی شخصیت خارجہ پالیسی کو مدون کرنے میں نمایاں رول ادا کرتی ہے۔ چنانچہ خارجہ پالیسی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کے ذہن و فکر اور ترجیحات کی عکاسی کرتی ہے۔ خارجہ پالیسی کو چلانے والے ذمہ دار سفراء بھی دفتر خارجہ کو مسلسل مواد اطلاعات وغیرہ کی فراہمی کے ذریعہ موقتی پالیسی کے تعین پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ملک کے داخلی سیاسی حالات، حکمران جماعت کی فکر و مقاصد اور ملک کے مجموعی سیاسی رجحانات وہ دیگر عوامل ہیں جو ملک کی خارجہ پالیسی پر اپنے گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ ملک کی آبادی کی نوعیت اور خصوصیات بھی خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کی آبادی میں مسلم آبادی مغربی ایشیاء و دیگر مسلم ممالک سے قریبی تعلقات کے لیے ذمہ دار ہے۔ ہندوستان کی مسلم آبادی کے اثرات کی وجہ سے ہندوستان عرب اور فلسطینی کاز کی حمایت کرتا ہے۔ کسی مسئلہ پر عوامی ردعمل اور

رائے عامہ بھی خارجہ پالیسی کی تدوین پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چنانچہ خارجہ دفتر عوامی ردعمل کے مطابق عالمی برادری میں ہندوستان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی حالات اور ماحول کے لحاظ سے خارجہ پالیسی تبدیل ہوسکتی ہے۔ مندرجہ بالا عوامل متحرک عوامل ہیں جو بدلتے جاتے ہیں۔ حکومت کی تبدیلی یا وزیر خارجہ کی تبدیلی سے پالیسی کے عملی پہلوؤں میں نمایاں تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔

7. قومی مفاد National Interest

کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی اپنے قومی مفاد کے تابع ہوتی ہے۔ بدلتے قومی مفاد کے ساتھ خارجہ پالیسی بھی تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ ہندوستان کا قومی مفاد ملک کی داخلی و خارجی تحفظ' آبادی کی معاشی و سماجی ضرورتوں کی تکمیل اور تہذیبی و اخلاقی قدروں کے تحفظ و اشاعت میں ہے۔ ہندوستان پڑوس میں امن کو اپنے قومی مفاد میں دیکھتا ہے۔ اسی وجہ سے سرد جنگ کے کشیدہ ماحول میں ہندوستان نے غیر جانبداریت کی پالیسی کو اپنایا تھا اور اسی قومی مفاد کے مطابق اس پر آج تک کاربند ہے۔ برسوں اسرائیل کی مخالفت اور عربوں سے دوستی ہندوستان کے قومی مفاد میں تھی۔ لیکن الاقوامی حالات میں تبدیلی اور فلسطین و اسرائیل کے درمیان راست بات چیت کی راہ ہموار ہونے سے' ہندوستان اسرائیل سے دوستی کو اپنے قومی مفاد میں دیکھا اور اسرائیل سے روابط قایم کرلیا۔ دہشت گردی کے خلاف امریکی اقدامات کو ہندوستان کی تائید قومی مفادات کے مطابق ہے۔ اس طرح بین الاقوامی تعلقات میں کسی سے دوستی مستقل ہوتی ہے اور نہ ہی کسی سے دشمنی بلکہ صرف قومی مفاد مستقل ہوتا ہے۔ خارجہ پالیسی دراصل قومی مفاد کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔

ہندوستانی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول

ڈسمبر **1948**ء میں خارجہ پالیسی سے متعلق ایک قرارداد میں کانگریس پارٹی نے کہا تھا کہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کو لازماً ان اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے جو ماضی میں کانگریس کی رہنمائی کئے تھے۔ اور یہ اصول ہیں' عالمی امن کا فروغ' قوم کی آزادی' نسلی مساوات اور سامراجیت و نوآبادیت کا خاتمہ۔ کانگریس خصوصاً ایشیاء و آفریقہ کے عوام کی آزادی میں دلچسپی رکھتی تھی جو کئی نسلوں سے نوآبادیت کا شکار رہے ہیں۔ اس طرح اس قرارداد سے ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصولوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ ذیل میں انکا مختصراً جائزہ لیا جائے گا۔

1. نوآبادیت اور سامراجیت کی مخالفت

چونکہ ہندوستان خود دو سو سالہ برطانوی سامراج کا شکار رہا ہے اس لیے ابتداء سے ہی اگی

پالیسی مخالف نوآبادیت اور مخالف سامراجیت رہی ہے۔ چنانچہ 7 ستمبر 1946ء کو عبوری حکومت کے قیام کے بعد نہرو نے قوم سے خطاب میں کہا تھا کہ ہندوستان نوآبادیت کے خاتمہ کے لیے کام کرے گا۔ اس عہد کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان تمام بین الاقوامی فورموں میں سامراجیت کے خلاف آواز اٹھاتا رہا ہے۔ عملی طور پر ہندوستان' انڈونیشیاء' لیبیاء' تیونس وغیرہ کی آزادی کا حمایتی رہا ہے۔ ہندوستان کو اس رویّہ کی وجہ سے نوآبادیاتی اور سامراجی طاقتوں کے غیض وغضب کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن کسی بھی قیمت پر اس پالیسی کو نہ چھوڑنے کا اعلان کرتے ہوئے نہرو نے کہا تھا کہ "ہندوستان اپنی اس پالیسی کو نہیں چھوڑے گا۔ میں دنیا کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس طاقت یا اس طاقت کی فوجی قوت سے نہیں ڈرتے......انسانیت کی ترقی کے لیے جو ضروری ہے اسے کرنے سے ہندوستان کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا"۔ چنانچہ نامیبیا کی آزادی اور فلسطینیوں کے وطن کے لیے ہمیشہ آواز اٹھاتا رہا ہے۔

2. نسلی امتیاز کی مخالفت

ہندوستان نسل، ذات اور تمدن کی بنیاد پر کسی بھی طرح کے امتیازات کا مخالف ہے۔ وہ عالمگیر بھائی چارگی کے اصول پر یقین رکھتا ہے۔ ہندوستان پہلا ملک تھا جو بین الاقوامی سطح پر نسلی امتیازات کے خلاف آواز اٹھایا اور جنوبی آفریقہ کی اس پالیسی کی مذمت کیا۔ نسلی امتیاز کی پالیسی کو ترک کرنے کے لیے جنوبی آفریقہ کی سفید فام حکومت پر دباؤ ڈالنے اور مداخلت کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ 1952ء میں بارہ آفروایشیائی ممالک کے ساتھ اقوام متحدہ میں اپارتھائیڈ کے خلاف آواز اٹھایا اور اس بات پر زور دیا تھا کہ جنوبی آفریقہ کا یہ عمل نہ صرف اقوام متحدہ کے منشور اور اعلان نامہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے بلکہ یہ عالمی امن کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے۔ بعد کے برسوں میں ہندوستان امریکہ میں نیگرو باشندوں کے مفادات اور رہوڈیشیاء میں آفریقی آبادی کے مسائل میں دلچسپی لیتا رہا۔ سفید فام آبادی کی حکمرانی کے خلاف زمبابوے اور نامیبیا کی آزادی میں ہندوستان ایک اہم رول ادا کیا۔

3. بین الاقوامی امن کا فروغ

ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا مقصد بلا تفریق سیاسی و معاشی نظام تمام ممالک کے ساتھ دوستی اور تعاون قایم کرنا ہے۔ تاکہ ساری دنیا میں امن اور معاشی ترقی کے حالت پیدا ہوں۔ دستور ہند کے چوتھے حصے میں رہنمایانہ اصولوں میں حکومت ہند سے عالمی امن اور صیانت کے لیے کام کرنے کی خواہش کی گئی ہے (دفعہ 51)۔ چنانچہ ہندوستان امن کے لیے کام کرتا ہے' ہندوستان کا یقین ہے کہ بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ نیوکلیر ہتھیاروں کی تباہ کن نوعیت کی وجہ سے انسانیت کو تباہ کردے گی۔ قوموں

کے بین انحصار سے ایک چھوٹی روایتی جنگ بھی ہمارے ترقیاتی پرگراموں کو متاثر کرسکتی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی افواج اقوام متحدہ کے امن مشن میں حصہ لیتی رہی ہیں۔

4. پنچ شیل اور پرامن بقائے باہم

ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا ایک اور اہم اصول پرامن بقائے باہم اور باہمی تعاون ہے۔ پرامن بقائے باہم کا اصول پنچ شیل میں پیش کیا گیا۔ یہ اصول ہندوستان اور چین کے درمیان تبت کے مسئلہ پر 29 مئی 1954ء کو کیے گئے معاہدے میں اپنائے گئے تھے۔ یہ پانچ اصول ہیں:

1. ایک دوسرے کی علاقائی یکجہتی اور اقتدار اعلی کی عزت کرنا' 2. ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرنا' 3. ایک دوسرے کے داخلی امور میں عدم مداخلت' 4. مساوات اور باہمی مفاد' 5. پرامن بقائے باہم (Peaceful Co-existence)۔

5. غیر جانبداریت Non-alignment

ہندوستان کی آزادی کے وقت دنیا دوقطبی نظام میں منقسم تھی۔ چونکہ ہندوستان عالمی سیاست میں ایک موثر رول ادا کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ اپنے آپ کو دونوں طاقتوں سے دور رکھنے کی پالیسی اپنایا۔ نہرو نے کہا تھا کہ "ہندوستان ایک بڑا رول ادا کرسکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کسی طاقت کے ساتھ نہ ہو جس سے جنگ کا خوف ہوتا ہو اور جنگ کی تیاری لازمی ہوتی ہو"۔ انہوں نے کہا تھا کہ "کسی ایک طاقت سے اپنے آپ کو وابستہ کرتے ہوئے ہم کو اپنی رائے کو چھوڑنا پڑے گا اور اپنی پالیسی کو چھوڑتے ہوئے اس پالیسی کو اپنانا پڑے گا جو وہ چاہتے ہیں"۔ اس طرح ہندوستان سرد جنگ کے تناؤ میں دو طاقتوں کے فوجی اتحادات سے علیٰحدہ رہا اور دنیا میں سرد جنگ کے تناؤ کو کم کرنے میں قائدانہ رول ادا کیا۔ بالآخر غیر جانبدار تحریک کا قیام عمل میں آیا۔ نہرو کے بعد بھی ہندوستان اسی پالیسی پر گامزن رہا اور غیر جانبدار تحریک کے لیے موثر رول ادا کیا۔ 1983ء میں ساتویں چوٹی کانفرنس کے دہلی میں انعقاد کے ذریعہ تحریک سے اپنی وابستگی کے تقاضوں کو پورا کیا۔

6. ایشیائی ممالک کے ساتھ خصوصی تعلقات

اگرچیکہ ہندوستان پوری دنیا میں امن اور ممالک کے درمیان باہمی تعاون کا حامی ہے، لیکن اسکی توجہ خصوصیت کے ساتھ ایشیائی ممالک پر زیادہ ہے۔ یہ ایشیائی ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات کو پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ یہ ایک متحدہ ایشیاء میں یقین رکھتا ہے جو مختلف بلاکوں اور گروہوں میں منقسم نہ ہو۔ سارک (SAARC) میں ہندوستان کا تعاون اسکی مثال ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان

ASEAN کی رکنیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔اسی طرح وسطی ایشیاء، مغربی ایشیاء اور جنوب مشرقی ایشیاء کے ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات کا حامی ہے۔

7. دولتِ مشترکہ سے تعلقات

دولتِ مشترکہ کے ساتھ اچھے تعلقات ہندوستانی خارجہ پالیسی کی ایک اور خصوصیت ہے۔آزادی کے بعد ایک جمہوری دستور کو اپنانے کے باوجود ہندوستان دولتِ مشترکہ کی رکنیت رکھتا ہے چونکہ اسے وہ معاشی و دیگر میدانوں میں اپنے لیے فائدہ مند سمجھتا ہے۔

8. اقوام متحدہ میں یقین

ہندوستان اکٹوبر 1945ء سے اقوام متحدہ کا ابتدائی رکن ہے۔یہ اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں میں اپنے یقین کا اظہار کرتا ہے۔عالمی امن کی برقراری کے لیے اقوام متحدہ کی تمام کوششوں میں یہ ہمیشہ شریک رہتا ہے۔اور 10 مئی 1991ء کو سفیر ہند برائے اقوام متحدہ نے خصوصی کمیٹی برائے برقراریٔ امن آپریشنس کو کہا کہ ہندوستان برقراریٔ امن کی اقوام متحدہ کوششوں کی حمایت کرتا ہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ایسی کاوشیں متعلقہ ممالک کی علاقائی یکجہتی اور وقار کو ملحوظ رکھ کر کی جانی چاہیئے۔اقوام متحدہ کا مستقبل اصلاحات پر منحصر ہے۔چنانچہ اقوام متحدہ کو زیادہ جمہوری اور نمائندہ بنانے کے لیے سلامتی کونسل کے موجودہ ڈھانچے میں تبدیلی و توسیع کا حامی ہے۔

9. ترکِ اسلحہ

ہندوستان کی خارجہ پالیسی ہمیشہ روایتی اور نیوکلیر اسلحہ کے خلاف رہی ہے۔ہندوستان نیوکلیر توانائی کے پرامن استعمال کے حق میں تو ہے' لیکن نیوکلیر ہتھیاروں کے خلاف ہے۔1985ء میں ہندوستان نئی دہلی میں چھ اقوام کی نیوکلیر ترکِ اسلحہ کانفرنس منعقد کیا جس میں ترکِ اسلحہ کے لیے ٹھوس تجاویز پیش کیے گئے۔وہ نیوکلیر اسلحہ پر چند ایک طاقتوں کی اجارہ داری کے خلاف ہے اور چاہتا ہے کہ تمام ممالک یکساں طور پر ترکِ اسلحہ کے ذریعہ اپنے اپنے ہتھیاروں کو ختم کردیں تاکہ توازنِ طاقت کا کھیل ہی نہ ہو اس لیے ہندوستان NPT اور CTBT پر دستخط نہیں کیا۔چونکہ ان کی نوعیت امتیازی ہے۔

پڑوسی اور دوسرے ممالک سے ہندوستان کے تعلقات

ہند۔پاک تعلقات　Indo-Pak Relations

ہند۔پاک تعلقات میں تناؤ قیام پاکستان کے وقت سے ہی ہے۔پاکستان کا قیام محمد علی جناح کے دوقومی نظریئے کی بنیاد پر تقسیم ہند کے ذریعہ عمل میں آیا۔ہندوستان اور پاکستان کے درمیان

تعلقات میں کشیدگی کی بڑی وجہ کشمیر کا مسئلہ ہے کشمیر کا رقبہ 84,471 مربع میل ہے۔ 1941 کی مردم شماری کے مطابق کشمیر کی آبادی 40,02,000 تھی، جس میں سے 77% آبادی مسلمان اور بقیہ ہندو، بدھسٹ اور سکھ تھی۔ کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ آزاد رہنا چاہتے تھے۔ لیکن پاکستان معاشی ناکہ بندی کے ذریعہ پاکستان میں شمولیت کے لیے اس پر دباؤ ڈالنے لگا۔ یہاں تک کہ 22 اکتوبر 1947ء کو پاکستانی قبائل نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ پاکستان کی فوج بھی ان حملہ آوروں کے ساتھ تھی۔ مہاراجہ کی چھوٹی سی فوج اس حملہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی چنانچہ اس نے نئی دہلی سے مدد کی اپیل کی۔ بالآخر 26 اکتوبر 1947ء کو مہاراجہ نے ہندوستان سے الحاق کے معاہدہ پر دستخط کر دیئے اور ہندوستانی فوج کو کشمیر میں حملہ آوروں کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا گیا۔ ڈسمبر 1947ء میں ہندوستان نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے اپیل کی۔ 21 اپریل 1948ء کو سلامتی کونسل نے استصواب عامہ (Plebiscite) کے ذریعہ مسئلہ کے حل پر زور دیا۔ بالآخر یکم جنوری 1949ء سے اقوام متحدہ کی نگرانی میں جنگ بندی کا آغاز ہوا۔ لیکن ایک تہائی کشمیر پاکستان کے قبضہ میں چلا گیا۔ 1956ء میں نہرو نے کشمیر میں جنگ بندی خط کو بین الاقوامی سرحد میں تبدیل کرنے اور جوں کی توں حالت کو بنائے رکھتے ہوئے مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے حل کرنے کی تجویز رکھی، لیکن پاکستان استصواب عامہ کے مطالبہ پر اٹل رہا۔ اگست۔ ستمبر 1965ء میں پاکستان، ہندوستان پر حملہ کیا، لیکن اسے بری طرح پسپائی ہوئی۔ جنوری 1966ء میں سویت یونین کی ثالثی سے ہندوستان و پاکستان کے درمیان تاشقند معاہدہ ہوا۔

7 ڈسمبر 1970ء کو ہوئے پاکستان کے پہلے عام انتخابات میں قومی اسمبلی پاکستان کے لیے مشرقی پاکستان کو متعینہ 169 نشستوں میں سے 167 نشستیں مشرقی پاکستان کے قائد شیخ مجیب الرحمٰن کو حاصل ہوئے۔ اس طرح قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان کے شیخ مجیب الرحمٰن کو مطلق اکثریت حاصل تھی۔ لیکن ایک مشرقی پاکستانی کو وزیر اعظم بننے سے روکنے کے لیے 3 مارچ کو منعقد شدنی قومی اسمبلی کے اجلاس کو یکم مارچ 1971ء کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کیا گیا۔ جسکے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں پر تشدد عوامی ردعمل سامنے آیا جسے روکنے کے لیے فوجی کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ تقریباً دس ملین مہاجرین مشرقی پاکستان سے ہندوستان میں پناہ لیے۔ حکومت ہندوستان نے شیخ مجیب الرحمٰن اور حکومت پاکستان کے درمیان سیاسی سمجھوتے کی کوششیں کیں تاکہ مہاجرین واپس ہوسکیں اور ہندوستان کو زائد معاشی بوجھ سے نجات مل سکے۔ لیکن 3 ڈسمبر 1971ء کو پاکستان نے ہندوستانی فضائیہ کے اسٹیشن پر حملہ کر دیا جسکے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہوئی جس میں بالآخر پاکستانی افواج کو

ہتھیار ڈالنے پڑے اور ایک آزاد بنگلہ دیش کا وجود عمل میں آیا۔ تقریباً نود ہزار پاکستانی فوجی جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ جولائی 1972ء میں وزیر اعظم ہندوستان مسز اندرا گاندھی اور وزیر اعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان شملہ میں ایک سمجھوتہ ہوا جو شملہ سمجھوتہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ میں دونوں قائدین تمام مسائل کو پر امن طریقوں سے باہمی طور پر حل کرنے پر رضامند ہوئے۔ پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی عمل میں آئی اور حقیقی خط قبضہ **(Line of Actual Control)** کو دونوں ممالک کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لیا گیا۔

18 مئی 1974ء کو ہندوستان راجستھان کے صحراء میں پوکھران کے مقام پر پہلا پر امن نیوکلیر تجربہ کیا تو ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا کہ اگر قومِ پاکستان کو گھانس بھی کھانا پڑے تو وہ بم بنا کر رہیں گے۔ اور اسکے بعد سے پاکستان اسکی تیاری میں لگا رہا۔ ڈسمبر 1979ء میں افغانستان میں سویت یونین کی مداخلت کے نتیجے میں پاکستان کو امریکی خارجہ پالیسی میں صف اول کے ملک کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ امریکہ افغانستان میں سویت یونین سے لڑائی کے لیے پاکستان کو استعمال کرنے اور بھاری فوجی و معاشی مدد دینے لگا۔ پاکستان کو چالیس F-16 لڑاکا طیاروں AWACS طیاروں اور دیگر اسلحہ کے ساتھ ساتھ 3.2 بلین ڈالر کی بھاری معاشی مدد امریکہ کی جانب سے دی گئی۔ پاکستان کو دی جانے والی اس مدد پر ہندوستان نے اعتراض کیا اور کہا کہ پاکستان اسے ملنے والی امداد کا استعمال ہندوستان کی سلامتی کو خطرے میں ڈالنے کے لیے کرتا رہا ہے۔ اسکے جواب میں پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق نے ہندوستان کو "ناجنگ" معاہدہ کی پیشکش کی جسے ہندوستان نے قبول نہیں کیا۔ 1985ء میں جنرل ضیاء الحق کے دورہ دہلی کے موقع پر نیوکلیر تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کے لیے دونوں ممالک کے درمیان رضامندی ہوئی تھی جسے ڈسمبر 1988ء میں بے نظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کے دور میں ایک معاہدہ کی شکل دیدی گئی۔ جنوری 1991ء میں دونوں ممالک کے درمیان پہلی بار نیوکلیر تنصیبات سے متعلق جانکاری کا تبادلہ عمل میں آیا۔ تب سے ہر سال اس جانکاری کا تبادلہ عمل میں آ رہا ہے۔

پہلے پنجاب اور بعد میں کشمیر میں سرحد پار سے دہشت گردی دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں ایک نیا ماحول اسوقت پیدا ہوا جب مئی 1998ء میں ہندوستان اپنا دوسرا اور پاکستان اپنا پہلا نیوکلیر تجربہ کیا۔ چنانچہ اسوقت کے وزیر اعظم پاکستان مسٹر نواز شریف نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان دو دن میں چھ نیوکلیر تجربات کر کے بھارت کے ساتھ حساب برابر کر لیا ہے۔ دونوں ممالک پر امریکہ و دیگر بڑی طاقتوں نے

معاشی تحدیدات عائد کردیئے۔اس بدلے ہوئے ماحول میں دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں بہتری کے لیے وزیر اعظم واجپائی نے فبروری 1999ء میں امرتسر سے لاہور تک بس سفر کے ذریعہ پاکستان کا دورہ کیا۔لیکن اسی سال جون میں کارگل میں پاکستان کی مداخلت سے بس ڈپلومیسی کے ذریعہ ہموار تعلقات تقریباً مسدود ہوئے۔مزید اکٹوبر 1999ء میں پاکستان میں فوجی بغاوت کے ذریعہ جنرل پرویز مشرف کے اقتدار پر آنے سے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں زبردست تعطل پیدا ہوگیا۔ہندوستان کا موقف یہ تھا کہ وہ صرف ایک منتخبہ حکومت سے ہی بات کرے گا۔بعد میں اپنے موقف میں تبدیلی کرتے ہوئے ہندوستان نے جنرل پرویز مشرف کو آگرہ چوٹی ملاقات کے لیے مدعو کیا۔چنانچہ جولائی 2001ء میں آگرہ میں دودن کی چوٹی ملاقات کا مثبت نتیجہ نہیں نکلا پاکستان دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں کشمیر کو مرکزی موضوع بنانے پر اصرار اور اس مسئلہ کو سلجھائے بغیر تعلقات میں پیشرفت سے انکار کیا۔لیکن اس چوٹی ملاقات سے دونوں ممالک کے درمیان بحالیٔ اعتماد کے اقدامات Confidence Building Measures سامنے آئے۔دوسری طرف 11 سپٹمبر 2001ء کو امریکہ پر ہوئے دہشت گرد حملوں کے خلاف امریکی اقدامات میں پاکستان امریکہ کا ساتھ دیا اور افغانستان میں طالبان حکومت کے خلاف فوجی کارروائی کے لیے مدد فراہم کیا۔ہندوستان بھی امریکہ کو مدد کی پیشکش کیا اور افغانستان میں نئی حکومت کے قیام میں بھرپور سفارتی رول ادا کیا۔13 ڈسمبر 2001ء کو ہندوستانی پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کے حملوں کے بعد ہندوستان پاکستان سے اپنے سفیر کو واپس بلالیا اور دونوں ممالک کے درمیان چل رہے سمجھوتہ اکسپرس اور سد بھاؤنا بس سفر کو یکم جنوری 2002ء سے منقطع کردیا۔ہندوستان کا مطالبہ ہے کہ پاکستان ہندوستان میں دہشت گرد کارروائیوں کو روک دے اور مطلوبہ دہشت گردوں کو حوالے کردے۔دونوں ممالک کی افواج سرحد پر پوزیشن سنبھالے تیار کھڑی ہیں۔کشیدگی کی اس سطح پر جنگ کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔

ہند۔چین تعلقات Sino-Indian Relations

چین ہمارا سب سے بڑا اور طاقتور پڑوسی ہے۔اس کا رقبہ ہندوستان 3.39 ملین مربع کلومیٹر کے مقابلے میں 9.56 ملین مربع کلومیٹر ہے اسکی آبادی 125 کروڑ اور فی کس آمدنی ہندوستان کی 380 ڈالر کے مقابلے میں 750 ڈالر ہے[1] چین ہندوستان کی آزادی کے دوسال بعد یکم اکٹوبر 1949ء کو آزاد ہوا۔ ہندوستان اسے تسلیم کرنے والا دنیا کا دوسرا ملک تھا۔لیکن 18 نومبر 1949ء کو عوامی جمہوریہ

1. دی ہندو 8 جون 2000ء صفحہ 25

چین کی نئی حکومت نے حکومت ہند کو بھیجے گئے ایک نوٹ میں North-East Frontier Area کے علاقہ میں 1914ء کی طئے شدہ میکماہن خط (Mc Mahan Line) کو تسلیم کرنے سے نہ صرف انکار کردیا بلکہ اس معاہدہ کو ہی مسترد کردیا۔ 30 ڈسمبر 1949ء کو چین نے اعلان کیا کہ تبت کی آزادی اس کا بنیادی مقصد ہے۔ چنانچہ اکٹوبر 1950ء میں تقریباً چالیس ہزار چینی فوج تبت میں داخل ہوگئی۔ اور بھاری تعداد میں تبّتی ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے۔ تبت کے مسئلہ پر 1954ء میں ہوئے پنچ شیل معاہدے سے تعلقات میں بہتری پیدا ہوئی۔ 1960ء میں چینی وزیراعظم چوائین لائی نے نہ صرف ہندوستان کا دورہ کیا بلکہ ہند۔ چین بھائی بھائی کا نعرہ بھی دیا۔ لیکن اسکے دو سال بعد 1962ء میں چین ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔

دونوں ممالک کے درمیان 2896 کلومیٹر لمبی سرحد میں اکسائی چن اور ارونا چل پردیش کا علاقہ سب سے زیادہ متنازعہ ہے۔ چنانچہ دونوں ممالک کے درمیان مشرقی سیکٹر میں 90,000 مربع کلومیٹر، وسطی سیکٹر میں 2000 کلومیٹر اور مغربی سیکٹر میں 3300 کلومیٹر کا علاقہ متنازعہ ہے اور یہ اب چین کے قبضہ میں ہے۔ 1976ء میں دونوں ممالک کے درمیان دوبارہ سفارتی تعلقات استوار ہوئے اور 1979ء میں اسوقت کے وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپائی نے چین کا دورہ کیا تھا لیکن اس دوران ویتنام پر چینی حملہ کے خلاف وہ بطور احتجاج اپنا دورہ مختصر کرکے واپس لوٹے۔ 1981ء میں چینی وزیر خارجہ ہوانگ ہو کے دورہ ہندوستان سے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اور اعلیٰ سطح پر سرحدی بات چیت کا دوبارہ آغاز ہوا۔ ڈسمبر 1988ء میں وزیر اعظم راجیو گاندھی نے چین کا دورہ کیا جس کے نتیجے میں خارجہ سکریٹریز کی سطح پر سرحدی بات چیت کے لیے ایک ورکنگ گروپ تشکیل دیا گیا۔ 1991ء میں وزیراعظم چین لی۔ پنگ نے ہندوستان کا دورہ کیا اور ستمبر 1993ء میں وزیراعظم نرسمہاراؤ کے دورۂ چین کے نتیجے میں سرحدات پر امن قایم کرنے اور سرحدات پر دونوں جانب سے مسلح افواج میں کمی کے لیے معاہدات ہوئے۔ 1998ء میں ہندوستانی وزیر دفاع جارج فرنانڈیز کے چین کو دشمن نمبر ایک قرار دینے اور ہندوستان کے نیوکلیر تجربات کے نتیجے میں دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں تیزی سے زوال آیا۔ جنوری 2001ء میں چین کی پیپلز کانگریس (عوامی پارلیمنٹ) کے چیرمن لی۔ پنگ کے دورہ دہلی سے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں بہتری پیدا ہوئی۔ وزیراعظم چین نے جنوری 2002ء میں پانچ روزہ ہندوستان کا دورہ کیا۔ ہندوستان اور چین متنازعہ سرحدی مسئلہ پر ''جوں کا توں'' موقف

اختیار کرتے ہوئے تجارتی، تہذیبی میدانوں میں وسیع تر تبادلہ کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ایشیاء میں امن کی برقراری کے لیے کام کررہے ہیں۔

ہند۔روس تعلقات Indo-Russion Relations

سابقہ سویت یونین کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات گرمجوشانہ تھے۔اگست 1971ء میں سابقہ سویت یونین کے ساتھ ہندوستان بیس سالہ معاہدہ امن دوستی وتعاون کیا تھا۔اگست 1991ء میں اس معاہدہ کے اختتام کے بعد سویت یونین بھی تحلیل ہوگیا۔اوراسکی پندرہ جمہوریتیں آزادوخودمختار مملکتیں بن گئیں۔اسکی ایک جمہوریہ روس سویت ورثہ کے ساتھ سلامتی کونسل میں سویت یونین کی جگہ لی تو ہندوستان روس کے ساتھ سویت دور کے تعلقات کی استواری کی کوشش کیا۔ہندوستان کی ابتداء میں کوشش یہ تھی کہ روس سویت ساختہ دفاعی آلات کے لیے درکار اسپیر پارٹس فراہم کرتا رہے۔نرسمہاراؤ دورحکومت میں روس سے کرایو جنک انجن کی خریدی کے معاملہ میں دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں تعطل پیدا ہوگیا چونکہ روس امریکہ کی ایماء پر معاہدہ کے مطابق ہندوستان کولمحہ آخر میں یہ انجن سربراہ کرنے سے انکار کردیا تھا۔جس سے ہند۔روس تعلقات میں کشیدگی آگئی۔مئی 1998ء میں پوکھران نیوکلیر تجربات سے ہندوستان پر لگی امریکی ومغربی یوروپ وجاپان کی تحدیدات سے ہندوستان کے لیے صبرآزما حالات پیدا ہوئے۔ان حالات میں ڈسمبر 1998ء میں اس وقت کے روسی وزیراعظم یوگنی پریماکوف Yevgne Primakov ہندوستان کا دورہ کرنے والی پہلی بڑی شخصیت تھی۔چنانچہ یہاں سے ہند۔روس تعلقات میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔پریماکوف کا یہ دورہ ہند ایک ایسے وقت تھا جب کہ روس خود سخت معاشی بحران کے دور سے گذر رہا تھا اور وہاں غذائی اشیاء وادویات کی سخت قلت تھی۔ہندوستان نے سویت یونین کوواجب الادا ایک بلین روپئے کا قرض روس کو فوری طور پر درکار غذائی سامان اورادویات کے ذریعہ ادا کیا۔

خلیجی جنگ کے بعد امریکہ کی عالمی قیادت وتسلط کو جہاں ہندوستان تسلیم کرنے سے انکار کیا وہیں روس بھی امریکی تسلط کے خلاف کمربستہ ہوگیا۔چنانچہ پریماکوف کے دورہ ہندوستان کے موقع پر دونوں ممالک نے اسٹراٹیجک ساجھے داری (Strategic Partnership) کے ذریعہ عالمی سماج پر یک قطبی نظام کوتھوپنے کے خلاف اور ہمہ قطبی نظام کے لیے مشترکہ طور پر کام کرنے کا عہد کیے۔اس موقع پر پریماکوف نے ایک غیررسمی روس، چین اور ہندوستان کو ملا کرایک تکونی اسٹراٹیجک ساجھے داری کی تجویز بھی رکھی تھی جسے ہندوستان نے قبول نہیں کیا۔یہ بات اہم ہے کہ شروع سے ہند۔روس تعلقات میں

دفاعی عنصر غالب رہا ہے۔ چنانچہ ہندوستان روسی دفاعی ساز و سامان کا سب سے بڑا خریدار ہے۔ ہندوستان کی 45 تا 80 فیصد دفاعی ساز و سامان کی ضروریات کی تکمیل روس سے ہوتی ہے۔ صرف گذشتہ چار سال کے دوران ہندوستان نے دس بلین ڈالر سے زیادہ کے اسلحہ روس سے خریدے ہیں۔ پریماکوف کے دورہ ہندوستان سے دونوں ممالک کے درمیان 2010ء تک فوجی و تکنیکی تعاون کے بشمول ہوائی مجرمین، فضائی سرویس، تجارت، معیشت، صنعتی، مالی، سائنٹفک امور اور ٹیلی کمیونیکیشن وغیرہ کے شعبوں میں تعاون کے علاوہ جرائم کے معاملات میں باہمی قانونی مدد کے جملہ سات معاہدات پر دستخط ہوئے۔

بورس یلتسن کے جانشین ولادیمیر پوٹین نے چین و ہندوستان کی جانب خصوصی توجہ مرکوز کی، جس کے نتیجے میں اپریل 2000ء میں روسی نیشنل سیکوریٹی اڈوائیزر **Sergei Ivanov** نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ جس کا مقصد ہند و روس کے درمیان دفاعی تعلقات کو مستحکم کرنا تھا۔ چنانچہ دہشت گردی کے خطرات اور اجتماعی طور پر اس سے نمٹنے کی اہمیت کے مدنظر دونوں ممالک کے ماہرین مسلسل ایک دوسرے سے ربط میں ہیں۔ افغانستان سے چیچنیا تک پھیلے وسیع خطے میں بڑھتی دہشت گردی کو روکنے کے لیے دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہیں۔ 99-1998ء میں ہند۔روس تجارت 5,558 کروڑ روپئے تھی۔ جب کہ تعلقات میں فروغ کے نتیجے میں بعد کے برسوں میں ہندوستان میں روس کو برآمدات میں 45 فیصد کا اضافہ ہوا اور روس سے ہندوستان کو درآمدات میں 20 فیصد کا اضافہ ہو کر یہ بالترتیب 3,163 کروڑ اور 2081 کروڑ روپئے سالانہ تک پہنچ گئیں۔ ہندوستان اور روس کے درمیان غربت اور کم تر معیار زندگی ایک قدر مشترک ہے۔ ایک تخمینہ کے مطابق تقریباً 50 ملین روسی خط غربت سے نیچے زندگی گذار رہے ہیں۔ 20 ملین لوگ مکمل یا جزوی طور پر بیروزگار ہیں، اور 10 ملین افراد مہاجر یا بے گھر ہیں۔ 1999ء میں GDP 2.3 کی شرح سے بڑھی۔ لیکن روس کو فرانس و برطانیہ کی فی کس GDP کی سطح پر پہنچنے کے لیے 10 فیصد سلانہ کی شرح سے ترقی کرتے ہوئے مزید پندرہ برس انتظار کرنا ہوگا۔

اکٹوبر 2000ء میں صدر روس ولادیمیر پوٹین کا دورہ ہندوستان دونوں ممالک کے درمیان تعاون واشتراک کے لیے ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ چنانچہ روس نیوکلیر سپلائیرز گروپ (NSG) سے تعلق رکھنے کے باوجود پوٹین نے ہندوستان کے ساتھ نیوکلیر تعاون کے لیے ایک معاہدہ کیا۔ نیوکلیر ٹکنالوجی خصوصاً ملٹری ٹکنیکل تعاون کے لیے ایک وزارتی گروپ تشکیل دیا گیا ہے۔ جو نیوکلیر شعبہ میں

تعاون کے گوشوں کی نشاندہی کرے گا۔اس گروپ کی پہلی میٹنگ جون 2001ء میں ماسکو میں ہوئی۔پوتین کے دورہ سے دونوں مملکوں کے درمیان اسٹراٹیجک ساجھے داری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔اس سے نہ صرف ہندوستان کی دفاعی ضرورتوں کی تکمیل ہوگی بلکہ ہندوستان دفاعی پیداوار میں اعلیٰ روسی ٹکنالوجی سے وقفیت حاصل کرتے ہوئے خود دفاعی پیداوار کے قابل ہوگا۔فروری 2001ء میں روسی ڈپٹی وزیراعظم الیا کلبانوف کے دورہ دہلی کے موقع پر ہندوستان روس سے تقریباً 650 ملین ڈالر مالیت کے 310 T-90 ٹینکس خریدنے کا معاہدہ کیا۔جس سے صحراء میں ہندوستان کی وار کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔معاہدہ کی رو سے ہندوستان روسی لائیسنس کے ذریعہ ان ٹینکس کو مستقبل میں خود تیار کر سکے گا۔روس صرف 124 ٹینکس ہی مہیا کرے گا، جب کہ 186 ٹینکس کو ہندوستان میں ہی اسمبل کیا جائے گا۔اسی طرح ہندوستان روس سے پچاس SU-30 جیٹ فائیٹر طیارے بھی خرید رہا ہے۔لیکن 140 طیاروں کو روسی لائیسنس کے ذریعہ ہندوستان خود اپنے ہاں تیار کرے گا۔اس طرح ہندوستان روسی اسلحہ کا صرف خریدار ہی نہیں ہے بلکہ ان کی تیاری و پیداوار میں ساجھے دار بھی بن گیا ہے۔چنانچہ 12 جون 2001ء کو ہندوستان نے روس کی مدد سے اپنے یہاں تیار کردہ PJ-10 سوپر سونک کروز مزائیل کا چاندی پور اڑیسہ میں کامیاب تجربہ کرچکا ہے اور توقع ہیکہ دونوں ممالک مشترکہ طور پر 2003ء تک اس مزائیل کو تیسرے ملک کو فروختگی کے لیے عالمی اسلحہ بازار میں لائیں گے۔

ہند۔روس سیاسی تعلقات میں اچانک نازک موڑ مئی 2001ء میں اس وقت آیا جب ہندوستان نے امریکی مزائیل دفاعی نظام NMD کا خیر مقدم کیا جس سے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ روس کی طرف جھکاؤ کی دیرینہ ہندوستانی پالیسی میں اب تبدیلی آگئی ہے۔اس کے علاوہ جسونت سنگھ کے واشنگٹن میں بش نظم ونسق سے کلنٹن دور کے تعلقات کی تجدید کے تیقن سے بھی روس ہندوستانی رویہ سے الجھن میں پڑ گیا تھا۔چنانچہ امریکی NMD پر بات چیت کے لیے روسی وزیر خارجہ نے مئی 2001ء میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ہندوستان نے امریکی NMD پروگرام کی تائید کے ساتھ ساتھ روسی مفادات کے تحفظ کو یقینی بنانے کا بھی تیقن دیا۔روسی وزیر خارجہ کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے جسونت سنگھ 1972ء کے روس امریکہ ABM معاہدہ پر روسی موقف کی بھرپور حمایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اس معاہدہ کو "یکطرفہ طور پر ختم نہیں کیا جانا چاہئے" اور NMD پروگرام پر روس سے بات چیت کے امریکی فیصلے کو خوش آئند قرار دیا۔اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان پیدا شدہ ذہنی تعطل ختم ہوگیا۔نومبر 2001ء میں وزیراعظم واجپائی نے روس کا دورہ کیا۔اس موقع پر اور معاہدات کے علاوہ دہشت گردی

سے مشترکہ طور پر لڑنے کے لیے دونوں ممالک ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کئے۔

ہند۔امریکہ تعلقات Ind'o-US Relations

امریکہ سے پاکستان کی قربت کے نتیجے میں ہندوستان امریکی خارجہ پالیسی میں ہمیشہ حاشیہ پر ہی رہا ہے' حالانکہ دونوں ممالک میں جمہوری قدریں مشترک ہیں۔ ہندوستان کے دستور پر امریکی دستور کی چھاپ واضح ہے۔ ہندوستانی دستور سازوں نے اصولی طور پر بہت سی باتیں امریکی دستور سے اخذ کی ہیں۔ 1949ء میں اپنے دورہ امریکہ کے موقع پر نہرو نے دونوں ممالک کے درمیان مشترکہ جمہوری قدروں اور ہندوستان کے جمہوری اداروں پر امریکی اثرات' جدوجہد آزادی میں امریکی حمایت و ہمدردی کا تذکرہ کیا تھا۔ اسکے باوجود امریکہ ہندوستان سے دور ہی رہا۔ امریکہ کو ہندوستان کی غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی پسند نہیں تھی۔ چنانچہ آیزن ہوور کے دور میں امریکی سکریٹری آف اسٹیٹس (وزیر خارجہ) John Foster Dulles نے غیر جانبدار پالیسی کو ''غیر اخلاقی'' قرار دیا تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ پاکستان کو CENTO کے فوجی معاہدہ میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی وجہ سے اسے پاکستان میں اپنے قدم جمانے میں سہولت ملی۔ جب کہ ہندوستان بحیرہ ہند کو خطہ امن بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ 1948، 1952، 1957 اور 1962 میں امریکہ سلامتی کونسل میں کشمیر کے مسئلہ پر مخالف ہندوستان رخ کا مظاہرہ کر چکا ہے جب کہ 1957 اور 1962ء میں سویت یونین ہندوستان کی تائید کیا تھا۔ 1965ء کی جنگ کے دوران امریکہ ہندوستان کو اسلحہ کی فراہمی روک دیا۔ اسی طرح 1971ء کی جنگ کے دوران صدر نکسن نے موافق پاکستان رویہ اپنایا تھا۔ اور ہندوستان کو ڈرانے کے لیے امریکی بحری جہاز جو نیوکلیر اسلحہ سے لیس تھا خلیج بنگال میں لنگر انداز ہوا۔ ہندوستان کا اشتراکیت کی طرف جھکاؤ بھی ہند۔امریکہ تعلقات میں ایک رکاوٹ تھا۔ امریکہ ہندوستان کو عوامی شعبہ کو ختم کرتے ہوئے زراعت پر توجہ دینے کی ترغیب دیتا رہا ہے۔ ہندوستان کا NPT پر دستخط سے گریز دونوں ملکوں کے درمیانی تناؤ کا باعث تھا اور اسی وجہ سے امریکی تعاون سے قایم کئے گئے تاراپور نیوکلیری ایکٹر کو یورانیم کی فراہمی میں امریکہ ٹال مٹول سے کام لیا۔

دوسری طرف 1951ء تا 1970ء کے دوران ہندوستان کو امریکی معاشی امداد بھی ملتی رہی ہے۔ چنانچہ اپریل 1951ء سے اکتوبر 1970ء کے درمیان امریکہ ہندوستان کو 7,184 کروڑ کی معاشی امداد دیا ہے' جب کہ اسی عرصہ میں ہندوستان کو سویت یونین سے ملنے والی امداد محض 1,031 کروڑ کی تھی۔ امریکہ کی جانب سے دی جانے والی جملہ امداد میں سے 1965ء تا 1971ء کے درمیان 2,650

کروڑ کی امداد PL 480 معاہدہ کے تحت جنس کی شکل میں حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس عرصہ میں ہندوستان 60 ملین ٹن غذائی اجناس کی امریکہ سے مدد حاصل کیا' جو قحط اور خشک سالی کے حالات سے نمٹنے میں معاون رہی۔ 1971ء کی جنگ کے بعد سے امریکہ ہندوستان کو جنوبی ایشیاء میں ایک علاقائی طاقت کے طور پر تسلیم کرنے لگا۔ 1974ء میں ہندوستان کے پہلے نیوکلیر تجربہ اور 1975ء میں عائد کی گئی قومی ایمرجنسی کو امریکہ شدید ناپسند کیا۔ 1977ء میں جنتا پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد جنتا حکومت کی ''خالص غیر جانبداریت'' (Genuine non-Alignment) کی پالیسی کے نتیجے میں دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کا تناؤ بڑی حد تک دور ہوا۔ 1978ء میں امریکی صدر جمی کارٹر کا دورہ ہندوستان دونوں ممالک کے تعلقات میں ایک نیا سنگ میل ثابت ہوا۔ اس کے باوجود تاراپور پاور پلانٹ کو 1978ء سے معاہدہ کے مطابق نیوکلیر ایندھن (فیول) کی سربراہی امریکہ کی جانب سے روک دی گئی۔ جب کہ 1963ء میں کیے گئے معاہدہ کی رو سے امریکہ آئندہ تیس برسوں کے لیے اس پاور پلانٹ کے لیے نیوکلیر ایندھن کی سربراہی کے لیے پابند تھا۔ لیکن امریکہ 1977ء میں امریکی کانگریس کا منظورہ قانون کی رو سے NPT پر دستخط نہ کرنے والے اور امریکی نیوکلیر تحفظات کو قبول نہ کرنے والے ممالک کے لیے امداد پر امتناع عائد کیا۔ لیکن ہندوستان 1977ء کے اس قانون کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

1979ء میں افغانستان میں سویت یونین کی مداخلت کے نتیجے میں پاکستان کو امریکی اسلحہ کی سربراہی سے ہند۔امریکہ تعلقات میں مزید بگاڑ آیا۔ اس کے باوجود وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے 1982ء میں واشنگٹن کا دورہ کیا اور امریکہ تاراپور نیوکلیر پلانٹ کے لیے فرانس کے ذریعہ سے یورانیم دینے تیار ہوا۔ 1985ء میں وزیر اعظم راجیو گاندھی مختصر عرصہ میں امریکہ کا دورہ کرنے والے ہندوستان کے دوسرے وزیر اعظم تھے۔ اس دورہ کے دوران دونوں ممالک نے ایک یادداشت مفاہمت (MOU) پر دستخط کیے جس کی رو سے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں وسیع تعاون کے امکانات روشن ہوئے اور سوپر کمپیوٹر و حساس دفاعی آلات کی ہندوستان کو فروختگی کے لیے معاہدات ہوئے۔

سویت یونین کے خاتمہ سے ایک طرف عالمی تناؤ میں کمی آگئی تو دوسری طرف افغانستان سے سویت افواج کے تخلیہ کے نتیجہ میں امریکی خارجہ پالیسی میں پاکستان کی اہمیت کم ہوگئی اور جنوب مشرق ایشیاء میں امریکی پالیسی ترجیحات میں نمایاں تبدیلی آئی اور اب سیاسی و فوجی مسائل کی جگہ معاشی امور نے لے لی۔ اس کے علاوہ کشمیر اور دہشت گردی پر غیر متوازن امریکی رویہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں ایک روکاوٹ رہا۔ CTBT پر ہندوستان کا دستخط سے گریز اور مئی 1998ء میں ہندوستان

کے نیوکلیر تجربات دونوں ممالک کے درمیان بڑے مسائل بنے اور امریکہ ہندوستان پر معاشی تحدیدات عائد کردیا۔ مارچ 2000ء میں امریکی صدر بل کلنٹن کے پانچ روزہ دورہ ہندوستان کے باوجود یہ تحدیدات باقی رہیں۔ 11 ستمبر کو نیویارک میں WTC اور پنٹگان پر ہوئے دہشت گرد حملوں کے بعد دہشت گردی کے خلاف امریکی اقدامات خصوصاً افغانستان پر حملوں کی ہندوستان کھل کر تائید کیا۔ جس کے نتیجہ میں ہندوستان پر عائید تحدیدات برخواست کی گئیں اور افغانستان میں نئی حکومت کے قیام میں ہندوستانی رول کو امریکہ نے تسلیم کیا۔ ہندوستان اور امریکہ کے درمیان وسیع تر دفاعی تعاون کے لیے بات چیت کا آغاز ہوا۔ ڈسمبر 2001ء میں امریکی بحری بیڑہ مدراس کے ساحل پر لنگر انداز ہوا اور ممبئ و گوا میں دونوں بحریہ کے درمیان مشترکہ مشقیں کی گئیں۔



Bibliograp:hy کتابیات

Adi H.Doctor ; International Relations - An Introductory Study ; New Delhi, 1969

A.K.Sen ; International Relations Since World War I; S.Chand & Co, New Dlehi 1980.

Anam Jaitly ; International Politics ; Sterling Publishers 1986.

D.C. Gupta ; The League of Nations ; Vikas Publishling Hose, New Delhi 1974.

H.J. Margenthau ; Politics Among Nations ; Scientific Book Agency, 1973 (Indian Edition)

J.C. Johari ; International Relations and Politics ; Sterling Publishers, 1985.

Karuna Kar Gupta ; Indian Foreign Policy ; The World Press Ltd, Calcutta, 1956.

Madan Gopal ; International Relations Since 1919 ; Chaitanya Publishing Hose, Allahabad, 1969.

Palmer and Perkins ; International Relations ; Scientific Book Agency, (Indian Edition)

Prakash Chandra ; International Politics ; Vani Educational Book, New Delhi, 1985.

Prem Arora ; International Relationas ; Bookhive New Delhi,

Quincy Wright ; The Study of International Relations ; New York 1955, Indian Edition, 1970

Rama S.Melkote, A Narasimha Rao ; International Relationas ; Sterling Publishers, New Delhi, 1993.

V.D.Mahajan ; International Relations Since 1900 ; S.Chand & Company, New Delhi, 1986.

Vinay Kumar Malhotra ; International Releations ; Anmol Publications, New Delhi 1993